امام محمد باقرؑ نے فرمایا

''ہر آدمی کی قیمت اور قدر اسکی معرفت ہے''

(معانی الاخبار)

کشف المعارف

سید باقر نثار زیدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	کشف المعارف
مؤلف	سید باقر نثار زیدی
ناشر	سید باقر نثار زیدی
کمپوزنگ	سید ناصر عباس زیدی
ٹائٹل ڈیزائننگ	سید صفدر عباس زیدی
ٹائٹل کنسلٹینٹ	سید آفتاب حسین رضوی
طبع اوّل	مئی ۲۰۰۵ء
تعداد	۱۰۰۰
ای میل ایڈریس	baqarnisar@hotmail.com
موبائل نمبر	0333-2120721
ملنے کا پتہ	عامدار بک ڈپو۔ امام بارگاہ شہدائے کربلا۔ انچولی کراچی
	اسد بک ڈپو۔ قدمگاہ مولا علی۔ حیدرآباد
	ممتاز علی ٹگر۔ نزد کیپری فوٹو اسٹوڈیو۔ اسٹیشن روڈ۔ لاڑکانہ
	امام بارگاہ عطیۂ پنجتنی۔ H-115 ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
	القائم بک ڈپو۔ بالمقابل امام بارگاہ بھون روڈ۔ چکوال

سید عمران حیدر نقوی۔ راولپنڈی۔ موبائل نمبر 0333-5231475

تنبیہ

نماز پڑھنا صرف اور صرف مومن کا حق ہے۔منافق کو اتنا بھی حق نہیں ہے کہ وہ مصلّے پر قدم بھی رکھ سکے کیونکہ وہ جتنا جتنا نماز پڑھے گا اتنا اتنا غضبِ خداوندی میں گرفتار ہوتا جائے گا۔مومن کا یہ استحقاق اسلئے بنتا ہے کہ اسکے دل میں۔اسکے خون میں۔اسکی سانسوں میں بلکہ اسکے پورے وجود میں حقیقتِ نماز رچی بسی ہوتی ہے۔وہ قیام کرتا ہے تو اسکے ذہن میں اپنے امامِ زمانہ کا قیام ہوتا ہے۔وہ جب ''اھدِ نا الصراط المستقیم'' کہتا ہے تو اسکی مراد ولایتِ علیؑ پر استقامت ہوتی ہے۔وہ جب رکوع کرتا ہے تو اسکے تصور میں وہ ہوتا ہے جس نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی تھی۔وہ جب سجدہ کرتا ہے تو اسکی نظر میں وہ ہوتا ہے جس نے ایسا سجدہ کیا کہ پھر سجدے سے سر نہ اٹھایا۔وہ جب تشہد پڑھتا ہے تو شہادتِ ولایتِ علیؑ کو مرکزِ شہادت قرار دیتا ہے۔اس لئے مومن اور نماز ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو مومن ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن احکامِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔ان لوگوں سے ہوشیار رہنا از حد ضروری ہے کیونکہ کرتے یہ ہیں اور الزام مومنین پر آتا ہے۔ہم واضح طور پر ایسے لوگوں سے براءت وبیزاری کا اعلان کرتے ہیں لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایسے لوگوں کا کوئی تعلق ہم سے جوڑے۔

وضاحت

میرے چند احباب نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ میرے ادارے میں کتنے افراد شامل ہیں اور اس ادارے کا نام کیا ہے؟۔ان دوستوں کی اطلاع کے لئے میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ میرا کوئی گروپ۔کوئی ٹیم۔کوئی حلقۂ اثر اور کوئی ادارہ نہیں ہے۔نہ ہی میرے پاس کوئی پبلشر ہے۔میں نے جو کام بھی کیا ہے اور جو کام بھی میں کر رہا ہوں وہ تن تنہا کر رہا ہوں جس میں میرا کوئی شریک و سہیم نہیں اور نہ میں کسی کے کام میں شریک ہوں۔میں فقط اپنے امامؑ پر ہی توکل کرتا ہوں اور ان ہی کی مدد کا طلبگار رہتا ہوں کیونکہ میرا پیر۔میرا مرشد۔میرا مولا۔میرا رہبر اور میرا مرجع صرف اور صرف میرے زمانے کا امامؑ ہے۔اس کے علاوہ کسی اور کی طرف میری نظر اٹھتی ہی نہیں۔اسلئے مجھے کسی اور کے افعال کا ذمہ دار نہ سمجھا جائے۔

ہدیہ

میں اپنی اس ادنیٰ کوشش کو ہدیہ کرتا ہوں اسکی بارگاہ میں

جو علیِ اعلیٰ ہے

جو اس عالمِ ہست و بود کو خلعتِ وجود بخشنے والا ہے

جو عالمین کی پرورش کرنے والا ہے

جسکے حکم سے تقدیرات لکھی اور مٹائی جاتی ہیں

جو علی ہے۔اعلیٰ ہے۔اعلیٰ الاعلیٰ ہے۔اعلیٰ الاعلیٰ الاعلیٰ ہے

جو عظیم ہے۔اعظم ہے۔اعظم الاعظم ہے۔اعظم الاعظم الاعظم ہے

جو کریم ہے۔اکرم ہے۔اکرم الاکرم ہے۔اکرم الاکرم الاکرم ہے

جو کبیر ہے۔اکبر ہے۔اکبرالاکبر ہے۔اکبرالاکبرالاکبر ہے

جس سے اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت کی گئی

اور جس سے اس دنیا میں سب سے زیادہ دشمنی کی گئی

میرے ماں باپ قربان ہوں اس مقدس وجود پر۔

انتساب

میں اس کتاب کا انتساب اپنے مرحوم والدین سید نثار حسین زیدی اور سیدہ ریاض فاطمہ زیدی کے نام کرتا ہوں جنکی دعائیں آج بھی میری ساعت کا تعاقب کرتی ہیں اور جنکی ربوبیت اور شفقت آج بھی میرے لئے سائبان بنی ہوئی ہے۔

رَبِّ ارحمہما کما ربّیانی صغیرا

ماخذ

کتاب	مولف
قرآن حکیم	
تفسیر المتقین (ترجمہ و تفسیر)	علامہ امداد حسین کاظمی
اصول کافی	محمد بن یعقوب کلینیؒ
فروع کافی	محمد بن یعقوب کلینیؒ
مدینۃ المعاجز	سید ہاشم بحرانی
تفسیر فرات	علامہ فرات بن ابراہیم کوفی
التوحید	شیخ صدوق
کمال الدین وتمام النعمہ	شیخ صدوق
ثواب الاعمال وعقاب الاعمال	شیخ صدوق
من لایحضرہ الفقیہ	شیخ صدوق
نہج الاسرار	خطباتِ امیر المومنین
نہج البلاغہ	خطباتِ امیر المومنین
مفاتیح الجنان (مترجمہ حافظ سید ریاض حسین)	علامہ عباس قمی
عمدۃ المطالب	محمد بن علی ابن شہر آشوب
کوکب دری	سید محمد صالح کشفی ترمذی
انسائیکلوپیڈیا حضرت علیؑ	طالب حسین کرپالوی

ماخذ

مولف	کتاب
سید صادق حسینی شیرازی	علی فی القرآن
آغا خمینی	تفسیر سورۂ حمد
علامہ محمد بشیر انصاری	حقائق الوسائط
اقوال امیرؑ المومنین	حکمتِ بوتراب
علامہ نذر حسین قمر	شہادتِ ولایتِ علیؑ
علامہ نثار عباس نقوی	اکمال الدین بولایتِ امیرؑ المومنین
سلیم بن قیسؓ	کتابِ سلیم بن قیس
جواد قیومی اصفہانی	صحیفۂ الحسینؑ
جواد قیومی اصفہانی	صحیفۂ زہراؑ
جواد قیومی اصفہانی	صحیفۂ رضاؑ
علامہ بو علی شاہ	مولودِ کعبہ
شیخ صدوق	امالی
شیخ صدوق	معانی الاخبار
علامہ غضنفر عباس تونسوی	توحید العارفین من کلام المعصومین
مولانا ظفر حسن امروہوی	مجمع الفضائل
علامہ عبد اللہ شاہ عبد	العلی سلطاناً نصیراً

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرست مضامین

شہر محبت

جوہر انسانیت عقل ہے۔جوہر عقل علم ہے۔جوہر علم معرفت ہےاور جوہر معرفت محبت ہے۔انسان اس دنیا میں ترقی مراتب کے لئے جن چیزوں کوکام میں لاتا ہے وہ یہی چار چیزیں ہیں یعنی عقل وعلم ومعرفت ومحبت۔ان میں سے اوّل الذکر دو چیزوں یعنی عقل وعلم کاتعلق دنیا سے بھی ہےاور آخرت سے بھی۔اب یہ خودانسان پر منحصر ہے کہ وہ انکوکس مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔دنیا کے لئے؟۔آخرت کے لئے؟۔یا دونوں کے لئے؟۔لیکن آخر الذکر دو چیزوں یعنی معرفت اور محبت کاتعلق خالصتاً آخرت سے ہے اور عقل وعلم کوبھی حصولِ آخرت کے لئے صرف اسی صورت میں استعمال کیا جاسکتا ہے جبکہ مقصود معرفت ومحبت ہوں۔ورنہ اگر معرفت کامقصود محبت نہ ہوتو یہی معرفت حسد اور دشمنی کوجنم دیتی ہے اور جتنی جتنی معرفت بڑھتی جاتی ہےاتنی اتنی حسد اور دشمنی کی آگ اور بھڑکتی جاتی ہے۔اسی لئے اللہ نے بھی اپنے بندوں پر پہلے محبت فرض کی ہےاور اسکے بعد معرفت تاکہ محبت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے اور اسی لئے ہم نے بھی ابتداءمحبت سے کی ہے قبل اسکے کہ ہم حقائقِ معرفت بیان کریں۔

ہوتا یہ ہے کہ کچھ لوگ بظاہر عاقل وفہیم نظر آتے ہیں اور قوتِ عقلیہ کی مدد سے وہ مختلف علوم حاصل کرلیتے ہیں مثلاً صرف ونحو ومنطق وکلام وفلسفہ وسائنس وغیرہ۔

کچھ لوگ امورِ دینی میں بھی مہارت حاصل کر لیتے ہیں مثلاً قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ ۔لیکن چونکہ انکا مطمحِ نظر معرفت و محبت نہیں ہوتا اور وہ یہ تمام علوم محض لوگوں کا مرکزِ نگاہ بننے ۔شہرت حاصل کرنے اور مال کمانے کے لئے حاصل کرتے ہیں اس لئے آخرت کے اعتبار سے جاہل کے جاہل رہتے ہیں ۔یہی وہ لوگ ہیں جو ہزاروں کتابیں چاٹ جاتے ہیں ۔عربی گھول کر پی جاتے ہیں ۔"ع"۔"ق"۔"ض" اور "ظ" کے مخارج کو بڑی قوت سے ادا کرتے ہیں اور اسی حوالے سے علماء کہلاتے ہیں ۔انکی پہچان شعبۂ دینی ہوتا ہے اور اسی پہچان کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایک خاص لباس ۔ایک خاص حلئے اور ایک مخصوص چال ڈھال کو اپناتے ہیں ۔لیکن انہی لوگوں کے سامنے اگر معرفت کا ذکر کیا جائے تو یہ کراہت کا اظہار کرتے ہیں اور کیونکر کراہت نہ کریں جبکہ یہ محبت سے محروم ہیں۔

ایک ضروری بات

ایک دشواری ہے جو مومنین کو ہر دور میں پیش آتی رہی ہے اور آج بھی درپیش ہے ۔یہی دشواری ہے جسکے سبب سے لوگوں میں ذوقِ مطالعہ اور شوقِ حصولِ علم رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے اور ذرائعِ علم پر ایک خاص ٹولے کی اجارہ داری روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے ۔وہ دشواری ہے زبانِ عرب سے پوری طرح واقفیت نہ ہونا اور اسی پر مومنین کو ہدفِ طنز و طعن بنایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ترجمے

پڑھ لینے سے آدمی عالم نہیں بن سکتا بلکہ عربی کتب پڑھنا ضروری ہے۔اگر آپ کسی پر کوئی دلیل قائم کریں تو وہ آپ کی دلیل کو تو رکھے گا ایک طرف اور چھوٹتے ہی آپ سے سوال کرے گا۔"آپ کو عربی آتی ہے؟"۔یہ سنتے ہی مومن کی گاڑی کو بریک لگ جاتے ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ اس مغالطے کا بھی ازالہ کرتے چلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انکا شدید ترین احساسِ کمتری ہے جو انکی زبان سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عربی کے ماہر بن جانے کے باوجود نہ تو قرآن انکی سمجھ میں آیا اور نہ حدیث۔نہ ہی حقائقِ معرفت ان تک پہنچ سکے۔اس صورتِ حال میں جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا شخص اسرارِ معرفت بیان کر رہا ہے جو عربی کا ماہر نہیں ہے تو مارے حسد کے انکا کلیجہ کباب ہو جاتا ہے اور انکی پگڑی اور عبا قبا انکو ڈسنے لگتی ہے اور پھر انکے پاس کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ جاتا سوائے اسکے کہ وہ زبانِ عرب کا سہارا لیں۔

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور عربی کا ایک مخصوص لہجہ اور مخصوص مخارج ہیں جنکے بغیر صحیح مطلب ادا نہیں ہو سکتا۔اس صورت میں مولوی کو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ مومنین کو طعنہ دے کہ "تم تو قرآن کو صحیح طور پر پڑھ بھی نہیں سکتے"۔لیکن اللہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔چنانچہ اصولِ کافی۔کتاب فضل القرآن۔باب ۱۲ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا۔"میری امت کا غیر عربی اگر قرآن

کو اپنی زبان میں پڑھے گا تو فرشتے اسکو عربی لہجے میں بارگاہِ الٰہی میں پہنچائیں گے''۔

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جب کوئی غیر عرب ائمہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور عربی میں گفتگو کرتا تو وہ اسے روک دیتے اور خود اسی کی زبان میں بات کرتے۔ حضرت سلمانؓ فارسی ایران کے رہنے والے تھے اور انکی مادری زبان فارسی تھی۔ وہ تو ایمان کے آخری درجے پر فائز ہو گئے اور ''منا اہل البیت'' میں داخل ہو گئے لیکن عربی فرفر بولنے والے وہیں رہے جہاں وہ تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر قرآن پڑھ کر منافق بن گئے۔
جناب شہر بانوؑ بھی ایرانی تھیں اور فارسی ہی میں گفتگو کیا کرتی تھیں لیکن اللہ نے انھیں اپنی حجتؑ کا امین قرار دیا اور عربی بولنے والی عورتوں کو محروم رکھا۔

فاعتبروا یااولی الابصار

حقیقت یہ ہے کہ لسانیات یعنی زبانوں کے علم کا تعلق کسی بھی اعتبار سے دین سے نہیں بنتا بلکہ یہ خالصتاً دنیاوی علم ہے اور دنیا میں انسان ایک دوسرے کا محتاج رہتا ہے۔ اس لئے معاشرے کے افراد مختلف کاموں کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ کوئی کھیتی باڑی کا کام اپنے ذمے لیتا ہے اور معاشرے کو غلّہ فراہم کرتا ہے۔ کوئی کپڑا بنانے کی ذمہ داری لے لیتا ہے اور معاشرے کو لباس مہیا کرتا ہے۔ کوئی برتن بنانے کے کام کو اختیار

کرلیتا ہے اور معاشرے کو برتن فراہم کرتا ہے۔اسی طرح کچھ لوگ اپنے لئے لسانیات کے میدان کا انتخاب کرتے ہیں اوراسطرح انکی ذمہ داری ہوتی ہے(احسان نہیں) کہ مختلف علوم کوایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کریں تا کہ معاشرہ ان علوم سے فائدہ اٹھائے جواسکی دسترس میں نہیں ہوتے۔فلسفے کے حوالے سے سب سے پہلے یونان کاتصورذہن میں آتا ہےلیکن اسکی ابتداءچین سے ہوئی اور فلسفے کاتمام ترلٹریچر چینی زبان میں ہی تھا۔یونان والوں نے اسکاترجمہ اپنی زبان میں کیا اور یونان کے جتنے بھی عظیم فلاسفہ کوہم جانتے ہیں یہ سب کے سب ترجمے پڑھ کرہی فلسفے کے مقاماتِ بلند پر پہنچے تھے۔پھر جب مسلمانوں کی حدودِمملکت وسیع ہوئی اوروہ ان علوم سے متعارف ہوئے جوعرب میں ناپید تھےتو انھوں نے بھی مختلف زبانوں کے لٹریچرکوعربی زبان میں منتقل کرنا شروع کیا اور مامون رشید کے زمانے میں باقاعدہ ایک ایسے ادارے کاقیام وجود میں لایا گیا جسکا کام ہی ترجمے کرنا اورمختلف علوم کوعربی میں منتقل کرنا تھا۔مسلمانوں میں جتنے بھی بڑے بڑے فلاسفہ اورحکماءگزرے ہیں وہ انہی ترجموں کوپڑھ کراس مقام تک پہنچ پائے تھے۔

آج علمِ کیمیا پر اہلِ مغرب کامکمل قبضہ ہے اور وہ بلاشرکتِ غیرے اسکے مالک ہیں۔لیکن سب جانتے ہیں کہ علمِ کیمیا کاموجد ایک عرب تھا جسکا نام جابر بن حیان تھا اوراس نے اپنی کتاب ’’الکیمیا‘‘عربی زبان میں ہی لکھی تھی۔اہلِ مغرب عربی زبان کی ابجد سے بھی واقف نہ تھےلیکن انھوں نے اپنی اپنی زبانوں میں ’’الکیمیا‘‘ کاترجمہ

کرایا اور اپنا تمام تحقیقی کام انھوں نے انہی ترجموں کی بنیاد پر کیا یہاں تک کہ وہ آج دنیائے کیمیا پر حکومت کر رہے ہیں جب کہ جو لوگ عربی زبان میں گلے گلے تک غرق ہیں وہ ابھی تک ہاتھ میں لوٹا اور بغل میں چٹائی لئے پھر رہے ہیں۔

قرآن مجید۔ کتبِ احادیث ۔کتبِ تاریخ اور دیگر اسلامی لٹریچر کو بھی ماہرین لسانیات نے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمے کیے ہیں اور انہی ترجموں کی بنیاد پر دنیا بھر میں تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔قرآن مجید کا ارشاد بھی یہی ہے کہ ''وہ کتاب ہدایت کرتی ہے متقین کی (چاہے وہ کوئی بھی زبان بولتے ہوں) نہ کہ صرف عربی جاننے والوں کی ورنہ تو متقی بننے کے لئے عربی کا ماہر ہونا امرِ لازمی قرار پاتا اور تقویٰ صرف سرزمین عرب تک محدود ہوکر رہ جاتا جبکہ تقویٰ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے نہ کہ زبان دانی کا۔حقیقت یہ ہے کہ جو کتاب متقین کی ہدایت کرتی ہے وہ متقین کو پہچانتی بھی ہے ۔اگر نہ پہچانتی تو ہدایت کیسے کرتی؟۔چنانچہ مومن جب قرآن کھولتا ہے تو قرآن اپنے معنی اس پر کھول دیتا ہے چاہے وہ ترجمہ ہی کیوں نہ پڑھ رہا ہو اور جب منافق قرآن کھولتا ہے تو قرآن اپنے معنی اس سے چھپالیتا ہے اور ایسے شخص کو سوائے صرف ونحو کی قلابازیوں کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی فن کے ماہر نے کبھی معاشرے پر اپنا احسان جتایا ہو۔آپ کبھی کسی کسان کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنیں گے کہ ''میاں! اگر میں تمھیں غلّہ فراہم نہ کرتا تو تم بھوکے مر جاتے''۔نہ ہی کبھی کسی کپڑے کے تاجر نے یہ

بات کی کہ ''بھائی صاحب! اگر میں تمھیں کپڑا بنا کر نہ دیتا تو تم برہنہ ہی پھرا کرتے''۔ مگر یہ مولوی کی قوم وہ واحد قوم ہے جو بات بات پر احسان جتاتی ہے حالانکہ وہ ہر کام معاوضہ لے کر کرتے ہیں لیکن انکا مقولہ یہ ہے کہ ''کھائی سو کھائی اوپر سے دانت گِھسائی''۔

یہ ایک ضمنی بات تھی جسکا تذکرہ کرنا ہم نے ضروری سمجھا اور اب ہم ان ذرائع کے بارے میں اپنے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہیں جو حصولِ مراتب کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں یعنی عقل و علم و معرفت و محبت۔

اگر دیکھا جائے تو ان چار چیزوں میں بنیادی چیز محبت ہوتی ہے۔ محبت ہی وہ شے ہے جو محبّ کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل کرے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیاوی امور میں بھی جو کوئی کسی کا بھی مداح ہوتا ہے تو وہ صرف اسکے فن (Performance) تک ہی محدود نہیں رہنا چاہتا بلکہ اسکے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا متمنی رہتا ہے یہاں تک کہ اسکی نجی زندگی کے بارے میں بھی جاننے کا مشتاق ہوتا ہے اور یہ درحقیقت اسکی محبت کا تقاضا ہوتا ہے۔ پھر امورِ دین میں فطرتِ انسانی کیونکر بدل جائے گی؟۔ اور انسان جس سے محبت کرتا ہے اسکی معرفت کا کیونکر مشتاق نہ ہوگا؟۔ پس جو شخص لفظ معرفت سے چڑتا ہو اسکے دل میں اہلِ بیتؑ کی محبت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ یہ بات خلافِ

فطرت ہے اور یہیں سے سمجھئے کہ حصولِ مراتبِ اخروی کے لئے استعمالِ ذرائع کی ترتیب اسطرح ہو گی:۔

۱۔دل میں اہلِ بیتؑ کی محبت پہلے سے موجود ہو۔

۲۔محبت میں اضافے کے لئے معرفت حاصل کی جائے۔

۳۔معرفت کے لئے علم حاصل کیا جائے۔

۴۔علم حاصل کرنے کے لئے عقل سے مدد لی جائے۔

پس جان لینا چاہئے کہ عقل وہی ہے جو انسان کو علم کی ترغیب دے اور علم وہی ہے جس سے معرفت حاصل ہو اور معرفت وہی ہے جس سے محبت میں اضافہ ہو۔

جو کچھ خلق ہو چکا۔جو کچھ تخلیق کے مراحل سے گذر رہا ہے اور جو کچھ آئندہ خلق ہو گا ان سب کی بنیاد محبت ہے۔عملِ تخلیق ہوا ہے۔ہو رہا ہے اور ہو گا محبت کی طرف سے۔محبت کے ذریعے۔محبت کی طرف اور محبت کے لئے۔لہٰذا جو شخص ذائقۂ محبت سے نا آشنا ہے وہ نہ تو اپنے مقصدِ تخلیق کو جانتا ہے اور نہ اپنے خالق سے واقف ہے اور جب واقف ہی نہیں تو اپنا مقصدِ حیات کیونکر پورا کر سکتا ہے؟۔

ایک حقیقت وجود۔اصلِ وجود۔عینِ وجود اور سرچشمۂ وجود علمِ خدا کے سراپردوں میں پوشیدہ تھا۔ہم مجبور ہیں کہ اتنا ہی کہیں کیونکہ علمِ خدا سے آگے دشتِ حیرت کا آغاز ہوتا ہے جہاں عقول کے بال و پر جلنے لگتے ہیں اور زبانیں

گنگ ہو جاتی ہیں۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہماری حد ہے۔ ہمارا نقصِ تخلیقی ہے ورنہ وہ سرچشمۂ وجود کہاں پوشیدہ تھا یہ وہ خود جانتا ہے یا پھر وہ جانتا ہے جس نے اسے اپنی ذات کی طرح چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ اصلِ وجود کمال ہی کمال تھا اور ہر کمال اظہار چاہتا ہے لیکن ہر کس و ناکس کے سامنے نہیں بلکہ اسکے سامنے جو کمال کی پرکھ رکھتا ہو۔ اسکی باریکیوں کو سمجھتا ہو اور اسکے جلال و جمال کی برداشت رکھتا ہو۔ ایسا نہ ہو جو تجلیٔ کمال کی ایک ہلکی سی کرن کی بھی تاب نہ لاسکتا ہو اور صرف اسکے ظہور کے احساس سے ہی غش کھا کر گر پڑے۔ بلکہ ایسا ہو کہ دیکھے اور نظر گاڑ کر دیکھے اور خود مشہود اسکو یہ سند عطا فرمائے کہ ''اس نے میرے جلوۂ بے پناہ کی فقط ایک جھلک دیکھی لیکن اسطرح دیکھی کہ نہ تو اسکی آنکھوں میں کجی ہوئی اور نہ اسکے دل نے جھٹلایا''۔

کمال کے اس بپھرے ہوئے سمندر میں حسن کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں اور حسن چاہتا ہے کہ کوئی اسے دیکھے اور اسکی تعریف کرے۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

چنانچہ اس لبِ مشیت میں جنبش ہوئی۔ ''کنتُ کنزاً مخفیہ فاحببت ان اعرف فخلقت خلقاً''۔ یعنی ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ مجھے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے ایک خلق کو خلق کیا''۔ اور یہ خلق چونکہ نقشِ اوّل تھی اور

انتہائے قرب سے وجود میں آئی تھی اس لئے حسن ہی حسن تھی۔ ایسا حسن کہ بنانے والا بھی دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ یہ تو ہو بہو اسی کی تصویر تھی۔

جس نے چاہا تھا کہ خود اس سے محبت کی جائے

خود وہی دامِ محبت میں گرفتار ہوا

پس سلسلۂ خلق کی اصل محرک و بنیاد محبت تھی۔ جن لوگوں کا مشغلہ لفظوں سے کھیلنا ہے وہ فقط چٹخارے لیتے ہیں اور حقیقتِ واقعہ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اگر توجہ کرتے تو انکا مذہب محبت کا مذہب ہوتا۔ ڈنڈے کا مذہب نہ ہوتا۔ اگر وہ حقیقتِ تخلیق سے واقف ہوتے تو انکے ہر عمل کی بنیاد محبت ہوتی نہ کہ شریعت۔ شریعت بذاتِ خود مقصد نہیں ہے بلکہ اسکا کام فقط لوگوں کو ڈسپلن کرنا ہوتا ہے۔ جیسے فٹبال کے میدان میں جو حدود بنی ہوتی ہیں اور پنالٹی بکس بنے ہوتے ہیں انکا مقصد کھلاڑیوں کو ڈسپلن کا پابند بنانا ہوتا ہے لیکن کھلاڑی ان حدود و قیود کے لئے نہیں کھیلتا بلکہ ایک جذبے کے تحت کھیلتا ہے اور وہ جذبہ ہوتا ہے ''فتح سے محبت''۔ آپ اگر غور کریں تو فوراً محسوس فرمالیں گے کہ دنیا کا ہر کام محبت کے تحت کیا جاتا ہے۔ ملازمت۔ تجارت اور زراعت کی جاتی ہے پیسے کی محبت میں۔ شادی کی جاتی ہے عورت اور اولاد کی محبت میں۔ سیاست کی جاتی ہے اقتدار اور شہرت کی محبت میں۔ جب ہر شے کی روح محبت ہے تو دین و مذہب کو محبت سے مستثنٰی کیونکر کیا جاسکتا ہے؟۔ بلکہ دین و محبت کو تو ہر کام پر فوقیت و اوّلیت حاصل ہے لہٰذا یہاں تو انتہائی طاقتور محبت کا وجود لازمی ہے۔ اور ایسا ہے

بھی ۔ دین تو ابتداء سے لیکر انتہاء تک محبت ہی محبت ہے ۔ اگر دیکھا جائے تو دنیا میں لاتعداد ادیان پھیلے ہوئے ہیں لیکن اگر سوچا جائے تو صرف دو ہی دین ہیں ۔ ایک علیؑ کی محبت کا دین اور دوسرا علیؑ کی دشمنی کا دین ۔ انسان پر لیبل چاہے کوئی بھی لگا ہو مگر وہ ان دو میں سے کسی ایک کیمپ میں ضرور ہوتا ہے ۔ خود مسلمانوں کے بارے میں حضرت ختمی مرتبتؐ کا جو ارشاد ہے کہ ان میں تہتر ۷۳ فرقے ہونگے جن میں سے بہتر ۷۲ جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں تو وہ ایک فرقہ جو جنت میں جائے گا وہ وہ ہوگا جو علیؑ سے محبت کرتا ہوگا اور باقی بہتر ۷۲ فرقے وہ ہونگے جو علیؑ سے دشمنی رکھتے ہونگے اور جنتی ہونے کے لئے علیؑ سے محبت کا لزوم احادیث سے بتواتر ثابت ہے ۔ یہ بات طے ہے کہ نجات وہی پائے گا جس سے اللہ محبت کرتا ہو اور غرق وہی ہوگا جسے اللہ دشمن رکھتا ہو ۔ اب اللہ کی دوستی اور دشمنی کا مطلب کیا ہے یہ ہم مدینۃ المعاجز (اردو) جلد ۱ صفحہ ۳۶۸ سے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ مجھ سے اللہ نے فرمایا ''اے محمدؐ! میں نے اپنی ذات کی قسم کھا کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں علیؑ کی محبت کیطرف اسکے دل میں الہام کروں گا جو میرا پیارا ہوگا چنانچہ میں جس سے محبت کرتا ہوں اسکے دل میں علیؑ کی محبت ڈال دیتا ہوں اور جس سے بغض رکھتا ہوں اسکے دل میں علیؑ کی دشمنی ڈال دیتا ہوں''۔

پس نجات و ہلاکت کا معیار علیؑ کی محبت اور دشمنی ٹھہرا ۔ مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ انھیں انکے اعمال بخشوائیں گے ۔ آپ یقین کریں

یا نہ کریں مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ مذہب وہی ہے جو شیطان کا مذہب تھا کیونکہ اپنے اعمال و عبادات پر گھمنڈ کرنے والی پہلی شخصیت شیطان کی ہی تھی ۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس ملعون نے ایک سجدہ چار ہزار سال طویل کیا تھا جسکو سندِ معصومؑ حاصل ہے کہ یہ ایسا خالص سجدہ تھا کہ چار ہزار سال کے اس طویل عرصے میں اسکا دھیان ادھر اُدھر گیا ہی نہیں ۔جسکے ایک سجدے کا یہ عالم ہو اسکی باقی عبادات کا کیا حال ہوگا؟ ۔مگر یہ سارے اعمال و عبادات دھرے کے دھرے رہ گئے اور اسے صرف ایک سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں راندۂ درگاہ اور ملعون قرار دیا گیا جبکہ آدمؑ نے ابھی ایک بھی عمل نہیں کیا تھا اسکے باوجود انھیں تمام عالمِ ملکوت سے سجدہ کرایا گیا۔ جو لوگ شیطان کیطرح اپنے اعمال کو سببِ نجات سمجھتے ہیں وہ حقیقتاً حضرت امیر المومنینؑ کی شدید توہین اور انکی منزلت میں تقصیر کرتے ہیں ۔شیعہ سنی کتب اس حدیث سے بھری پڑی ہیں جس میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں ۔ ''یا علیؑ ! انت قسیم النار و الجنۃ ''۔یعنی اے علیؑ !تم جنت اور جہنم کے تقسیم کرنے والے ہو۔اب اگر اعمال انسان کو بخشوائیں گے تو ''قسیم النار والجنۃ'' اعمال ہوئے نہ کہ علیؑ ۔یہ بے خبر لوگ مولویوں کے پیچھے آنکھ بند کر کے بھاگ رہے ہیں اور انکو یہ تک معلوم نہیں کہ علیؑ ''قسیم النار والجنۃ'' ہیں تو کیونکر؟ ۔اگر تقسیمِ جنت و نار کا مطلب یہی ہے کہ اچھے اعمال والوں کو جنت میں بھیج دو اور برے اعمال والوں کو جہنم میں تو یہ کام تو چند فرشتے بھی

کر سکتے ہیں۔اس میں علیؑ کی کیا خصوصیت ہے؟۔تقسیم جنت و جہنم کا کیا مطلب ہے اسے جانئے۔سمجھئے اور یاد رکھیئے۔خود حضرت امیر المومنینؑ ''قسیم النار والجنۃ'' کا مفہوم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔''میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہونگا اور اس سے کہوں گا کہ اسے پکڑ لے۔یہ میرا دشمن تھا اور اسے چھوڑ دے یہ میرا دوست اور محب تھا''۔پس جو شخص اس بات پر یقین نہیں رکھتا وہ علیؑ کا بھی مجرم ہے اور رسولؐ کا بھی۔اس کتاب سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ ہم شیعوں کو یاد دلائیں کہ مذہبِ شیعہ کس چیز کا نام ہے اور لفظِ شیعہ کا اطلاق کس پر ہوتا ہے اور اس دنیا میں شیعوں کے فرائض کیا ہیں۔اگر کچھ لوگ شریعت کی زبان ہی سمجھتے ہیں تو ہم اس زبان میں بھی بات کرنے کو تیار ہیں۔وہ لوگ جان لیں کہ ولایتِ علیؑ کی تلوار انکے سروں پر لٹک رہی ہے جس سے وہ بھاگ نہیں سکتے۔اللہ ایسے لوگوں کو بخوبی جانتا ہے اس لئے اس نے انکے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں۔ہم مدینۃ المعاجز (اردو) جلد ا صفحہ ۳۶۸ اور ۳۶۹ سے ایک حدیث پیش کرتے ہیں تا کہ ان کشتگانِ عمل کی بھی تسلی ہو جائے۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے فرمایا۔''میں نے نماز فرض کی ہے لیکن سفر میں اسے قصر کیا ہے (یعنی آدھی نماز معاف کر دی ہے)۔میں نے روزہ فرض کیا ہے اور مسافر کو اس میں چھوٹ دی ہے۔میں نے حج فرض کیا ہے لیکن جسے استطاعت حاصل نہ ہو اس پر حج معاف کر دیا ہے۔میں نے زکوٰۃ فرض کی ہے لیکن مفلس کو معاف کیا

ہے۔ میں نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کی محبت کو اہلِ آسمان و زمین پر فرض کیا ہے اور اس میں کسی کو کسی طرح کی رعایت نہیں دی ہے''۔

یہ حدیث میں نے ان لوگوں کے لئے بیان کی ہے جو صرف ذکرِ جلی کے دیوانے ہیں اور ذکرِ خفی سے غافل بلکہ متنفر ہیں ورنہ اہمیت عمل کا میں ان لوگوں سے زیادہ معترف ہوں لیکن بت پرستی کی حمایت میں کسی صورت نہیں کر سکتا اور میرا ایمان ہے کہ حقیقی اور مقبولِ بارگاہِ خداوندی وہی عمل ہے جو علیؑ کی محبت میں سرشار ہو کر کیا جائے کیونکہ بندوں سے عمل کروانے سے بھی مقصود و مطلوبِ خدائے لم یزال اسی محبت کو پروان چڑھانا ہے۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم کی ایک آیت میں حضرت ابرہیمؑ کی وہ دعا نقل کی گئی ہے جو انھوں نے اس وقت کی تھی جبکہ وہ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو کعبے کے قریب غیر آباد علاقے میں تنہا چھوڑ کر جا رہے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی کہ ''اے پروردگار! پس آدمیوں میں سے بعض کے دل انکی طرف مائل و گرویدہ کر دیجئو''۔ اس آیت کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''ابرہیمؑ نے خانۂ کعبہ کیطرف نہیں بلکہ اپنی اولاد کیطرف لوگوں کے دل موڑ دینے کو کہا ہے۔ لوگ جھوٹ بکتے ہیں کہ خدا نے ان پتھروں کے پاس آنا ان پر فرض کیا ہے۔ لیکن اہل بیتؑ کی محبت رکھنے کا ان سے سوال ہوگا۔ خدا کی قسم اللہ نے ہماری محبت کے سوا اور کچھ فرض نہیں کیا''۔ (تفسیر فرات صفحہ ۱۴۵)

اس سے زیادہ واضح دلیل میں پیش نہیں کرسکتا۔انصاف پسند حضرات میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔میرا معروضہ یہ ہے کہ عمل یقیناً انسان کو فائدہ پہنچائے گا مگر ہر عمل نہیں بلکہ صرف وہ عمل جسے اللہ قبول کرلے۔اب ''عمل عمل'' کی پکار مچانے والے یہ بتائیں کہ انکے پاس کونسی گارنٹی ہے کہ انکے اعمال قبول ہورہے ہیں؟۔اللہ نے ہمیں اندھیرے میں تیر چلانے کا حکم تو نہیں دیا۔لہٰذا وہی عمل کارآمد ہوسکتا ہے جسکی بنیاد محبتِ اہلبیتؑ ہوچاہے وہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہواور ہروہ عمل برباد ہے جسکا تعلق محبت اہلِ بیتؑ سے نہ ہو چاہے وہ کتنا ہی کثیر کیوں نہ ہو۔اسی لئے حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے۔''کثرت عمل کی بجائے قبولیت عمل کی فکر کرو کیونکہ اللہ جس سے محبت کرتا ہے اسکے قلیل عمل کو بھی قبول فرماتا ہے اور کیونکر قلیل ہوسکتا ہے وہ عمل جسے اللہ قبول کرلے''۔اسی طرح التوحید صفحہ ۱۹ احدیث ۴ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

''تم لوگ تھوڑے پر عمل کرواور زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرو''۔

حقیقتاً محبت ومعرفتِ اہلبیتؑ ہی وہ مرکز ہے جسکے گرد یہ پوری کتاب گردش کررہی ہے۔ہم نے اپنی ہیچمدانی اور بے طاقتی کے باوجود ایک ایسی وادی میں قدم رکھا ہے جہاں ہم کھلی آنکھوں سے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھ رہے ہیں۔جہاں کثرتِ جلوہ خود حجابِ نظر بنا ہوا ہے۔جہاں ایک طرف سے ''اللہ'' کی آواز اُٹھتی

ہے تو اس کی بازگشت "علی !علی !علی !" کی صورت میں گونجتی ہے۔ جہاں آنکھیں دیکھتی ہیں مگر نہیں دیکھتیں ۔کان سنتے ہیں مگر نہیں سنتے ۔ ہاتھ حرکت کرتے ہیں مگر گرفت نہیں کرتے ۔پاؤں چلتے ہیں مگر فاصلہ طے نہیں کرتے ۔فقط ایک شے ہے جو بحال رہتی ہے اور وہ ہے بصیرت مگر وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ دل پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہوں ۔ سینے امین ہوں اور عقول پختہ کار ہوں ۔ایسے مقام پر کھڑے ہو کر بات کرنا کتنا مشکل کام ہے اسکا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں ۔اصل دشواری یہ ہے کہ میرے قارئین میں ہر سطحِ ذہنی و علمی کے لوگ شامل ہیں بلکہ مقصرین و منکرین کے ہاتھوں میں بھی یہ کتاب جائے گی اور یہیں سے میری مشکل کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ میرے مولاؑ نے فرمایا ہے۔ "جاہل جو بات نہیں جانتے اس سے انھیں آگاہ نہ کر کیونکہ وہ تیری تکذیب کریں گے ۔تیرا علم تیرے لئے حق ہے اور انکا حق تجھ پر یہ ہے کہ علم کو مستحق تک پہنچائے اور غیر مستحق سے باز رکھ "۔(نہج الاسرار ج ا صفحہ ۷۷)

تفسیر فرات صفحہ ۲۵۱ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "ہم لوگوں سے کئی قسم کی احادیث بیان کرتے ہیں ۔ہماری بعض احادیث وہ ہیں جنکو ہم بلا خوف وخطر منبر پر بیان کرتے ہیں جو ہمارے لئے زینت کا اور ہمارے دشمنوں کے لئے رسوائی کا باعث ہیں ۔بعض احادیث وہ ہیں جو ہم صرف اپنے شیعوں سے بیان کرتے ہیں جس پر وہ اتحاد و اتفاق کرتے ہیں ۔بعض احادیث وہ ہیں جو صرف ایک یا دو آدمیوں سے بیان

کرتے ہیں ۔اگر ایسی حدیث تین آدمیوں سے بیان کی جائے تو وہ بیکار ہوجاتی ہے ۔ایک حدیث ہماری وہ ہے جسکو ہم صرف محفوظ قلعوں ۔امین دلوں ۔فہم رسا اور عقولِ سنجیدہ کے سپرد کرتے ہیں۔ایسے لوگ حدیث کے ظروف ۔نگہبان ۔دعوت دینے والے ۔حفاظت کرنے والے اور گواہ بن جاتے ہیں''۔

ایسی صورتِ حال میں معرفت کے موضوع پر ایسے اسلوب سے لکھنا کہ وہ تمام طبقات کے لئے قابلِ قبول بن جائے اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔اسی لئے اگر چہ حقائقِ معرفت کا موجیں مارتا ہوا سمندر دل کو تہ و بالا کررہا ہے پھر بھی ہم نے اپنی سی بھر پور کوشش کی ہے کہ خود کو محدود رکھیں کیوں کہ ہمارے یہاں لفظوں کو پکڑنے ۔ان سے کھیلنے ۔ان پر اعتراضات وارد کرنے اور فتوے لگانے کا رواج عام ہے اور معنیٰ کی گہرائیوں میں اتر کر حقائق کے آبدار موتی لانے کو معیوب سمجھا جاتا ہے ۔اس مصیبت سے محفوظ رہنے کے لئے ہم اپنے مقصدِ اصلی کیطرف آہستہ آہستہ ۔درجہ بہ درجہ اور قدم بہ قدم چلے ہیں تاکہ ہمارے قارئین ہر مرحلے پر ہمارے ساتھ ساتھ رہیں اور اچانک کوئی بات ایسی نہ آجائے جہاں وہ ٹھٹک کر رہ جائیں ۔اسی لئے ہم نے اپنے موقف کے اثبات کے لئے قرآن و احادیث کے علاوہ دعاؤں اور زیارات پر مبنی کتاب ''مفاتیح الجنان'' سے خصوصی استفادہ کیا ہے کیونکہ یہ وہ کتاب ہے جو ہر شیعہ گھر میں پائی جاتی ہے اور جسکو خیر و برکت اور حصولِ حوائج کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور اسطرح ہم نے معترضین کا منہ پہلے ہی مرحلے میں بند کردیا ہے۔

ادعیہ وزیارات کی حقیقت

دعا کرنا اور اپنے محبوب سے ملاقات کی خواہش رکھنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے لیکن ان دونوں چیزوں کیلئے کچھ آداب ضروری ہیں۔ معلّمینِ اخلاق یعنی ائمہ معصومینؑ نے جہاں دیگر مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی وہیں دعا کرنے اور زیارت کرنے کے آداب بھی ہمیں سکھائے تاکہ دعاؤں اور زیارات کو شرفِ قبولیت مل سکے لیکن مفاد پرستوں نے ان دعاؤں اور زیارات کو ایک ''ٹوٹکا'' سمجھا اور وہ انھیں منتر سمجھ کر پڑھنے لگے درآنحالیکہ وہ انکی حقیقت سے بے خبر تھے۔

ائمہ اطہارؑ دنیا میں اپنی معرفت کرانے اور اسکے ذریعے اللہ کی عبادت کرانے کے لئے آئے تھے لیکن انکا زمانہ اس قدر مخدوش اور ہولناک تھا کہ انکے لئے اعلانیہ طور پر اپنے فضائل بیان کرنا انتہائی مشکل تھا۔ اس لئے انھوں نے حکمتِ الٰہیہ سے کام لیتے ہوئے دعاؤں اور زیارات کے کوزے میں محبت ومعرفت کے ایک ایسے سمندر کو بند کردیا کہ اگر انسان اسکی طرف نظرِ توجہ کرلے تو اسکے دین و دنیا دونوں سنور جائیں۔ جب آپ یہ کتاب پڑھ چکیں گے تو آپ کو ہماری صداقت کا ضرور یقین آجائے گا۔

شیعہ

نہج الاسرار ج ۱ صفحہ ۱۴۱ پر حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''کوئی شخص کسی مقام کا

مستحق نہیں ہوسکتا جب تک وہ اس مقام کے مراتب کو نہ جان لے''۔

آنجنابؑ کے اس ارشاد کی رو سے وہ شخص شیعہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے جسے مقامات ومراتب شیعہ کا علم نہ ہو۔لہذا ضروری ہے کہ خود کو شیعہ کہنے سے قبل اس بات پر غور کیا جائے کہ شیعہ ہوتا کیا ہے۔

سب سے پہلے ہم اس لفظ کے لغوی معنی پر نظر کرتے ہیں اس کے بعد اسکی حقیقی معنویت پر گفتگو کریں گے۔آپ کوئی بھی لغت اٹھا کر دیکھیں چاہے وہ عربی ہو۔فارسی ہو یا اردو۔اس میں لفظ شیعہ کے عمومی معنی تو کئی ملیں گے لیکن اس لفظ کے خصوصی معنی ہر لغت میں ایک ہی ہیں اور وہ ہیں۔''حضرت علیؑ کے حمایتی''۔ہمیں سوچنا چاہئے کہ کیا ہم واقعی علیؑ کے حمایتی ہیں؟۔

۱۔کیا ہم علیؑ کے قول کو انکے غیر کے قول پر ترجیح دیتے ہیں؟۔

۲۔کیا ہم کسی ایسے شخص کی حمایت تو نہیں کرتے جو علیؑ کے حکم کے خلاف حکم لگاتا ہو؟۔

۳۔کیا ہم کسی ایسے شخص کی حمایت تو نہیں کرتے جو علیؑ کی برابری کا دعویٰ کرتا ہو؟۔

۴۔کیا ہم کسی ایسے شخص کی حمایت تو نہیں کرتے جو علیؑ کے خطابات والقاب کو اپنے لئے استعمال کرتا ہو؟۔

۵۔کیا ہم کوئی عمل کرنے سے پہلے یہ تلاش کرتے ہیں کہ اس مسئلے میں علیؑ کا حکم کیا ہے؟۔اور کہیں علیؑ کا حکم تلاش کرنے کی بجائے ہم یہ تو تلاش نہیں کرتے کہ فلاں شخص کا فتویٰ کیا ہے؟۔

۶۔ کیا ہم علیؑ کے فضائل میں شک تو نہیں کرتے؟۔ یہ کیسے اور وہ کیسے تو نہیں کہتے؟۔ کیا ہمیں علم ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے۔ ''علیؑ کے متعلق شک کرنا اللہ تعالٰی کے ساتھ کفر کرنا ہے''؟۔ (مدینۃ المعاجز ج ۱ صفحہ ۳۵۹)۔ نیز آنحضرتؐ نے ہی فرمایا ہے۔ ''جو خدا کی نافرمانی کرے گا علیؑ کی ولایت کے بارے میں وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہے گا''۔ (تفسیر فرات صفحہ ۳۵۹)

۷۔ کیا ہم کسی ایسے خطیب کو ٹوکتے ہیں یا نہیں جو فضائلِ علیؑ کا بائیکاٹ کرتا ہو؟۔ اور کیا ہم کسی ایسی محفل میں شرکت تو نہیں کرتے جس میں فضائلِ علیؑ بیان نہ کیے جاتے ہوں؟۔ جبکہ رسولؐ اللہ نے واضح طور پر حکم دیا ہے کہ ''زینو مجالسکم بذکرِ علیؑ ابن ابی طالبؑ''۔ اپنی مجالس کو علیؑ کے ذکر سے زینت دیا کرو۔

جب ان سوالات کے صحیح جوابات مل جائیں تب ہی کسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ خود کو لفظِ شیعہ سے موسوم کر سکے۔

دوسری بات

ہر مذہب کی پہچان اسکے کلمے سے ہوتی ہے اور مذہبِ شیعہ کی پہچان کلمہ ''علی'' ولی اللہ'' ہے جسکی دلیل یہ ہے کہ جس مسجد سے اذان میں علی'' ولی اللہ کی آواز آتی ہو تو اس اذان کو سن کر ہی لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ شیعوں کی مسجد ہے۔ اگر یہ کلمہ ہٹا دیا جائے تو مذہبِ شیعہ اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔ لہٰذا جس شخص کا کلمہ صرف

''لا الٰہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ'' ہو اس پر لفظِ مسلمان کا اطلاق تو ہوتا ہے مگر لفظِ ''شیعہ'' سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''علیؑ وہ کلمہ ہے جس کو متقین نے گرہ باندھ لیا ہے''۔ (تفسیر فرات صفحہ ۲۱۰)۔ پہلے تو انسان کو متقی بننا پڑتا ہے تا کہ ہدایت پاسکے۔ شیعہ بننا تو بعد کی بات ہے۔ شیعہ تو ہدایت پانے کے بعد بنتا ہے۔ جب انسان متقی ہی نہ ہو تو وہ اپنے لئے لفظِ شیعہ کیونکر استعمال کر سکتا ہے؟۔ اسی لئے مفاتیح الجنان صفحہ ۱۰۹۹ پر یہ دعا منقول ہے کہ ''پروردگار! ہمیں محشور فرما اس گروہ میں جنھوں نے لا الٰہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علیؑ ولی اللہ پڑھا''۔ کتنی عجیب بات ہے کہ عملاً تو شہادتِ ولایتِ علیؑ کی مخالفت کی جائے اور دعا یہ کی جائے کہ ہمیں یہ شہادت دینے والوں کے ساتھ محشور فرما۔ یہ تو اللہ سے بدترین ٹھٹھا بازی اور مسخرہ پن کرنا ہے۔

محبت کا مذہب

مذہبِ شیعہ محبت کا مذہب ہے۔ اسکا اوّل و آخر محبت ہے اور ظاہر و باطن محبت ہے۔ خالص محبت!۔ عقل کا کام معرفت کرانا ہے اور معرفت کا کام محبت کرانا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی دور دراز علاقہ میں کوئی بہت بڑا عالم مر جائے تو یہ خبر سن کر آدمی کو افسوس تو ہوتا ہے مگر بالکل واجبی۔ اسکے برخلاف اگر اسکا پڑوسی مر جائے تو اسکو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عالم کی معرفت نہیں رکھتا لیکن اپنے

پڑوسی کی معرفت رکھتا ہے۔اس لئے معرفت سے وہی لوگ چڑتے ہیں جو محبت کے فراری ہوتے ہیں اور معرفت سے لوگوں کو بیزار کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ جو بھی علیؑ کی کوئی فضیلت بیان کرے تو فوراً اس پر نصیری ہونے کا فتویٰ لگا دیا جائے۔یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ابتداء سے یہی ہوتا آیا ہے اور منافقین کا رویہ ہمیشہ یہی رہا ہے چنانچہ عمدۃ المطالب ج ۱ صفحہ ۳۰۵ پر ابن عباس سے روایت ہے کہ آیت ''انّ الّذین یوذون اللہ و رسولہ (جو لوگ اللہ اور اسکے رسول کو اذیت دیتے ہیں) اس وقت نازل ہوئی جب منافقین نے کہا کہ حضرت محمدؐ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم زبان سے اہل بیت رسولؐ کی پوجا کریں''۔

مذہب شیعہ کی تو بنیاد ہی یہ عقیدہ ہے کہ علیؑ کی مدح کرنا مخلوق کی طاقت سے باہر ہے کیونکہ مخلوق اپنے خالق کا احاطہ نہیں کرسکتی۔لفظ کوئی بھی ہو بہر حال مخلوق ہے اس لئے جو الفاظ کی گرفت میں آجائے وہ علیؑ نہیں ہوسکتا جیسا کہ آنجنابؑ نے خود فرمایا ہے۔ ''ہم کو ربوبیت سے پاک رکھو(یعنی ربّ غیر مربوب نہ کہو) اور صفاتِ بشریہ سے بلند رکھو یعنی ان صفات سے جو تمھارے لئے جائز ہیں۔پس ہم میں سے کسی ایک پر بھی لوگوں کے لئے قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بہ تحقیق ہم اسرارِ الٰہیہ ہیں جو ہیئتِ بشریہ میں ودیعت کئے گئے ہیں اور خاکی اجساد میں ہم پروردگار کے کلماتِ ناطق ہیں کہ جتنی تمھاری استطاعت ہو ہماری فضیلت میں کہدو۔پس بہ تحقیق کہ سمندر خشک

نہیں ہوتا۔غیب کے اسرار پہچانے نہیں جا سکتے اور خدا کے کلمات کی توصیف نہیں کی جا سکتی"۔(نہج الاسرار صفحہ ۵۰)۔

علیؑ کے معنی ہیں بلند اس لئے علیؑ سے محبت وہی کر سکتا ہے جسکی نگاہیں بلندیوں کی سیر کرتی ہوں اور آسمانوں کو چیرتی ہوئی عرشِ معلّٰی سے ٹکراتی ہوں۔جسکی نظریں پاتال میں گڑی ہوں اسکو تو سوائے کیڑے مکوڑوں کے اور کچھ نظر ہی نہیں آئے گا۔وہ کیسے جان سکتا ہے کہ علیؑ کون ہے۔

کیا پوچھ رہے ہو کہ علیؑ کون ہے کیا ہے

سمجھو تو وہ بندہ ہے نہ سمجھو تو خدا ہے

علیؑ کی محبت" لا الٰہ الا اللہ" کی مانند ہے کہ جیسے ہی غیر کا تصور داخل ہوا ویسے ہی علیؑ کی محبت کے سارے دعوے نابود ہو جاتے ہیں۔علیؑ خالص محبت کا خریدار ہے۔وہاں کھوٹ کا کوئی کام نہیں جیسا کہ تفسیرِ فرات صفحہ ۳۹ پر حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔"جسکے دل میں غیر کی محبت ہے وہ ہمارا قاتل ہے"۔اب یہ جاننا ضروری ہو گیا کہ یہ"غیر" کون ہے؟۔مجھے معلوم ہے کہ یہ وبال کسطرف دھکیلا جائے گا لیکن اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس"غیر" کی زد میں ہر وہ شخص آئے گا جو علیؑ کیطرف سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر خود مرکزِ نگاہ بننا چاہتا ہو۔جسکی محبت علیؑ کیطرف سے غافل کرتی ہو۔جسکی اطاعت علیؑ کی اطاعت کیطرف سے برگشتہ کرتی ہو۔جسکی ولایت علیؑ کی

ولایت کی قائم مقام بنا چاہتی ہو۔مذہبِ شیعہ ان تمام خرافات سے پاک ہے۔ہم دلیل کے طور پر مفاتیح الجنان صفحہ۱۰۴۱پر درج زیارت امیرؑ المومنین کا ایک جملہ آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتے ہیں:۔

''سلام ہو آپؑ پر اے اللہ کی وہ سبیل ! کہ جو اسے چھوڑ کر چلے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔میں آپؑ کے سوا کسی کا طالب نہیں ہوں اور آپؑ کے علاوہ کسی کو اپنا ولی نہیں بناتا۔میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؑ کی ولایت کے ذریعے اعمال قبول ہوتے ہیں (کیا نماز عمل نہیں ہے؟ پھر بغیر ولایت کے نماز کیسے قبول ہو جائے گی؟)۔جو آپؑ کی ولایت سے برگشتہ ہو اور آپؑ کی معرفت نہ رکھتا ہو اور آپؑ کی جگہ کسی اور کو مانتا ہو تو خدا اسے منہ کے بل آگ میں ڈالے گا اور اسکے اعمال قبول نہیں کرے گا''۔اسی مفاتیح الجنان کے صفحہ ۱۰۲۲پر زیارتِ امامؑ زمانہ کا ایک جملہ یہ ہے۔''سلام ہو اس پر جو حقِ جدید۔ محی المومنین اور ولیِ امر ہے''۔پس مذہبِ شیعہ ان ذواتِ مقدسہ کے علاوہ کسی اور کو ولیِ امر تسلیم کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا اور جس کسی کو انکے علاوہ کسی اور کو ولی بنانے اور ماننے کا شوق ہو وہ کسی اور مذہب کی پناہ لے کیونکہ مذہبِ شیعہ میں ایسا سائبان اسے میسر نہیں آئے گا۔مذہبِ شیعہ کا مرکز تو صرف اور صرف علیؑ ہے کیونکہ صرف وہی ہے جو نقطۂ بائے بسم اللہ ہے۔پوری کائنات اسی کے گرد گردش کرتی ہے اور چرند و پرند و درند غرض کائنات کا ایک ایک ذرہ اسی کے نام کی مالا جپتا ہے۔ہوائیں اسی کی نگاہِ کرم کی نوید لاتی ہیں۔دریا کی لہریں اسی کے گیت گنگناتی ہیں۔بادلوں کی دھمک اور

بجلیوں کی کڑک اسی کا فرمانِ امروز پڑھ کر سناتی ہیں اور آندھیاں۔طوفان۔سیلاب اور زلزلے اسی کے غضب کا اعلان کرتے ہیں۔یہاں تک کہ ملائکہ مقربین جنھیں پیدا ہی عبادت کے لئے کیا گیا ہے اسی کے نام کی تسبیح پڑھتے ہیں اور یہی انکی عبادت کہلاتی ہے۔نہج الاسرارج ۱صفحہ ۵۸ پر انہی حضرتؑ کا یہ فرمان موجود ہے۔''بہ تحقیق کہ میری ولایت اہلِ آسمان پر اسی طرح لازم کی گئی ہے جیسا کہ اہلِ زمین پر اور بیشک ملائکہ میری فضیلت کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کے نزدیک یہی انکی تسبیح ہے''۔

علیؑ اور اللہ میں فرق کرنا ہی اصل شرک ہے کیونکہ وہ علیؑ ہی ہے جسکی اطاعت کو اللہ نے اپنی اطاعت پر مقدم کیا ہے چنانچہ کوکب دری صفحہ ۱۶۳ پر حضرت ختمی مرتبتؐ کا یہ فرمان محفوظ ہے کہ اللہ نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔''جس نے مرتضیٰ کا حق پہچانا وہ پاک اور خوش ہوا اور جس نے اسکے حق کا انکار کیا وہ ملعون اور زیاں کار رہا۔میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ جو شخص اسکی نافرمانی کرے گا اسکو دوزخ میں داخل کروں گا اگرچہ وہ میری اطاعت کرے۔اور جو شخص اسکی فرماں برداری اور اطاعت کرے گا اسکو بہشتِ بریں میں داخل کروں گا اگرچہ وہ میری نافرمانی کرے''۔علیؑ کی محبت حقیقتِ ایمان بھی ہے اور حقیقتِ عمل بھی۔ہم تفسیرِ فرات صفحہ ۳۰۹ سے ایک حدیث پیش کرتے ہیں تاکہ محبت کی قوت کا اندازہ کیا جاسکے۔

''ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔''یا رسولؐ اللہ! میں روزہ داروں کو دوست رکھتا ہوں لیکن روزہ نہیں رکھتا۔نمازیوں کو دوست رکھتا ہوں مگر خود نماز

نہیں پڑھتا۔ صدقہ دینے والوں کو دوست رکھتا ہوں مگر خود صدقہ نہیں دیتا''۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''تو اس شخص کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت کرتا ہے''۔ اسی لئے حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا ہے۔ ''علیؑ کی محبت ایسی نیکی ہے کہ اس نیکی کے ہوتے ہوئے کوئی بدی نقصان نہیں پہنچاتی اور علیؑ کی دشمنی ایسا گناہ ہے کہ اس گناہ کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی''۔ (کوکب دری صفحہ ۱۶۷)۔

جنت علیؑ کے دوستوں کی ہی مشتاق ہے اور جہنم علیؑ کے دشمنوں سے ہی شدید عداوت رکھتا ہے۔ جیسا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''اے ابن عباس! اس ذات کی قسم جس نے مجھے نبی برحق بنایا ہے۔ دوزخ کو جتنی عداوت دشمنِ علیؑ سے ہے اتنی عداوت اسے ان سے بھی نہیں جو خدا کے لئے بیٹے کا عقیدہ رکھتے ہیں''۔ (تفسیر فرات)

ہم علیؑ والے ہیں

پس ہمارے فخر کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہم علیؑ والے ہیں۔ لفظی و معنوی طور پر شیعہ کہتے ہی اسکو ہیں جو علیؑ والا ہو اور علیؑ والا کون ہوتا ہے اسکی چند جھلکیاں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

تفسیر فرات صفحہ ۳۵۔۳۶

رسولؐ اللہ نے حضرت امیرؑ المومنین سے فرمایا۔ ''اے ابوالحسنؑ تمھیں مبارک ہو۔ اللہ تعالٰی روزِ قیامت انھیں عمدہ اونٹنیوں پر سوار کرا کے اٹھائے گا جنکی خلقت نور کی

ہوگی۔وہ انکی قبور کے پاس جا کر بیٹھ جائیں گی۔ان سے کہا جائے گا کہ اے اولیاءاللہ ! ان پر سوار ہو جاؤ۔انکی قطار کو سیدھا رکھو۔تم انکے امام ہوگے۔انکو جنت کی طرف بلاؤ گے۔ایک ہوا جاری ہوگی جو انکے چہروں پر مشکِ خالص کی بارش کرے گی۔وہ لوگ کہیں گے کہ ''ہم تو علیؑ والے ہیں''۔تو ان سے کہا جائے گا کہ اگر تم علیؑ والے ہو تو امن میں ہو جن پر کوئی خوف اور حزن نہیں ہے''۔

اسی تفسیر فرات کے صفحہ ۱۵۳ پر زید بن علیؑ سے روایت ہے کہ قیامت کے روز ایک منادی ندا دے گا۔''وہ لوگ کہاں ہیں جنکی روحیں فرشتوں نے پاک حالت میں قبض کیں؟''۔وہ کہیں گے۔''ہم امیرؑ المومنین کو دوست رکھنے والے ہیں''۔تو ان سے کہا جائے گا۔''اپنے عمل کی وجہ سے تم جنت میں چلے جاؤ''۔(یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ حقیقتِ عمل علیؑ سے محبت کرنا ہے)۔

بس ! آگے بڑھنے سے پیشتر یہاں رک جانا لازم ہے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ لوگ غیر ضروری خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔بات صرف اتنی ہے کہ جو لوگ علیؑ کی محبت سے بیزار اور اپنے عمل پر فریفتہ ہیں اسکا بنیادی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محبت کوئی بہت ہی آسان چیز ہے اور عمل مشکل۔حالانکہ حقیقت اسکے برعکس ہے۔صفین والوں نے نماز روزہ نہیں چھوڑا لیکن علیؑ کا ساتھ ضرور چھوڑ دیا۔کربلا میں صاحبانِ عمل کی بہتات رہی لیکن حسینؑ کی نصرت کیلئے چند نفوس ہی

میدان میں آئے۔ میرے سوال کا انتہائی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیجئے۔ صبحِ عاشور جب امام حسینؑ نے جماعتِ نماز قائم کی تو کچھ اصحاب تو نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور کچھ اصحاب امامؑ کے سامنے دیوار بن کر بیٹھ گئے تا کہ جو تیر آئیں وہ انکے سینوں کو چھلنی کر دیں لیکن امامؑ محفوظ رہیں اور روایات میں آیا ہے کہ اس حملے میں چھتیس اصحاب اپنے سینوں پر تیر کھا کر شہید ہوئے۔ میرے عزیزو! میرے بھائیو! انصاف سے کہو کہ کیا وہ چھتیس محبت کرنے والے بغیر نماز پڑھے اس دنیا سے چلے گئے؟۔ کیا کسی میں طاقت ہے کہ ان جیسی نماز پڑھ سکے؟۔ اب تو سمجھو کہ عمل کسے کہتے ہیں!
نجم آفندی نے کیا خوب کہا ہے۔

حقِ عبادت ادا۔ اہلِ وفا کر گئے

اب وہ نمازیں کہاں۔ سجدے گئے سر گئے

نہیں نہیں! محبت انتہائی مشکل چیز ہے جسکا دعویٰ نہیں کر سکتے مگر بہت ہی کم لوگ۔ ہم تو اگر انکے محبوں کے محب بھی بن جائیں تو بڑی بات ہوگی۔ ہم نے اپنی بات کو اسی لئے روکا ہے تا کہ آپ کو شیعہ اور غیر شیعہ کی پہچان کرا دیں تا کہ ہر کوئی اپنا جائزہ خود لے سکے اور اگر جائزہ لینے کے بعد کوئی یہ محسوس کرے کہ وہ واقعی مومن ہے تو اسکو دنیا و آخرت کی سعادتیں مبارک ہوں۔

کون کون شیعہ نہیں ہوسکتا؟

ا۔حضرت ختمی مرتبتؐ چند باتوں سے بچنے کی تاکید فرمار ہے ہیں اور یہ انتہائے کریمیت ہے کہ عصمتِ مطلقہ پر فائز ہوتے ہوئے بھی تمام نقائص کو اپنی طرف منسوب کر کے انکی نفی کرتے ہیں اور پھر ہمیں منع کرتے ہیں۔ہر شیعہ ان خصوصیات کو غور سے پڑھے اور اگر آج تک ان سے اجتناب نہیں کیا تھا تو اب کرے۔

تفسیر فرات صفحہ۲۱۴۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔''اے لوگو! خدا نے ہم اہلِ بیتؑ کو مندرجہ ذیل چیزوں سے بچایا ہے:۔

ا۔ہم جھوٹے نہیں ہیں۔

۲۔کاہن نہیں ہیں۔

۳۔جادوگر نہیں ہیں۔

۴۔عاق نہیں ہیں۔

۵۔خائن نہیں ہیں۔

۶۔دھمکانے والے نہیں ہیں۔

۷۔بدعتی نہیں ہیں۔

۸۔شکی نہیں ہیں۔

۹۔حق سے روکنے والے نہیں ہیں۔

۱۰۔منافق نہیں ہیں۔

جس شخص میں یہ باتیں موجود ہیں وہ ہم سے نہیں ہے۔ہم اس سے نہیں ہیں۔خدا اس سے بیزار ہے۔ہم بھی اس سے بری ہیں"۔

۲۔کوکب دری صفحہ ۳۲۸۔

حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔"پانچ شخص ہمارے خاندان کے دوست کبھی نہیں ہوسکتے خواہ وہ کتنی کوشش کیوں نہ کریں۔(اس جملے میں یہ مفہوم بھی مضمر ہے کہ جو شخص ہم سے محبت نہیں کرتا اس میں مندرجہ ذیل صفات میں سے کم از کم ایک صفت ضرور موجود ہوگی)۔

اوّل۔دیّوث:۔دیّوث ایسے شخص کو کہتے ہیں جسکو معلوم ہو کہ اسکی زوجہ زنا کار ہے اور وہ اس صورتِ حال پر راضی ہو۔

دوئم۔مخنث:۔یعنی ایسا شخص جو پیدائشی طور پر ہیجڑا ہو۔

سوئم۔حرام زادہ:۔اس سے تو ہر شخص واقف ہے کیونکہ لوگ اکثر ایک دوسرے کو اس لقب سے پکارتے رہتے ہیں۔

چہارم:۔وہ شخص جسکی ماں ایام حیض میں اس سے حاملہ ہوئی ہو۔

پنجم۔پشت انداز:۔اس لفظ کے معنی ہمیں معلوم نہیں۔لغت میں ہم نے دیکھا تو اسکے

معنی یہ ملے۔ ''علّتِ اُنثیٰ (علّتُ المشائخ) میں مبتلا شخص''۔ مگر یہ معنی بھی ہمارے لئے نا قابلِ فہم ہیں۔ اس لئے اسکے معنی کسی واقف کار شخص سے پوچھے جائیں۔

۳۔ تیسری خصوصیت جو لفظِ شیعہ کو مانع ہے وہ ترکِ تقیہ ہے۔ یاد رکھئے کہ وہ شخص ہرگز شیعہ نہیں ہوسکتا جو غیبتِ امامؑ کے زمانے میں سیاسی اچھل کود۔ دھینگا مشتی۔ جنگ و جدال اور قوت کے مظاہرے میں مبتلا نظر آئے اور جو شیعوں کو گھیر گھیر کر ایک جگہ جمع کرتا ہو تا کہ دشمن کو زحمتِ تلاش نہ اٹھانا پڑے اور وہ اطمینان سے بیک وقت سب کو نقصان پہنچا سکے۔

(الف)۔ کمال الدین وتمام النعمہ صفحہ ۳۷۱۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا۔ ''جس نے ہمارے قائمؑ کے ظہور سے پہلے تقیہ ترک کر دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

(ب)۔ کمال الدین وتمام النعمہ صفحہ ۶۱۱۔ راوی نے امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا کہ ''آقا! باطل حکومتوں کے دور میں امام قائمؑ کے دامن سے متمسک رہتے ہوئے چھپ چھپ کر عبادت کرنا افضل ہے یا ظہورِ امامؑ کے بعد آپؑ کے عہدِ حکومت میں اعلانیہ عبادت کرنا؟''۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''اے عمار! باطل حکومتوں میں پوشیدہ خیرات خدا کی قسم اعلانیہ خیرات سے افضل اور بہتر ہے۔ اسی طرح باطل پرست حکومتوں کے دور میں امام غائبؑ کے دامن سے وابستہ رہتے ہوئے پوشیدہ عبادت افضل ہے۔ تم دیکھتے رہے کہ تمھارے امام کا حق اور تمھارا حق ظالموں کے ہاتھوں میں

ہے۔ تمھیں تمھارا حق نہیں دیا گیا اور مجبور کیا گیا کہ تم لوگ اپنے دین پر صبر کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اللہ کی عبادت اور اطاعت کرتے رہو۔ اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہوئے کسبِ معاش میں لگے رہو۔ جس طرح اللہ نے تمھارے اعمال میں اضافہ کیا پس یہ فضیلت تمھیں مبارک ہو"۔

شانِ مومن

اب آخر میں ہم ان بلند مرتبہ لوگوں کا مختصر سا تعارف کراتے ہیں جو مندرجہ بالا صفاتِ رذیلہ سے پاک اور سفینۂ محبت میں سوار ہیں:۔

ا۔ تفسیر فرات صفحہ ۲۹۷۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "ہمارے شیعہ اہلِ بیت میں داخل ہیں۔ انکے دلوں پر ہم اہلبیتؑ کی محبت القاء ہوتی ہے۔ اہلِ بیتؑ کی محبت کا انھیں الہام ہوتا ہے"۔

اس سے بڑھ کر بندہ نوازی کی مثال مل ہی نہیں سکتی۔ بارگاہِ رحمت آواز دے رہی ہے پس کوئی ہے جو قبیلۂ سلمانؑ میں شامل ہونا چاہتا ہو اور صاحبِ الہام کہلانا پسند کرتا ہو؟۔

۲۔ تفسیر فرات صفحہ ۳۰۶۔ سورۂ زمر میں ارشاد ہوتا ہے۔ "کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان لوگوں کے برابر ہیں جو نہیں جانتے؟۔ بس نصیحت تو صاحبانِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں"۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ اپنے والدِ بزرگوار سے روایت کرتے ہیں۔ ''جاننے والے ہم ہیں۔ نہ جاننے والے ہمارے دشمن ہیں۔ نصیحت حاصل کرنے والے اور صاحبانِ عقل ہمارے شیعہ ہیں''۔

عقل مخصوص ہے شیعہ سے کیونکہ عقل کا کام ہی ہادی کا تعارف کرانا ہوتا ہے۔ پس جو ہادی کی معرفت رکھتا ہے وہی شیعہ ہے اور وہی صاحبِ عقل۔ اسکے علاوہ جو بھی ہے اللہ کے نزدیک اسکا شمار بے عقلوں میں ہوتا ہے۔

۳۔ تفسیر فرات صفحہ ۳۸۹۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''قیامت کے روز شیعوں کا حساب ہم لیں گے۔ اگر خدا کا کچھ دینا ہے (مثلاً نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ) تو محمدؐ خدا سے معاف کرالیں گے۔ اگر بندوں کا کچھ دینا ہے تو محمدؐ اسکو ادا کردیں گے۔ اگر ہمارا کچھ دینا ہے تو ہم معاف کردیں گے اور وہ جنت میں بے حساب چلے جائیں گے''۔

کیا اب بھی کوئی ایسا ہے جو قیامت کے خوف سے کھڑا کانپ رہا ہو؟۔ ایک کتاب آئی تھی جسکا نام تھا ''اُس دن سے ڈرو''۔ یعنی قیامت سے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اُس دن سے نہیں بلکہ اِس دن سے ڈرو۔ یعنی آج سے۔ آج اگر تم کشتیٔ نجات میں سوار ہوگئے تو پھر اس دن کی فکر سے فرصت ہی فرصت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو اپنے ائمہؑ کے قول اور وعدے پر اعتماد ہی نہ ہو۔

۴۔ کمال الدین وتمام النعمہ صفحہ ۳۰۶۔ حدیث ۸۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''یا علیؑ! جان لو کہ ان لوگوں کا ایمان تعجب خیز اور انکا یقین عظیم

ترین ہے جو آخری زمانے میں ہونگے جبکہ انکے درمیان کوئی نبی نہ ہوگا اور حجتؑ خدا انکی نظروں سے پوشیدہ ہوگی۔ اسکے باوجود وہ اندھیروں میں روشنی پر ایمان لائیں گے''۔

آپ مقاماتِ شیعہ پر غور فرمائیں کہ خود حضرت ختمی مرتبتؐ جنکے ایمان کو تعجب خیز اور جنکے یقین کو عظیم ترین قرار دے رہے ہیں صرف اس لئے کہ وہ اندھیروں (غیبت) میں روشنی (حضرت حجتؑ) پر ایمان لائیں گے نہ کہ اپنی اپنی موم بتیاں جلا کر بیٹھ جائیں گے۔

۵۔کمال الدین وتمام النعمہ صفحہ ۳۳۱۔امام زین العابدینؑ نے فرمایا۔''اس (حضرت قائمؑ) کی غیبت کے زمانے میں وہ لوگ جو اسکی امامت کے قائل اور اسکے ظہور کے منتظر ہونگے وہ تمام زمانوں کے لوگوں سے افضل ہونگے کیونکہ اللہ انکو عقل وفہم و معرفت عطا کرے گا۔ انکے نزدیک غیبت مشاہدے کی طرح ہوگی۔ انکا مرتبہ ان مجاہدین کے برابر ہوگا جنھوں نے رسولؐ اللہ کی اقتداء میں تلوار سے جہاد کیا۔یہی لوگ حقیقتاً ہمارے مخلص اور سچے شیعہ ہونگے۔وہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف ظاہرہ اور پوشیدہ دعوت دیں گے''۔

امامؑ کا انتظار وہی لوگ کریں گے جو ہر طرف سے مصائب و آلام میں گھرے ہوئے ہوں اور دعائیں کرتے ہوں کہ جلد ہمارے امامؑ کا ظہور ہوتا کہ ہماری کشادگی کا زمانہ

آئے۔ جن لوگوں کے سارے کام بغیر امامؑ کے ٹھیک ٹھاک چل رہے ہوں انھیں امامؑ کی ضرورت ہی کیا ہے اور وہ امامؑ کا انتظار کیوں کریں گے؟۔

۶۔ تفسیر فرات صفحہ ۲۶۷۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''اہلِ بہشت ہمارے شیعوں کے منازل کو اسطرح دیکھیں گے جیسے دنیا والے آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہیں''۔

اب جسکا جی چاہے خیمۂ حسینیؑ میں داخل ہوکر'' اولئك فی جنّٰت مکرّمون '' میں شامل ہو جائے اور اس مقام تک کوئی اور شے لے جا ہی نہیں سکتی سوائے محبتِ اہلِ بیتؑ کے کہ شیعوں کے دلوں پر جسکا الہام ہوتا ہے۔

۷۔ نہج البلاغہ صفحہ ۶۸۰۔ مکتوب نمبر ۲۸۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''اگر خداوندِ عالم نے خودستائی سے نہ روکا ہوتا تو بیان کرنے والا (یعنی خود امیرؑ المومنین) اپنے وہ فضائل بیان کرتا کہ مومنین کے دل جنکی معرفت رکھتے ہیں''۔

یہ کلام نہیں بلکہ معجزہ ہے جس پر غور کیا جائے تو حقیقی مومن کی پہچان ہو جاتی ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ مولاؑ نے اپنے جو فضائل بیان فرما دیے ہیں لوگ تو ان ہی کا انکار کرتے ہیں اور ان میں طرح طرح کے اشتباہات پیدا کرتے ہیں لیکن میرے مولاؑ مومن کی یہ شان بیان فرما رہے ہیں کہ جو فضائل انھوں نے بیان ہی نہیں فرمائے مومن انکی بھی معرفت رکھتا ہے اور مومن ان فضائل کو کسطرح جان لیتا ہے۔ پہچان لیتا ہے اور

مان لیتا ہے یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے دو مقامات پر لبیک کہی ہو۔ صبحِ الست اور عصرِ عاشورہ۔ انکے علاوہ کوئی اور نہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ مان سکتا ہے اور شاید اسی میں اسکی بہتری ہے کیونکہ اگر علیؑ کے حقیقی فضائل کی ایک ادنیٰ جھلک بھی اس نے دیکھ لی تو اسکا دل حرکت کرنا چھوڑ دے گا۔ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

غیر اللہ

شیطان نے جب اللہ کے مقابلے کی ٹھانی تو اس نے اپنے لشکروں کو ترتیب دیتے وقت ایک اصول تراشا۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ کو نہ تو کبھی اس نے دیکھا۔ نہ کبھی اس سے بات کی۔ نہ کبھی اس سے ملاقات کی۔ اس لئے اللہ پر حملہ کرنا یا اللہ کو قتل کرنا اسکے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اللہ اپنی مخلوق کے لئے ظہور فرماتا ہے تو خلیفۃ اللہ کے حجاب کے ذریعے اور اسی اعتبار سے اس نے اپنا نام ''الظاہر'' رکھا ہے۔ لہٰذا اللہ کی مخالفت کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خلیفۃ اللہ کی مخالفت کی جائے اور خلیفۃ اللہ کی مخالفت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان تفریق پیدا کر دی جائے۔ یہی وہ ہتھیار تھا جسے شیطان نے سب سے پہلے ایجاد کیا اور جسکے ذریعے وہ مخلوقِ خدا پر حملہ آور ہوا۔ اس ہتھیار کا نام اس نے ''غیر اللہ'' رکھا جسکا مقصد اللہ کی آڑ لیکر خلیفۃ اللہ کی مخالفت کرنا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے قارئین اس بنیادی بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ اگر خلیفۃ اللہ کو اللہ سے جدا کیا گیا تو پھر توحید کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے اور سوائے ایک تصورِ موہوم کے کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا کیونکہ توحید کے ادراک کا واحد ذریعہ اور وسیلہ خود خلیفۃ اللہ کا وجود ہے جسکے بغیر توحید کوئی معنیٰ و مفہوم ہی نہیں رکھتی۔ اگر انسان کسی ان دیکھی۔ ان سنی یا انجانی شے کا تصور کرتا ہے تو

وہ تصور خود اسکے ذہن کی تخلیق ہوتی ہے اور خود اپنی مخلوق کی پرستش کرنا دراصل توحید کی نفی کرنا اور بت پرستی کرنا ہے۔ جو لوگ بتوں کو پوجتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟۔ وہ بھی تو اپنے تصور کے ذریعے ایک بت تراشتے ہیں اور پھر اسکی پوجا کرتے ہیں۔ بت چاہے پتھر کا ہو۔ مٹی کا ہو۔ لکڑی کا ہو یا خیال کا۔ اسے بہر حال بت ہی کہا جائے گا۔ اسکا نام چاہے God رکھ لو۔ بھگوان رکھ لو یا اللہ رکھ لو مگر نام رکھ لینے سے انکی حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ اگر ضد اور ہٹ دھرمی کو ایک طرف رکھ کر حقیقت پسندی کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ بات فوراً سمجھ میں آجائے گی کہ کسی شے کو جانے بغیر اسکو ماننا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اللہ کی مخلوق کو دیکھ کر اللہ کو جانا جاتا ہے تو کیا وہ اس بات کا انکار کرے گا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جس نے ہمیشہ اللہ کے وجود کا انکار کیا ہے؟۔ کیا اللہ کی مخلوقات کو ان لوگوں نے نہیں دیکھا؟۔ پھر یہ انکار کیسے ممکن ہوا؟۔ ہم تو تب مانیں گے جب کوئی سورج کی کرنوں کو دیکھ کر سورج کا انکار کر دے۔ لیکن آج تک ایک بھی ایسا انسان نہیں گزرا جس نے سورج کا انکار کیا ہو۔ پھر اللہ کا انکار کیسے ممکن ہوا؟۔ پتہ چلا کہ مخلوقات کو دیکھ کر وجودِ خالق کا تو ادراک کیا جا سکتا ہے مگر تمام مخلوقات مل کر بھی دلیل توحید نہیں بن سکتیں۔ اس بات کی توثیق امام رضاؑ کے اس فرمان سے ہوتی ہے جو صحیفۂ رضاؑ صفحہ ۴۳ پر درج ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں۔ ”اے اللہ میں ان سے براءت طلب کرتا ہوں جو تجھے تیری مخلوق

کے ذریعے پہچاننا چاہتے ہیں''۔

خالق کو مان کر کسی نے کہا کہ وہ فطرت (Nature) ہے۔ کسی نے کہا کہ مادّہ ہے۔ کسی نے کہا کہ دہر ہے۔ کوئی دو خداؤں کا قائل ہوا۔ کوئی تین کا اور کوئی ہزاروں کا۔ پس وجودِ خالق کا ادراک کبھی بھی انسان کو توحید تک نہیں پہنچا سکا۔ جس کسی کو بھی توحید کا ادراک ہوا ہے تو صرف خلیفۃ اللہ کے ذریعے سے ہوا ہے۔ اسی کے جلال و جمال و کمال کو دیکھ کر انسان نے توحید کو جانا ہے اور مانا ہے۔ لہٰذا لفظِ ''غیر اللہ'' زبان سے ادا کرتے وقت انسان کو ہزار مرتبہ سوچنا پڑے گا اور اس لفظ کی حدود کو جاننا پڑے گا کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں زبانی توحید عملی شرک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی وہ لفظ ہے جس سے شیطان کا مشن آگے بڑھتا ہے۔

غیر اللہ کون ہے؟

لفظی اعتبار سے اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ غیر اللہ ہے لیکن معنوی اعتبار سے غیر اللہ وہ ہے جو اللہ کے مقابلے پر آئے۔ یعنی یہاں غیر بمعنی مخالف ہوتا ہے۔ جو شے اللہ کیطرف سے ہو۔ اللہ کے لئے ہو۔ اللہ کے حکم سے ہو اور اللہ کیطرف لے جاتی ہو وہ ہرگز ہرگز غیر اللہ نہیں ہو سکتی۔ اس بات پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی حقیقت کو ہم چند مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم یہ کوشش اس لئے کر رہے ہیں کہ آپ مبادیات کو جان لیں اور ان سے مانوس ہو جائیں تاکہ آئندہ جو عظیم

الشان مباحث آرہے ہیں وہ آپ کے لئے اجنبی نہ رہیں۔اس باب میں ہم نے علامہ عبداللہ شاہ عبد کی کتاب ''العلق سلطاناً نصیرا'' سے خصوصی استفادہ کیا ہے جو ہمیں اپنے مقصد تک پہنچانے کے لئے بہت ضروری تھا۔

اسم اور کعبہ

جب ہم کوئی جانور ذبح کرتے ہیں تو اسکی چند شرائط ہیں۔اوّل یہ کہ وہ جانور بذاتِ خود حلال ہو۔دوئم یہ کہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کے اسم کا ذکر کیا جائے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ظاہر ہوتا ہے:۔

۱۔ حج ۲۸۔ ''تا کہ وہ اپنے فائدوں کو دیکھے اور جو اس (اللہ) نے اپنے چار پائے مویشی عطا کئے ہیں۔جانے ہوئے دنوں میں انکے ذبح پر اللہ کے اسم کا ذکر کریں''۔

۲۔حج ۳۶۔''اور قربانی کے موٹے تازے اونٹ۔ہم نے انھیں تمھارے لئے اللہ کی نشانیوں میں سے قرار دیا ہے۔اس میں تمھارے لئے بھلائی ہے پس تم اس پر نحر کے لئے صف بستہ کھڑا ہونے کی حالت میں اللہ کے اسم کا ذکر کیا کرو''۔

ان آیات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا ذکر نہیں کرنا بلکہ اللہ کے اسم کا ذکر کرنا ہے اور یہ بات ایک بچہ بھی جان سکتا ہے کہ کسی شے کا اسم اس شے کا غیر ہوتا ہے۔قربانی خالصتاً اللہ کے لئے کی جاتی

ہے۔اس میں ''اسم'' کوشریک کرنا شرک پسندوں کی نظر میں یقیناً شرک ہونا چاہئے۔لیکن ایسا کرنے کے لئے سب سے پہلے انھیں قرآن کو جھٹلانا پڑے گا اور قرآن کی تکذیب کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔یہ کتنا اچھا سودا ہوگا کہ انسان اپنے خود ساختہ شرک سے بچنے کے لئے اسلام ہی سے خارج ہو جائے؟۔ معلوم ہوا کہ ''اسم اللہ'' اللہ کا غیر ہوتے ہوئے بھی غیر اللہ میں داخل نہیں ہے بلکہ من اللہ۔للہ۔ باللہ۔با مر اللہ اور الی اللہ کے زمرے میں آتا ہے۔تیسری شرط یہ ہے کہ جانور کا چہرہ کعبے کیطرف ہو۔اگر جان بوجھ کر ایسا نہ کیا جائے تو ہر چند کہ وہ جانور بذاتِ خود حلال ہے اور اس پر اسم اللہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے مگر اس کے باوجود اسکا کھانا حرام ہوگا۔اس صورت میں کعبہ اس عمل میں شریک ہو جاتا ہے جو خالصتاً اللہ کے لئے کیا جا رہا تھا۔کعبہ غیر اللہ ہے لیکن اس مقام پر اگر اسے غیر اللہ میں داخل کیا گیا تو ارتکابِ کفر ہوگا۔یہی صورت نماز۔حج اور ان دیگر امور میں ہے جن میں رو بہ قبلہ ہونا لازمی اور واجبی ہے کہ بغیر رو بہ قبلہ بحالتِ اختیاری نماز باطل ہوگی۔بلکہ کعبے کو غیر اللہ سمجھ کر اسکی طرف رخ نہ کیا جائے گا تو نماز نہ صرف باطل ہوگی بلکہ باعثِ جہنم بھی۔پس اس سے ثابت ہوا کہ اگرچہ کعبہ اللہ نہیں ہے بلکہ غیر اللہ ہے لیکن اللہ نے اسے اپنے حکم سے غیر اللہ سے نکال کر با امر اللہ اور من اللہ و باللہ میں داخل کر دیا ہے۔

عظمت

''العظمۃ للہ''مشہور و معروف ہے اور اسکا مطلب یہ ہے کہ عظمت صرف اللہ کے لئے ہے لہذا غیر اللہ کی عظمت حرام ہے۔لیکن اللہ نے خود فرمایا ہے۔''جو شعائر اللہ کی تعظیم بجالائے پس وہ دل کی پرہیزگاری سے ہے''۔(حج ۳۲)۔

اسطرح اللہ نے اپنے اس فرمان سے شعائر اللہ کی تعظیم کو اپنی عظمت و تعظیم میں داخل کرلیا ہے۔اب اگر کوئی مسلمان شعائر اللہ کو غیر اللہ جان کر انکی تعظیم نہ کرے تو وہ اس حکم کے تحت کافر ہوجائے گا لہذا کسی مسلم کی مجال نہیں کہ وہ شعائر اللہ کو غیر اللہ میں داخل کرسکے اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کا مجرم ٹہرے گا اگر چہ وہ عظمتِ الٰہی کی وجہ سے انکی تعظیم نہ کرتا ہو۔پس شعائر اللہ غیر اللہ نہ ہوئے بلکہ انکو من اللہ۔الی اللہ اور با امر اللہ کہا جائے گا۔

حکم

سورۂ مومن کی آیت ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔''پس حکم اللہ ہی کے لئے ہے جو علی الکبیر ہے''۔اسی طرح یوسف ۴۰ میں اللہ ارشاد فرماتا ہے۔''نہیں ہے حکم مگر صرف اللہ کے لئے''۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو حاکم سمجھنا شرک باللہ ہے۔لیکن وہی

اللہ جس نے یہ کہا ہے ۔نساء ۶۵ میں یوں ارشاد فرماتا ہے۔ ''پس تیرے رب کی قسم یہ مومن نہ ہونگے جب تک کہ اپنے جھگڑوں میں تجھے حاکم نہ بنالیں۔پھر تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دلوں میں ذرا بھی تنگی نہ کریں اوراسطرح قبول کریں جس طرح قبول کرنے کا حق ہے''۔اللہ کے اس واضح حکم کے بعد کون مسلمان ایسا ہوگا جو حضرت ختمی مرتبت کو اپنا حاکم نہ مانے اور اگر نہیں مانے گا تو تکذیبِ خدا کا مرتکب ٹھہرے گا اور مسلمان ہی نہ رہے گا۔لہٰذا رسولؐ اللہ غیر اللہ میں داخل نہیں ہوسکتے بلکہ انکو من اللہ و بامر اللہ تسلیم کیا جائے گا اور یہ ایمان رکھنا پڑے گا کہ آپ کو حاکم ماننا ہی اللہ کو حاکم ماننا ہے کیونکہ حکمِ خدا اسی مقدس وجود سے جاری ہوتا ہے۔اسی لئے جب جنگِ نہروان میں خوارج نے ''لاحکم الا للہ'' کا نعرہ لگایا تو حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا کہ ''کلمۃ الحق یراد بہ الباطل ''یعنی کلمہ تو حق ہے مگر اس سے جو مراد لیا جارہا ہے وہ باطل ہے۔یعنی جہاں بھی اللہ اور خلیفۃ اللہ میں تفریق کی جائے گی وہاں باطل ہی رواج پائے گا۔

ولایت

بقرہ ۱۰۷۔''اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی ولی ہے اور نہ مددگار''۔

مددگار کے بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے لیکن اس آیت سے یہ تو بہر حال ثابت ہورہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی ولی نہیں ہے اور جو شخص اللہ کے علاوہ کسی اور کو ولی

مانے وہ بلا شبہ مشرک ہے۔لیکن خود اللہ سورۂ مائدہ کی آیت ۵۵ میں فرماتا ہے۔''ماسوا اسکے نہیں کہ اللہ تمھارا ولی ہے اور اسکا رسول اور وہ مومنین جو حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں تمھارے ولی ہیں''۔اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا رسولؐ اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دینے والے مومنین تمام مسلمانوں کے ولی ہیں۔لہٰذا جو مسلمان اس حکم کے تحت رسولؐ اور ان مومنین کو اپنا ولی نہ مانے وہ خود اللہ کی ولایت کا منکر ہوگا۔پس رسولؐ اور وہ خاص مومنین ہرگز ہرگز غیر اللہ میں داخل نہیں ہوسکتے بلکہ وہ من اللہ اور بامر اللہ ہیں۔

خلق

قرآن میں اللہ نے جابجا اپنی خالقیت کا اعلان کیا ہے۔اگر یہ کوئی معمولی چیز ہوتی تو اللہ اتنی شدت سے اپنی اس صفت کا اظہار نہ کرتا۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں اور اللہ کے علاوہ کسی اور کو اس صفت سے متصف کرنا شرک وکفر میں داخل ہے۔لیکن آلِ عمران ۴۹ میں اللہ حضرت عیسیٰؑ کا ایک قول نقل کرتا ہے جس میں حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں۔''میں تمھارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل جیسی (چیز) خلق کرتا ہوں۔پھر اس میں پھونک مارتا ہوں۔پس وہ اللہ کے حکم سے پرندہ ہوجاتا ہے۔اور میں مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کردیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں''۔

ہم اس پوری آیت پر ''خلق'' کے حوالے سے بات کریں گے لیکن سب سے پہلے یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ اس آیت میں لفظ ''خلق'' کی نسبت براہِ راست حضرت عیسیٰ کی طرف دی گئی ہے اگر چہ حکم اللہ کا ہے۔ یعنی وہ حضرت فرماتے ہیں کہ ''میں خلق کرتا ہوں''۔ لہٰذا قرآن کی رو سے حضرت عیسیٰ کو خالق کہنا اور ماننا واجب ہوا۔ دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ خلق کے سلسلے میں جو الفاظ اللہ نے اپنے لئے استعمال فرمائے ہیں بعینہٖ وہی الفاظ حضرت عیسیٰ کے لئے بھی استعمال کئے ہیں۔ اپنے لئے وہ فرماتا ہے۔ ''اِنّی خالق بشراً من طین ''اور حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں۔ ''اِنّی اخلق لکم من الطین ''۔ لہٰذا اس مقام پر اللہ اور عیسیٰ میں فرق کرنا اللہ کی تکذیب کرنا ہوگا۔

شفاء بمعنی خلق

''اور میں مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتا ہوں یعنی شفاء دیتا ہوں''۔ اس بات سے اکثر لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور حضرت عیسیٰ کو ایک ڈاکٹر کا درجہ دیکر مطمئن ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ امر پہلے امر (یعنی مٹی سے پرندے خلق کرنا) سے بھی عظیم تر ہے جس سے حضرت عیسیٰ کے لئے انسان کو خلق کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یہ بڑا اہم کام ہے کہ پروردگار عالم کسی شخص کو حسب حال و حکمت و ضرورت اندھا یا لنگڑا یا کوڑھی خلق کرتا ہے۔ اس پر تقدیرِ تخلیقی جاری اور واقع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ شخص

حضرت عیسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور آپ سے درخواست کرتا ہے کہ میری ناقص خلقت کو کامل کردیں تو آپؑ اسکے بدن سے صرف اپنا ہاتھ مس کرتے ہیں۔ فوراً ہی اللہ کی تقدیرِ تخلیقی بدلتی ہے اور اسکی خلقت کا نقص دور ہو جاتا ہے اور وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ اسکی خلقت میں کوئی نقص نہیں رہتا۔ پس یہ خلق کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟۔ جس چیز کو اللہ نے اسکے جسم میں خلق ہی نہ فرمایا تھا حضرت عیسیٰ اسکو صرف ہاتھ سے مس کرکے خلق کردیتے ہیں!

مردے کو زندہ کرنا بمعنی خلق

اور اسکے بعد فرمایا۔ ''اور تمھارے لئے مردہ کو زندہ کرتا ہوں''۔

یہ پہلے سے بھی زیادہ اہم امر ہے کہ وہ مردہ شخص تقدیر اور قضاء و قدر کے تحت اپنی مقررہ زندگی گزار کر اپنی اجلِ محتومہ کے تحت مر چکا۔ اجلِ محتومہ نے جسم و روح و نفس میں دائمی جدائی ڈال دی اور جسم گل سڑ کر تحلیل اور فنا ہو چکا۔ پھر اسکو دوبارہ مثلِ سابق صحیح و سالم زندہ کر دینا خلق نہیں تو اور کیا ہے؟۔ اور ان امور پر نصِ قرآنی موجود ہے۔ لہٰذا اس مقام پر اللہ اور عیسیٰ میں جدائی ڈالنے والا اور عیسیٰ کو غیر اللہ میں داخل کرنے والا اللہ کی نصوصِ متواترہ کا انکاری ہے۔

سجدہ

کوئی فردِ واحد بھی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے اور غیر

اللہ کو سجدہ کرنے والا یقیناً کافر و مشرک ہے۔ اسکے باوجود سورہ ص کی آیات ۷۱ تا ۷۲ میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے۔ ’’(اور وہ وقت یاد کرو) جبکہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ یقیناً میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اسے درست کر چکوں اور اس میں اپنی ذرا سی روح پھونک دوں تو تم اسکے لئے فوراً سجدہ کرنے والے ہو کر گر پڑنا‘‘۔

ان آیات سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے خود حکم دیکر فرشتوں سے آدمؑ کو سجدہ کرایا۔ ملائکہ سے زیادہ توحید کو سمجھنے والا اور کون ہو سکتا ہے لیکن آپ اس بات پر غور فرمائیں کہ اگرچہ انھوں نے خلافتِ آدمؑ پر اعتراض کیا تھا لیکن سجدے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسکے برخلاف شیطان نے خلافتِ آدمؑ پر کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن سجدے پر اعتراض کیا۔ اس متضاد طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملائکہ نے مسجود کو نہیں دیکھا بلکہ امرِ خدا کو دیکھا جبکہ شیطان نے مسجود کو دیکھا اور امرِ خدا کی مخالفت کی۔ ملائکہ اس انتظار میں تھے کہ کب آدمؑ کے پتلے میں روح پھونکی جائے اور کب وہ سجدے میں گریں اور شیطان سوچ رہا تھا کہ یہ تو غیر اللہ کے سجدے کی تیاری کر رہے ہیں اور غیر اللہ سجدہ کرنا حرام ہے۔ امرِ رب کے مقابلے میں اجتہادی رائے نے ہی اسے کافر بنا دیا۔ جب امرِ رب کا انکار کافر بنا دیتا ہے تو صاحبِ امر کا انکار کر کے کوئی کسطرح مسلمان رہ سکتا ہے؟۔

یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس سے سرسری طور پر نہیں گزرا جاسکتا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سجدۂ آدمؑ کو جس نظر سے شیطان نے دیکھا تھا اسی نظر سے مسلمانوں نے بھی دیکھا بلکہ اس سے شیعہ علماء بھی محفوظ نہ رہ پائے اور غیر اللہ کے ہوّے سے خوف زدہ ہوکر اس سجدے کی طرح طرح سے تاویلیں کرنے میں مشغول ہوگئے۔حیرت ہے کہ ملائکہ جو ابلیس سے کہیں زیادہ عالم۔اللہ کے فرماں بردار۔وحدت کے پرستار اور غیر اللہ سے بیزار تھے انھوں نے بلا کسی جھجک کے فوراً سجدہ کرلیا۔جب وہ سجدہ کررہے ہیں جنکے حق میں ''لا یعصون بامر اللہ '' آیا ہے تو پھر اس سجدے کو غیر اللہ میں کیوں داخل کیا جارہا ہے اور اسکے لئے سجدۂ عبادتی اور سجدۂ تعظیمی کی اصطلاحیں یا تاویلیں کیوں کی جاتی ہیں؟۔یہ سب امور تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ واقعاً سجدۂ آدمؑ غیر اللہ کا سجدہ تھا۔اب وہ عبادتی تھا یا تعظیمی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جس طرح عبادت محض اللہ کے لئے ہے اسی طرح عظمت بھی محض اسی کے لئے ہے اور ''العظمۃ للّٰہ والشفقۃ علیٰ خلق اللہ '' فرمانِ رسولؐ اس پر دلیل ہے۔پس عبادت ہو یا عظمت سب ہی اللہ کے لئے ہے۔عظمتِ الٰہیہ پر تو مندرجہ بالا حدیث اور قرآنِ مجید میں '' وھو العلی العظیم ''شاہد ہے کہ عظمت صرف اللہ ہی کے لئے ہے اور تعظیم اقرارِ زبان اور تصدیقِ دل سے بھی ہوجاتی ہے۔اور کسی کے لئے کھڑے ہونے سے بھی ہوجاتی ہے

اور کسی کے آگے جھک جانے سے بھی ہو جاتی ہے اور کسی کے لئے سجدہ کرنے سے بھی ہو جاتی ہے۔اور نماز جسے عبادت کہا جاتا ہے اس میں یہ تمام امور یعنی کھڑے ہونا (قیام)۔ جھک جانا (رکوع) اور سجدہ سب ہی شامل ہیں اور انہی افعال کا نام عبادت ہے۔اس بنا پر ''سجدۂ تعظیمی'' کی تاویل سے فائدہ کیا ہوا؟۔اور اس سے معنوی فرق کیا پڑا؟۔اگر غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا جائز مانا جائے گا تو ہر وہ شخص جو غیر اللہ کا سجدہ کرتا ہو اس کے عمل کا جواز ثابت ہو جائے گا۔لہٰذا سجدۂ آدمؑ کو سجدۂ تعظیمی سمجھنے والے کفر کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں کیونکہ غیر اللہ کو کسی بھی قسم کا سجدہ کرنا کفر ہے۔حقیقت بیں نگاہ سے دیکھا جائے تو عبادتِ خدا سے مراد اطاعتِ خدا ہے اور اسکے ہر حکم کی اطاعت کرنا اسکی عبادت میں داخل ہے۔پس ملائکہ کا بامر اللہ آدمؑ کو سجدہ کرنا انکے نزدیک اللہ کی عبادت تھی۔جس نے امرِ خدا سے انکار کیا اسی نے آدمؑ کو غیر اللہ سمجھا۔ہر وہ سجدہ جسکے کرنے کا حکم خود اللہ دے وہ عبادت میں داخل ہے لہٰذا ملائکہ کا آدمؑ کو سجدہ عبادتی سجدہ تھا۔جو فعل بامر اللہ کیا جائے وہ غیر اللہ میں داخل نہیں ہوتا اور جو فعل بلا امر اللہ کیا جائے وہی غیر اللہ میں داخل ہوتا ہے۔اگر کوئی شخص صبح کی نماز تین یا چار رکعت پڑھے تو اگر چہ اس نے کوئی برا کام نہیں کیا بلکہ نماز پڑھی ہے لیکن چونکہ امرِ خدا کے خلاف پڑھی ہے لہٰذا اسکی یہ نماز غیر اللہ کی نماز ہو گی۔پس جس فعل کا اللہ حکم دے وہ غیر اللہ نہیں ہوتا اور جس فعل کا اللہ حکم نہ دے بلکہ انسان خود اپنے نفس کی

خوشنودی کے لئے کرے تو وہی غیر اللہ یں داخل ہوگا۔

سجدہٗ آدمؑ کی بحث سے دونتائج واضح طور پر سامنے آتے ہیں:۔

ا۔عبادتِ خدا کا مطلب اسکے امر کے آگے سر جھکانا ہے۔

۲۔''ایّاک نعبد'' کا مطلب فقط یہی ہے کہ اللہ جسکی تعظیم کا حکم دے اسکی تعظیم کی جائے۔اللہ جسکے سامنے جھک جانے کا حکم دے اسکے سامنے فوراً جھکا جائے اور اللہ جسکو سجدہ کرنے کا حکم دے اسے سجدہ کرنے میں لمحہ بھر کی بھی تاخیر روا نہ رکھی جائے۔اور جو شخص امرِ خدا کے مقابلے میں اپنی رائے کو مقدم کرے وہی غیر اللہ کا پجاری ہے چاہے وہ زبان سے اللہ اللہ ہی کیوں نہ کرتا ہو اور چاہے وہ زبان سے غیر اللہ کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرتا ہو۔

یہاں ہم نے ''ایّاک نعبدُ'' کا حقیقی مقصد واضح کیا ہے اور اب ''ایّاک نستعین'' کیطرف توجہ کرتے ہیں۔

استمداد و استعانت

اب ہم آتے ہیں اس موضوع کیطرف جو غیر اللہ کے پجاریوں کی آنکھ کا شہتیر بنا ہوا ہے اور جو انکا اصل ہدف ہے اور وہ ہے ''استمداد و استعانت'' یعنی مدد مانگنا۔قرآنِ مجید میں طلبِ استعانت کے سلسلے میں سات قسم کی آیات ملتی ہیں جو سب کی سب بظاہر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔جبکہ خود قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی تضاد

ہے ہی نہیں اور اگر تضاد مل جائے تو یہ کلامِ خدا ہی نہیں رہتا۔ معلوم ہوا کہ ان سات قسم کی آیات میں جو تضاد بظاہر نظر آتا ہے وہ ہرگز ہرگز تضاد نہیں ہے بلکہ لوگ تفہیم میں غلطی کر رہے ہیں۔ لہٰذا ضرورت صحیح تفہیم کی ہے نہ کہ قرآن کو کھلونا بنانے کی۔

پہلی قسم کی آیات وہ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدد کرنے والا صرف اللہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ابلیسی قوتیں اپنے پرستاروں پر چھا جاتی ہیں اور غیر اللہ کا بھوت تنگ و تاریک دلوں میں سرگوشیاں کرتا ہے۔

۱۔ فاتحہ ۵۔ ''اِیاکَ نعبدُ و اِیاکَ نستعین''۔ جسکا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں''۔ حالانکہ یہ ترجمہ ہی اصلاً غلط ہے۔ ''ایاکَ'' آیت کے دونوں ٹکڑوں میں مشترک ہے۔ جب پہلے ٹکڑے میں اسکا ترجمہ ''تیری ہی'' کیا جا رہا ہے تو دوسرے ٹکڑے میں اسکا ترجمہ ''تجھ سے ہی'' کیونکر ہو جائے گا۔ لہٰذا اسکا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں''۔ صرف صحیح ترجمے سے ہی کتنی مشکل حل ہوگئی!۔

ہم حقیقتاً اللہ ہی کی مدد کے طالب ہیں لیکن اگر اللہ کی مدد آتی ہی علیؑ کی شکل میں ہو تو پھر ناگوار کیوں گزرے اور ناک بھوں چڑھانے کا یہاں کیا جواز ہے؟۔

۲۔ بقرہ ۱۰۷۔ ''اور اللہ کے سوا نہ تو کوئی تمھارا ولی ہے اور نہ کوئی مددگار (نصیر)''۔

۳۔ توبہ ۱۱۶۔ ''اور اللہ کے سوا تمھارا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار (نصیر)''۔

۴۔نساء ۱۲۳۔''جوشخص بھی برائی کرے گا اسکا بدلہ پائے گا اور وہ خدا کے سوا کسی کو نہ اپنا ولی پائے گا اور نہ مددگار (نصیر)''۔

دوسری قسم ان آیات پر مشتمل ہے جن میں من جانب اللہ کسی مددگار کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔بقرہ ۱۲۰۔''اے رسولؐ! اگر آپؐ نے ''من العلم'' آجانے کے بعد انکی (یہود و نصاریٰ کی) خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کیطرف سے نہ تمھارا کوئی ولی ہوگا نہ مدد گار (نصیر)''۔

۲۔انفال ۱۰۔''اور نہیں ہے کوئی مدد مگر اللہ ہی کیطرف سے''۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ہے جو اللہ نہیں ہے مگر غیر اللہ بھی نہیں ہے اور اسی کی مدد اللہ کی مدد کہلاتی ہے اور ''اللہ کے سوا نہ تو تمھارا کوئی ولی ہے نہ نصیر'' کا مصداق وہی ہے۔

آیات کی تیسری قسم وہ ہے جن میں کسی سے مدد مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بقرہ ۴۵۔''مدد مانگو صبر سے اور صلوٰۃ سے''۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ نہ تو ''صبر'' خدا ہے اور نہ ''صلوٰۃ''۔اسکے باوجود ان دونوں سے مدد مانگنے کا حکم دیا جارہا ہے لہذا جس شخص کا بھی یقین اس بات پر ہے کہ کلام اللہ ہونے کے ناتے قرآن میں تضاد ہونا محال ہے وہ اس بات پر بھی یقین رکھے گا کہ یہ دونوں چیزیں یعنی صبر اور صلوٰۃ غیر اللہ نہیں بلکہ من اللہ اور الی اللہ ہیں اور ان سے مدد

مانگنا حقیقتاً اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔

چوتھی قسم ان آیات کی ہے جن میں ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مائدہ ۲۔ ''اور تم نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو''۔

اس آیت کی رو سے مومنین اگر چہ اللہ نہیں ہیں لیکن چونکہ بامر اللہ ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں اس لئے غیر اللہ سے خارج ہیں۔

پانچویں قسم ان آیات کی ہے جن میں خود اللہ کسی مدد کرنے والے کا ذکر فخریہ انداز میں کر رہا ہے۔

حدید ۲۵۔ ''اور ہم نے لوہا اتارا کہ اس میں سخت خوف ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی۔ تا کہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون اسکی (یعنی اللہ کی) اور اسکے رسولوں کی مدد کرتا ہے پوشیدہ طور پر''۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ اللہ ایک ایسے وجود کا تعارف کرانا چاہتا ہے جو اللہ نہیں ہے لیکن اسکے باوجود اللہ اور اسکے تمام رسولوں کا مددگار ہے جیسا کہ حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا۔ ''یا علیؑ! تم نے تمام انبیاءؑ کی نصرت کی پوشیدہ رہ کر اور میری نصرت کی ظاہر بظاہر ہو کر''۔ اللہ حکیم مطلق ہے اور حکیم کا کوئی فعل عبث نہیں ہوا کرتا لہٰذا غور کرنا چاہئے کہ اس ''مددگار'' کا تعارف کرانے سے اللہ کا مقصد کیا ہے؟۔ سوائے اسکے کہ جب معصوم انبیاءؑ اسکی مدد کے بغیر کارِ رسالت انجام نہیں دے سکتے تو ہم جیسے گناہگار اور

کمزور انسان اسکی مدد کے بغیر امورِ دنیا و آخرت کیونکر بجالا سکتے ہیں اور یہ کہ ہمارے پاس کوئی چارۂ کار ہے ہی نہیں کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے اس سے مدد طلب کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کہنے کا حکم ہے کیونکہ یہ میرے مولاؑ کا نام ہے۔ اسکی تفسیر انشاءاللہ آئندہ اوراق میں آئے گی۔

چھٹی قسم ان آیات کی ہے جن میں اللہ خود بندوں سے مدد مانگ رہا ہے۔

صف ۱۴۔ ''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے تم اللہ کے مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰؑ ابن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون الی اللہ میرے مددگار ہیں۔ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار''۔

یہ ایک ایسی آیت ہے کہ اگر اسکی صحیح تفہیم ہوگئی تو سارا مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے گا۔ اس میں تین باتیں قابلِ غور و تدبر ہیں:۔

ا۔ اللہ حکم دے رہا ہے کہ میری مدد کرو اور مثال عیسیٰؑ کی دے رہا ہے۔ (''جیسا کہ عیسیٰؑ نے حواریوں سے کہا'')۔

۲۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں سے یہ نہیں کہہ رہے کہ اللہ کی مدد کرو بلکہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میری مدد کرو۔ اس صورت میں یہ مثال کیونکر صحیح ہو سکتی ہے؟۔

۳۔ عیسیٰؑ کے حواری انکے فرمان سے وہی مطلب اخذ کر رہے ہیں جو اللہ کا ہے۔ عیسیٰؑ کے طلبِ استمداد پر وہ یہ نہیں کہتے کہ ہم آپؑ کی مدد کریں گے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ''ہم

اللہ کے مددگار ہیں''۔

ان امور سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے اپنے اور اپنے نبی کے درمیان تفریق روا نہیں رکھی اور اپنی مدد سے مراد عیسیٰ کی مدد کو لیا۔ اس طرح حضرت عیسیٰ غیر اللہ نہ رہے بلکہ الی اللہ میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح انکے حواری بھی مدد کرنے کے عمل میں غیر اللہ نہ ہوئے بلکہ بامر اللہ قرار پائے۔

آیات کی ساتویں قسم وہ ہے جن میں اللہ خود حضرت خاتم النبیین ؐ کو حکم دیتا ہے کہ مجھ سے مدد نہ مانگو بلکہ مددگار مانگو کیونکہ مدد میں خود نہیں کرتا بلکہ وہ مددگار کرتا ہے اور اسی کی مدد میری مدد کہلاتی ہے۔

بنی اسرائیل ۸۰۔ ''اور اے رسولؐ! کہو کہ اے میرے پروردگار مجھے داخل کر سچا داخل کرنا اور مجھے نکال سچا نکالنا اور میرے لئے اپنے انتہائے قرب سے ایک ایسا مددگار قرار دے جو غالبِ علی کل غالب ہو''۔

شرک اور غیر اللہ کے متوالوں کو سوچنا چاہئے کہ جب اللہ اپنے محبوب کی مدد بھی براہ راست نہیں کرتا اور انھیں سلطاناً نصیرا کا محتاج رکھنا چاہتا ہے تو پھر ان غیر الٰہی جیالوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ اللہ اپنے تمام اصول توڑ کر انکی مدد کے لئے بنفسِ نفیس زمین پر اتر آئے گا؟۔ یہیں سے سمجھئے کہ جہاں بھی اللہ نے ''نصیر'' ہونے کا ادّعا کیا ہے تو اس ''نصیر'' سے مراد یہی سلطاناً نصیرا۔ یہی اولی الامر۔ اللہ

کا یہی ولی مطلق ۔اسکے امر کا مالک ۔اسکے قدرتِ کاملہ کا وجودِ مجسم ۔میرے مولا حضرت امیرؑ المومنین کو ہی لیا ہے ۔ جب انکا علم اللہ کا علم ۔انکی مشیت اللہ کی مشیت ۔انکا ارادہ اللہ کا ارادہ اور انکا امر اللہ کا امر ہے تو پھر انکا شمار غیر اللہ میں کیونکر ہوسکتا ہے اور ان سے طلبِ امداد کو کس بناء پر غیر اللہ کی امداد کہا جاسکتا ہے؟۔

اگر یہ مطالب آپکے اذہان تک پہنچ گئے ہیں تو اب ملاحظہ فرمایئے کہ ایک نام نہاد شیعہ فاضل ۔مجتہد اور بزعمِ خود عالم ''یا علیؑ مدد'' کی رد میں کیا گوہر افشانی فرماتے ہیں:۔

''منہ سے ایاک نستعین کا اظہار اور دل سے غیر اللہ کی مدد و نصرت کا اقرار خدا سے غداری ہے''۔

انکی اوقات دیکھئے اور پھر انکی یہ جراءت ملاحظہ فرمایئے! ۔کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انکے استعمال کردہ الفاظ ''خدا سے غداری'' کی زد کہاں کہاں تک پہنچتی ہے؟۔اسکی زد خود رسولؐ اللہ پر پڑتی ہے جنکی ساری زندگی یا علیؑ مدد کہتے گزری ۔اسکی زد تمام انبیاءؑ پر پڑتی ہے کہ علیؑ سے طلبِ استعانت جنکی زندگی کا منشور تھا ۔اسکی زد حسینِؑ مظلوم پر پڑتی ہے کیونکہ آپ کے الفاظ آج بھی فضائے کون و مکاں میں گونج رہے ہیں ۔''ہل من ناصر ینصرنا''۔

اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اب تک تو ہم جوازِ استعانت پر گفتگو کررہے تھے لیکن اب ہم یہ ثابت کریں

گے کہ اس ''سلطاناً نصیرا'' سے مدد مانگنا واجب و لازم اور نہ مانگنا شرک وحماقت ہے۔

۱۔ شیطان نے اللہ کو سجدہ کرنے سے انکار نہیں کیا تھا بلکہ اللہ نے جسکا سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا اسکو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اس لئے تا ابد ملعون ٹھہرا۔ اسی طرح جو شخص اللہ سے مدد مانگنے پر تیار ہو مگر جس سے مدد مانگنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس سے مدد مانگنے سے انکاری ہو تو اسکا حشر بھی شیطان کے ساتھ ہوگا کیونکہ جرم دونوں کا ایک ہی نوعیت کا ہے۔

۲۔ سورۃ انا انزلناہ میں ''کُلِ امر'' سے ثابت ہے کہ کسی امر کا استثنا نہیں کیا گیا۔ خدا کے تمام امور صاحبِ امر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو ہر امر کو ان سے طلب کرنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب و لازم ہے کیونکہ خدا نے تمام امور کی تقسیم و اجراء کو انکے اختیار میں دے کر انکو اولی الامر بنایا ہے۔ اگر کوئی شخص آٹا لینے کے لئے دکان پر جانے کے بجائے سیدھا کسان کے پاس پہنچ جائے تو ایسے شخص کو دنیا احمق اور پاگل ہی کہے گی۔

۳۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''ہمارا نور ہمارے رب کے نور سے اسطرح صادر ہوتا ہے جس طرح آفتاب سے اسکی شعاعیں جدا ہوتی ہیں''۔ (غایت المرام فی ضرورت الامام)۔

دنیا کی ہر شئے آفتاب سے فیض حاصل کرتی ہے بلکہ بقائے حیات ہی وجودِ آفتاب پر

منحصر ہے۔لیکن چونکہ اشیاءِ عالم میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ آفتاب سے براہ راست فیض حاصل کرسکیں اس لئے ہر شے مجبور ہے کہ شعاع کی طرف رجوع کرے کیونکہ وہی واحد وسیلہ ہے۔اس لئے اشیائے عالم کوفیض آفتاب حاصل کرنے کے لئے آفتاب کے پاس جانے ہرگز ضرورت نہیں بلکہ شعاعِ آفتاب سے تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔جس شے نے بھی شعاع سے تعلق پیدا کرلیا تو فوراً فیضِ آفتاب جاری ہوگیا۔آفتاب کی شعاعوں کانقص یاعجز ثابت کرنا یاتسلیم کرنا خودآفتاب کانقص اورعجز ثابت کرنا ہوگا۔کیونکہ آفتاب کی شعاعیں اپنا ذاتی اثر ظاہرنہیں کرتیں بلکہ جوکچھ آفتاب میں ہے اسی کوظاہر کرتی ہیں۔اسی وجہ سے انکو آفتاب کہا بھی جاسکتا ہے اور مانا بھی جاسکتا ہے اور شعاعوں کو آفتاب کہنے سے آفتاب کا انکار لازم نہیں آتا۔لہٰذا انسان شعاعِ آفتاب سے ہٹ کر یا علیحدہ ہوکر ہزار قسم کی دعائیں اور التجائیں کرلے کہ ''اے آفتاب اپنی شعاع اور کرنوں کے واسطے اور وسیلے سے مجھے سردی سے بچا یا کہ میرا کپڑا خشک کردے''۔لیکن ان دعاؤں سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ہاں جیسے ہی اسکی شعاع میں جاکر بیٹھ گیا تو فوراً فیض جاری ہوجائے گا اور بغیر طلب و دعا کے جاری ہوجائے گا۔جب مخلوق در مخلوق کا یہ حال ہے کہ ہم بغیر کسی وسیلے کے اسکا فیض حاصل نہیں کرسکتے تو خالق کے معاملے میں ایسا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی براہ راست خالق کی بارگاہ میں جاکر کھڑا ہوجائے۔ہمیں بہرحال

اپنی حاجات کے لئے وسیلے کیطرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ذاتِ الٰہیہ سے فیض حاصل کرنے کا ذریعہ و وسیلہ صرف یہی ذواتِ مقدسہ ہیں ۔انکے بغیر کسی کو بھی اللہ کے فیوض حاصل نہیں ہو سکتے۔آخر اللہ نے انکو یہ درجات و اختیارات عطا کس لئے فرمائے تھے؟۔ان درجات و اختیارات کو بروئے عمل لانے اور انکا اظہار کرنے کے لئے یا محض ان درجات کا ٹوکرا سر پر اٹھائے رکھنے کو؟۔جب یہ اولی بالتصرف ہیں اور ہم پر حاکم ہیں تو ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے مالک و حاکم سے ہی ہر شے طلب کرے کیونکہ انکو مالک و حاکم خود اللہ نے ہی بنایا ہے۔اس لئے ان سے مانگنا اللہ سے مانگنا ہے اور ان سے نہ مانگنا اللہ سے تکبر کرنا ہے۔(ائمۂ معصومین کی دعاؤں میں اللہ سے مانگنے کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ نافہم اور کم ظرف لوگ وہی کچھ نہ کرنے لگیں جو پچھلی امتوں نے کیا تھا یعنی کہیں ایسے لوگ خود ان ذواتِ مقدسہ ہی کی پرستش شروع نہ کردیں۔لیکن مومن ان تمام اشتباہات سے منزہ و مبرا ہے اور وہ اللہ اور غیر اللہ میں واضح طور پر فرق کرسکتا ہے۔وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ سے مانگنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ وسیلے کیطرف رجوع کیا جائے جس سے مانگنا ہی اللہ سے مانگنا کہلاتا ہے)۔

''اِیاکَ نعبدُو اِیاکَ نستعین'' کا غلط مفہوم ہی وہ ٹہنی ہے جس پر غیر الٰہی فرقے کا بسیرا ہے اور اسی ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر وہ اقصائے عالم میں اپنے پیرو مرشد کے اوّلین نظریے کا پرچار کرتے ہیں۔ہم نے اس ٹہنی ہی کو کاٹ دیا اور آیت

کے دونوں ٹکڑوں کا اصل مفہوم خود قرآن سے ثابت کردیا۔ یہ مفہوم ہر مومن کو معلوم ہونا چاہئے اور یاد رکھنا چاہئے تاکہ مکرِ ابلیسی سے خود بھی محفوظ رہ سکے اور دوسروں کو بھی بچا سکے۔ اس لئے ہم خلاصے کے طور پر اس آیت کے قرآنی مفہوم کو جلی حروف میں لکھ رہے ہیں تاکہ نگاہ سے کبھی اوجھل نہ ہوں۔

''اِیاکَ نعبدُ'' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ جسکی تعظیم کا حکم دے اسکی تعظیم کی جائے۔ اللہ جسکی اطاعت کا حکم دے اسکی اطاعت کی جائے۔ اللہ جسکے سامنے جھکائے اسکے سامنے جھک جائے اور سر نہ اٹھائے۔ اللہ جسکو سجدہ کرائے اسکو سجدہ کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر روانہ رکھے۔

''اِیاکَ نستعین'' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ جس سے مدد مانگنے کا حکم دے صرف اسی سے مدد مانگی جائے۔

یہ ایک مبادیاتی بحث تھی جسکا مقصد یہ تھا کہ غیر اللہ کے فرضی بھوت کا خوف لوگوں کے دلوں سے نکل جائے اور وہ بے خوف و خطر مظاہر اللہ کے فضائل سنیں۔ سمجھیں اور انکے مقامات کا حسبِ استطاعت ادراک کرتے ہوئے سبیلِ معرفت پر قدم بہ قدم اپنا سفر شروع کریں اور جاری رکھیں۔ ہمیں امید ہے کہ آگے چل کر جو مباحث آئیں گے ان سے مومنین کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچے گی اور انکی معرفت اور یقین و اطمینان میں مسلسل اضافہ ہوگا۔ ہمارا کام معرفت و محبتِ اہلِ بیتؑ کا پودہ

مومنین کے دلوں میں کاشت کرنا ہے۔ اسکی آبیاری اور نگہداشت کرنا اور پھر اسے ایک تناور درخت کی صورت میں پروان چڑھانا خود مومنین کی ذمہ داری ہے۔

من تو شدم تو من شدی

بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم پھر اپنی بات کا اِدّعا کرتے ہیں کہ جہاں بھی اللہ اور علیؑ میں تفریق ڈالی گئی وہیں سے سفرِ شرک شروع ہو جائے گا۔ علیؑ اللہ سے جدا نہیں ہے جیسے شعاعِ آفتاب سے جدا نہیں ہوتی۔ اسی اتحاد کو "وحدتِ صفات" کہا جاتا ہے جسکو جعلی صوفیوں نے خدا جانے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ علیؑ اللہ کی صفتِ تامہ ہے جو اسکی ذات سے نہ کبھی جدا تھی۔ نہ اب جدا ہے اور نہ کبھی جدا ہوگی۔ علیؑ ایک حقیقتِ ابدی کا نام ہے کیونکہ خدائے قدیم کسی حادث کے ذریعے ظہور نہیں کر سکتا۔ اور اللہ کی کوئی بھی صفت اس وقت تک ثابت ہی نہیں ہو سکتی جب تک وہ علیؑ سے ظاہر نہ ہو جائے۔ اللہ کے کسی فعل کا اس وقت تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ ان مقدس ہاتھوں سے سر انجام نہ پائے۔ یہ چونکہ تفصیل کا محل نہیں اس لئے ہم اپنے موضوع کی مکمل تفہیم کے لئے چند احادیثِ معصومینؑ آپکی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ تفصیل انشاءاللہ آئندہ اوراق میں آتی رہے گی۔

ا۔ التوحید صفحہ ۱۸ احدیث ۸۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"ہماری عبادت کی وجہ سے اللہ کی عبادت کی گئی۔ اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ کی

جاتی‘‘۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کوئی محسوس ومشہود شے نہیں ہے لہذا جب کوئی اسکو محسوس ہی نہ کرتا۔اسکا مشاہدہ ہی نہ کرتا اوراسکا ادراک ہی نہ کرتا تو اسکی عبادت کا تصور ہی محال تھا۔جب ان مقدس ہستیوں کو دیکھا تو ان پر خدائی کا گمان ہوا اور اللہ سمجھ میں آیا اور جب انھوں نے عبادت کی تو خلقِ خدا نے سمجھ لیا کہ یہ خدا نہیں ہیں بلکہ کسی کے بندے ہیں۔اگر یہ عبادت نہ کرتے تو آج انہی کی عبادت کی جارہی ہوتی۔پس دلیلِ خدا صرف انکی عبادت ہے اور عبادتِ خدا کا واحد ذریعہ یہی ہیں۔عبد ومعبود کے اس فرق کے علاوہ ان میں اور اللہ میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔

۲۔التوحید صفحہ ۱۳۱ حدیث ۱۔حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

’’میں اللہ کا علم ہوں اور میں اللہ کا زیادہ یاد کرنے والا قلب ہوں اور اللہ کی بولنے والی زبان۔اللہ کی آنکھ۔اللہ کا پہلو اور اللہ کا ہاتھ ہوں۔جس نے مجھ کو اور میرے حق کو پہچانا تو اس نے اپنے رب کو پہچانا‘‘۔

امیرؑ المومنین کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ ہر وہ شے جسے ہم اللہ سے منسوب کرتے ہیں وہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ علیؑ سے ظاہر ہوئی ہے۔اگر علیؑ سے ظاہر نہ ہوتی تو اللہ سے بھی منسوب نہ ہوتی اور یہی وہ مقامِ وحدت ہے کہ علم وقدرت و تصرف وکلام وبصیرت وسماعت ومشیت وارادہ۔غرض ہر شے میں عبد اور معبود میں

ایسا اتحاد ہے کہ جب تک بندہ اپنی زبان سے نہ کہدے کہ میں بندہ ہوں اس وقت تک دونوں میں کوئی فرق ہی نظر نہ آئے۔

۳۔نہج الاسرار ج ا صفحہ ۴۸۔حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

''اورہم ہی اسکا پہلو۔ہاتھ۔اسکی زبان اوراسکا امر ہیں۔اورہم ہی اسکا علم اوراسکا حق ہیں۔جب ہم چاہتے ہیں تو اللہ بھی چاہتا ہے اورہم جوارادہ کرتے ہیں تو اللہ بھی وہی ارادہ کرتا ہے۔پس ہم ہیں وہ مثانی جنھیں اللہ نے اپنے نبیؐ کوعطا کیا ہے اورہم ہی وہ وجہہ اللہ ہیں جو زمین میں تمھارے درمیان اپنی مرضی سے تصرف کرتے ہیں۔پس جس نے ہماری معرفت حاصل کی اسکے سامنے یقین ہے اورجوواقف نہ ہوا اسکے آگے سجین ہے۔ اگر ہم چاہیں تو زمین کوشق کردیں اور آسمان کوصعود کرجائیں۔ بہ تحقیق اسکی مخلوق کی بازگشت ہماری ہی طرف ہے اورپھر ہم ہی کُل کا حساب لینے والے ہیں''۔

اس فرمانِ ذیشان میں کئی باتیں غورطلب ہیں۔اوّل یہ کہ یہ مقدس ہستیاں اللہ کا علم بھی ہیں اور اللہ کا امر بھی اور آپ گذشتہ بیان سے یہ جان چکے کہ شیطان کے راندۂ درگاہ ہونے کا واحد سبب یہ تھا کہ اس نے امرِ خدا کی مخالفت کی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فعل میں متحد ہونا ہی جزاوسزا میں متحد ہونے کی دلیل ہے لہٰذا یہ کوئی قصہ نہیں بلکہ ایک اصول ہے کہ جوبھی امرِ خدا یعنی ائمۂ معصومین کی مخالفت کرے گا

اسکا اور شیطان کا انجام ایک ہی ہونا ہے کیونکہ عملِ مخالفتِ معصومؑ میں دونوں متحد ہیں۔دوسری بات یہ کہ "حقِ خدا" بھی یہی معصومینؑ ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن جن چیزوں کو ہم حقوقِ اللہ کہتے ہیں مثلاً نماز۔ روزہ۔حج وزکوٰۃ وغیرہ۔ان سب کی حقیقت بھی یہی ہیں۔لہٰذا جس نے انکے دامن کو چھوڑا وہی ان تمام عبادات کا تارک قرار پائے گا اور اسی سے آپ سمجھ لیجئے کہ تارک الصلوٰۃ کو کافر کیوں کہا گیا ہے۔تیسری بات اللہ کی مشیت اور ارادہ ہے۔لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو خوش عقیدہ ہونے کے باوجود اس اتحادِ مشیت و ارادہ کو ایک میکانکی عمل سمجھتے ہیں۔جیسے سوئچ دبانے سے بلب روشن ہوجاتا ہے تو اس میں بلب کا کوئی اختیار نہیں ہوتا بلکہ وہ وہی کچھ کرتا ہے جو سوئچ چاہتا ہے۔لیکن مولاؑ کے اس فرمان سے ثابت ہوگیا کہ یہ حضراتؑ اللہ کی مشیت اور ارادہ ہیں لیکن مشیت مجبور یا ارادہٗ مجبور نہیں بلکہ مشیت مختار و ارادہٗ مختار ہیں۔اور ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔اسی لئے آنجنابؑ نے فرمایا کہ "جب ہم چاہتے ہیں تو اللہ بھی چاہتا ہے اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں تو اللہ بھی ارادہ کرتا ہے"۔یعنی اللہ کا چاہنا انکا چاہنا اور انکا چاہنا اللہ کا چاہنا ہے۔اللہ کا ارادہ انکا ارادہ اور انکا ارادہ اللہ کا ارادہ ہے۔اور یہی وہ مقامِ اتحاد ہے جسکو ثابت کرنا مقصود ہے اگر یہ سن کر کسی کا دل دھڑکنے لگا ہو اور ماتھے پر پسینہ آنے لگا ہو تو وہ سورۂ کہف کی آیت ۶۰ تا ۸۲ کا مطالعہ کرے۔ساری حقیقت اسکے سامنے آجائے گی اور

اگر ہمارے لئے ممکن ہوا تو آئندہ صفحات میں ہم بھی ان آیات کا مختصراً جائزہ لیں گے۔

۴۔ نہج الاسرار ج ا صفحہ ۱۳۶۔ حضرت امیرٔ المومنین نے فرمایا۔

''جس نے ہماری تردید کی اس نے خدائے قدیم کی بات کو رد کیا''۔

یہ ظاہر ہے کہ خدائے قدیم نہ تو کسی کے سامنے آتا ہے اور نہ کسی سے بات کرتا ہے اور جب بات ہی نہیں کرتا تو اسکی بات کو قبول یا رد کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں بنتے۔ معلوم ہوا کہ جو بات انکی زبانِ مبارک پر جاری ہو وہ انکی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کی بات ہے اور جو نتیجہ اس حدیث سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں اور اللہ میں تفریق ڈالنے والا خداوند قدیم و قیوم کی ذات کا منکر ہے۔

۵۔ نہج الاسرار ج ا صفحہ ۱۴۱۔ جناب امیرٔ المومنین فرماتے ہیں۔

''پس جس نے خالق کی حد قرار دی اس نے کتاب اللہ ناطق سے کفر کیا''۔

یہ حدیث مبارکہ بھی وحدتِ صفات پر دلالت کرتی ہے۔ گذشتہ حدیث میں آپ نے اپنی بات کے رد کرنے کو اللہ کی بات کا رد کرنا قرار دیا تھا۔ اس حدیث میں وہی بات ترتیب معکوس کے ساتھ بیان کی گئی ہے یعنی جس نے اللہ کی حد قرار دی تو اس نے کتاب اللہ ناطق یعنی ذاتِ مرتضویٰ سے کفر کیا۔ مراد یہ ہے کہ جب مَظہر لا محدود ہے تو مُظہر کیونکر محدود ہو سکتا ہے؟۔

۶۔مفاتیح الجنان صفحہ ۸۲۰۔زیارتِ امام حسینؑ کا ایک جملہ۔

’’آپ کے ذریعے زمین درختوں کو اُگاتی ہے۔آپ ہی کے ذریعے زمین اپنے خزانے ظاہر کرتی ہے۔آپ کے ذریعے سے آسمان سے بارش اور رزق نازل ہوتا ہے۔آپ کے ذریعے سے خدا مصیبت دور کرتا ہے۔اسکی تقدیریں آپ کے دلوں میں ڈالی جاتی ہیں۔وہ آپ کے گھروں سے جاری ہوتی ہیں اور وہ فیصلے نافذ ہوتے ہیں جو خدا اپنے بندوں کے بارے میں کرتا ہے‘‘۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جن افعال کو اللہ اپنی طرف منسوب کرتا ہے وہ تمام کے تمام ان مقدس ہستیوں کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں اور اسطرح ان افعال کو دونوں طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے یعنی اللہ کیطرف بھی اور انکی طرف بھی جو اسکے افعال کے امین ہیں۔آنے والی حدیث سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

۷۔کوکب درّی صفحہ ۳۵۔حضرت امیرؑ المومنین اس حدیث میں اپنی ایک ایک صفت بیان فرما رہے ہیں اور پھر اس صفت کے معنی و مفہوم کی بھی وضاحت فرما رہے ہیں۔اس لئے ہم پوری حدیث کا ایک ایک جملہ الگ الگ کر کے آپکی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تا کہ ہر بات الگ الگ آپکے ذہنوں تک پہنچ جائے:۔

(الف)۔’’میں وجہ اللہ ہوں۔میری طرف متوجہ ہونا اللہ کیطرف رخ کرنا ہے‘‘۔

کسی بھی شے کی طرف توجہ کرنے یا اسکی طرف رخ کرنے کے لئے اس شے کا تعینِ مکانی و ذہنی کرنا اور پھر اسی تعیین کے تحت اسکا تصور کرنا ایک لازمی امر ہے اسکے بغیر اس شے کیطرف نہ تو رخ کیا جاسکتا ہے اور نہ توجہ۔ انسان کی اسی مجبوری کو دیکھتے ہوئے اسے وقتِ نماز کعبے کیطرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن آج تک اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ پتھروں اور سیمنٹ سے بنے ہوئے ایک حجرے کیطرف رخ کر لینے سے کوئی اللہ کیطرف کیونکر متوجہ ہوسکتا ہے؟۔ اگر کوئی یہ سمجھ کر کعبے کیطرف رخ کرتا ہے کہ وہ فی الواقع اللہ کا گھر ہے تو ایسا شخص تو اسلام سے ہی خارج ہوگیا کیونکہ اللہ حدودِ زمان و مکان سے باہر ہے۔ اگر وہ اس بات کا سہارا لیتا ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے تو پھر اس میں کعبے کی کیا خصوصیت ہوئی؟۔ بلکہ اللہ تو فرماتا ہے کہ "میں مومن کے دل میں رہتا ہوں"۔ تو کیوں نہ وقتِ نماز اپنے دل کیطرف رخ کرلیا جائے؟۔ کاش کبھی کوئی کعبے سے ہی یہ بات پوچھ لیتا تو خود کعبے سے آواز آتی کہ "اے بندگانِ خدا! میں تو صرف ایک صدف ہوں۔ میرا گوہر کوئی اور ہے۔ میں صرف ایک مکان ہوں۔ میرا مکین کوئی اور ہے۔ میں تو صرف ایک مجاز ہوں میری حقیقت کوئی اور ہے۔ میں تو صرف ایک ملکیت ہوں میرا مالک کوئی اور ہے۔ اسی موقعے کے لئے بندہ علی ابن ابی طالب یعنی غالبؔ مرحوم نے کہا تھا۔

ہے پَرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یعنی کعبہ قبلہ نہیں ہے بلکہ قبلہ کوئی اور ہے جسکی طرف کعبہ اشارہ کرتا ہے۔ متوجہ اسکی طرف ہونا ہے نہ کہ کعبے کی طرف۔ اسی حقیقت کو میرے مولاؑ نے بیان فرمایا ہے کہ کسی کی طرف توجہ اسکے چہرے کے ذریعے کی جاتی ہے اور جان لو کہ میں ہوں اللہ کا چہرہ اور صرف میرا دیدار کر کے ہی یہ جانا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ لباسِ بشریت میں آجائے تو وہ کیسا ہوگا؟۔

(ب)۔ ''میں ہی جنب اللہ ہوں۔ مجھ تک پہنچنا اللہ کے پہلو میں بٹھاتا ہے اور منتہائے قرب پر پہنچاتا ہے''۔

مولاؑ کے اس فرمان سے ایک انتہائی اہم مسئلہ حل ہو گیا کیونکہ بڑی سے بڑی عبادت سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی عبادت تک یہاں تک کہ انسان کے ایک ایک عمل کے پسِ پردہ ایک نیت ہوتی ہے جسکے بغیر ہر عمل اور ہر عبادت ایک فعلِ عبث ہوتی ہے اور وہ نیت ہے ''قربۃً الی اللہ''۔ اور اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے قرب کے معنی کیا ہیں۔ انسان کو کرنا فقط اتنا ہے کہ علیؑ تک پہنچ جائے۔ علیؑ تک پہنچا تو گویا اللہ کے پہلو میں بیٹھ گیا حالانکہ بیٹھا علیؑ کے پہلو میں ہے۔ اور یہی وحدتِ صفات ہے۔ منتہائے قرب کی وضاحت کے لئے ہم عرض کرتے ہیں کہ جب آپ حیدرآباد سے کراچی

آتے ہیں تو سڑک پر سنگِ میل لگے ہوتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ کراچی ابھی کتنے فاصلے پر ہے۔لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ کراچی کی حدود میں داخل ہوجاتے ہیں اس وقت بھی سنگِ میل بتاتا ہے کہ آپ کراچی سے بیس پچیس کلومیٹر دور ہیں۔آپ کراچی کے اندر سفر کرتے رہتے ہیں لیکن یہ سنگِ میل ختم نہیں ہوتے البتہ فاصلہ کم ہوتا رہتا ہے۔یہ فاصلہ اسوقت ختم ہوتا ہے جب آپ بولٹن مارکیٹ پر پہنچتے ہیں۔وہاں ایک سنگِ میل لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے۔''کراچی۔زیرو کلومیٹر''۔دوسرے شہروں والے اسی اصول پر اپنے اپنے شہروں کا اندازہ کرسکتے ہیں۔پس یہی انتہائے قربت ہے اور یہ اسوقت نصیب ہوتی ہے جب انسان علیؑ تک پہنچ جائے اور اسی وقت انسان کو شعور حاصل ہوتا ہے کہ اللہ کون ہے اور اسکی قربت کیا شے ہے اور یہی ''ممسوس فی ذات اللہ'' کا مطلب ہے۔اس سے پہلے آپ یہ بھی پڑھ چکے کہ آنجنابؑ نے خود کو اللہ کا دل کہا ہے۔

امیر خسروؒ نے سرمستی کے عالم میں ایک شعر کہا تھا۔

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو

محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

یعنی رات میں ایک ایسے مقام پر تھا کہ جہاں لامکاں میں صدرِ مجلس خود اللہ تھا اور محمدؐ شمعِ محفل کیطرح درخشاں تھے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ امیر خسروؒ نے کس مقام پر پہنچ کر یہ شعر کہا تھا اور یہاں اللہ سے انکی

کیامراد ہے کیونکہ ''لامکاں'' کہنے کے باوجود بھی وہ ایک مقام کا ذکر ضرور کررہے ہیں۔ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم اس مرحلے پر اس شعر کی وضاحت کرسکیں کیونکہ ابھی ہم ابتدائی مراحل طے کررہے ہیں۔ مناسب مقام پر ہم انشاء اللہ نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کرسکیں گے اور بتاسکیں گے کہ ''مقام اللہ'' سے کیامراد ہے۔

(ج)۔ ''میں یداللہ ہوں۔ جو کچھ وہ (اللہ) کرتا ہے۔ مجھ سے کرتا ہے۔ جو کچھ اس سے صادر ہوتا ہے میرے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ میں کرتا ہوں اوراسکا کہلاتا ہے''۔ اب بھی کوئی نہ سمجھے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں لیکن اب یہ بات کسی کے لئے ممکن نہ رہی کہ وہ کہہ سکے کہ ''یہ کام اللہ نے کیا ہے اور وہ کام علیؑ نے کیا ہے'' اور یہ بات روزِ روشن کیطرح واضح ہوگئی کہ اللہ کا کرنا ہمارے فہم وادراک سے باہر ہے لہٰذا جو کچھ علیؑ کرے اسی کو ہم کہتے ہیں کہ اللہ نے کیا ہے۔ اسکے باوجود یہ لفظِ ''اللہ'' نہ تو علیؑ کو خدا بناتا ہے اور نہ خدا کو علیؑ بناتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حقیقتیں جدا جدا ہونے کے باوجود دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہورہا ہے یہ اور بات ہے کہ اتحادِ لفظی اتحادِ معنوی پر دلیل نہیں ہوا کرتا۔ اس بات پر وہی معترض ہوگا جو لفظوں کی پرستش کرتا ہو اور حقیقت سے بے خبر ہو۔ یہ مقامِ وحدت ہے یہاں عبد و معبود میں تفریق کرنا محالِ ابدی بن جاتا ہے۔ جس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا وہ شرک کی لعنت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاک ہوگیا اور جو اس مقام پر بھٹک گیا وہ شیطان کا قیدی بن

گیا کیونکہ اس ملعون کا مشن ہی اللہ اور علیؑ میں تفریق ڈالنا ہے۔

(د)۔ ''میں عین اللہ ہوں۔ اس (اللہ) کی آنکھ سے عالم کو دیکھتا ہوں اور دنیا میرے لئے ایسی ہے جیسے کہ آنکھ میں تل''۔

اللہ کی آنکھ سے دیکھنے کا مطلب کیا ہے؟۔ اللہ جب اشیائے عالم کو دیکھے گا تو کیسے دیکھے گا؟۔ ان سوالات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو عقلِ سلیم ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ جب عالمِ کون و مکاں کو دیکھے گا تو اسی طرح دیکھے گا جیسے:۔

خالق اپنی مخلوق کو دیکھتا ہے۔

رب اپنے مربوب کو دیکھتا ہے۔

مالک اپنے مملوک کو دیکھتا ہے۔

قادر اپنے مقدور کو دیکھتا ہے۔

واجب ممکن کو دیکھتا ہے۔

معبود اپنے عبد کو دیکھتا ہے۔

مسجود اپنے ساجد کو دیکھتا ہے۔

غنی محتاج کو دیکھتا ہے۔

پس علیؑ اسی نظر سے پوری کائنات کو دیکھتا ہے کیونکہ وہ اللہ کی آنکھ ہے۔

(ہ)۔ ''میں قرآن ناطق اور برہانِ صادق ہوں۔ میرا وجود حق اور دلیلِ وجودِ حق ہے۔ میں نقطۂ تحت الباء ہوں جس میں کل کتاب جمع ہے''۔

یہاں ہم ''ناطق'' کے بارے میں ایک مختصر گفتگو کریں گے کیونکہ ''نطق'' کی حقیقت سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔نطق کہتے ہیں اس قوت کو جس سے کلیات تشکیل دیئے جاتے ہیں اوراسی اعتبار سے انسان کو حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ یہاں ناطق سے مراد ''بولنے والا'' نہیں ہے۔لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ جانور گونگے ہیں تو بالکل غلط سمجھتے ہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ خود جانور انسان کو گونگا سمجھتے ہوں۔ ہر جانور بولتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ ہم اسکی زبان نہیں سمجھتے اور اسی بناء پر اسے گونگا سمجھتے ہیں۔لیکن جو مقدس ہستیاں انکی زبان سمجھتی ہیں وہ انکی بات بھی سنتی ہیں اور انکو ان ہی کی زبان میں جواب بھی دیتی ہیں اور تاریخ کے اوراق اسکے شاہد ہیں۔نہ صرف حیوان بلکہ کائنات کی ہر شے زبان رکھتی ہے اور بات کرتی ہے چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں ارشاد ہوتا ہے۔''ساتوں آسمان اور جو کچھ ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اسکی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم انکی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو''۔لہٰذا ''حیوانِ ناطق'' سے مراد بولنے والا حیوان ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ حیوان ہے جو قوتِ نطق رکھتا ہو اور کلیات بناتا ہو۔مثلاً پرندے اپنے گھونسلے جسطرح آج سے دو ہزار سال قبل بناتے تھے بالکل ویسے ہی آج بھی بناتے ہیں کیونکہ ان میں ارتقائے ذہنی و فعلی مفقود ہے جبکہ انسان پہلے غاروں میں رہتا تھا لیکن ترقی کرتے کرتے آج کئی کئی سومنزلہ عمارات میں رہتا ہے۔اسی طرح پانی کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی

سطح برابر رکھتا ہے۔پانی کی یہ خاصیت جانور بھی دیکھتا ہے اور انسان بھی لیکن جانور اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ اسکے پاس نفسِ ناطقہ نہیں ہے جو کلیات بنا سکے۔لیکن انسان نے اس سے کلیہ تشکیل دیا اور اسکی مدد سے بلند و بالا مکانات میں بھی پانی پہنچادیا۔پس نطق وہ ہے جو صرف متن تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس سے کلیات تشکیل دے کر اس سے ہزاروں فائدے خود بھی حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی پہنچاتا ہے۔یہیں سے کتابِ ناطق کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔یہ جان لیجئے کہ کتابیں دو ہیں۔پہلی کتاب تو وہ ہے جسکے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔''کوئی خشک وتر ایسا نہیں جو کتابِ مبین میں نہ ہو''۔(انعام ۵۹)۔یہ قرآن ہے جو اللہ کی کتابِ قولی ہے۔اور دوسری کتاب وہ ہے جسکے بارے میں روم ۵۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔''اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ یقیناً تم اللہ تعالیٰ کی کتاب میں جی اٹھنے کے دن تک رہے ہو''۔اس سے مراد کائنات ہے جو اللہ کی کتابِ فعلی ہے۔پس جو کتاب اللہ الناطق ہوگا وہ دونوں کتابوں کے حقائق پر محیط اور اسکے کلیات وجزئیات پر متصرف علی الاطلاق ہوگا۔پس اسی کا حق ہے کہ کتابِ قولی کی تفسیر کرے اور اسے لوگوں کے لئے فائدہ مند بنائے کیونکہ وہ اسکے مضمرات اور حقائقِ کلیہ کا عالم ہے اور وہی ہے جو مشیتِ متکلم کو جانتا ہے لہذا اسی کا قول قرآن مجید کی سند بنتا ہے اور اسکی تفسیر کے بغیر قرآن، قرآن ہی نہیں رہتا بلکہ ایک جسدِ بے روح بن جاتا ہے جسطرح نفس

ناطقہ کے بغیر جسم بیکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صرف اسے ہی حق ہے کہ وہ کائنات میں جس طرح چاہے تصرف کرے کیونکہ وہ کائنات کی روح بھی ہے اور نفسِ ناطقہ بھی اور اگر وہ پلک جھپکنے کی مدت کے لئے بھی غائب ہو جائے تو پوری کائنات معدوم ہو کر رہ جائے اور یہی مذہب شیعہ اثنا عشریہ کا عقیدہ ہے۔

الولایۃ اللہ

ولایت وہ شے ہے جسکو بیان کرنے کیلئے ۔سننے کیلئے اور برداشت کرنے کیلئے پہاڑ کیطرح مضبوط دل۔امانتدار سینہ اور ایسی زبان کی ضرورت ہے جو ''لِسانَ صِدقٍ علیّا'' سے متمسک ہو اور اسی سے کسبِ انوار کرتی ہو۔یہ وہ مقام ہے جہاں کائنات کی تمام حقیقتیں مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔یہی وہ کلید ہے جس سے اسرارِ توحید کے عقدے کھلتے ہیں اور یہی وہ راز ہے جسکو جانے بغیر انسان اقرارِ توحید کرنے کے باوجود بت پرستوں کے زمرے میں شامل رہتا ہے۔یہ وہ برہانِ صادق ہے جسکے بغیر دین و مذہب و شریعت ایک خبرِ موہوم اور ایک تخیلِ مصنوع سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔اسی لئے معصومؑ نے فرمایا ہے۔''الدینُ ھوا الولایہ''۔یعنی دین فقط اور فقط ولایت ہے۔ولایت سے ہٹ کر دین کوئی شے ہے ہی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو دنیا کے متوالے۔خیالی خدا کی پرستش کے حریص اور حقیقتِ دین سے بیزار ہوتے ہیں انھیں ولایت کے نام سے وحشت ہوتی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ اگر انکے سامنے حقائقِ ولایت کھل کر بیان کردیئے جائیں تو انکے دلِ نازک پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔لہٰذا ہم بھی یہ حقائق انتہائی محتاط طریقے سے بیان کریں گے کیونکہ کسی کو ٹھیس پہنچانا بہرحال ہمارا مقصود نہیں۔لیکن اتنا ہمیں یقین ہے کہ جو صاحبانِ بصیرت ہونگے وہ ہمارے تھوڑے لکھے کو بہت جانیں گے اور اخذ

حقائق کرنا انکے لئے چنداں مشکل نہ ہوگا۔

وسیلہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ عقلِ انسانی اگر کسی ان دیکھے خدا کا ادراک کرتی ہے تو اسکا واحد ذریعہ و وسیلہ خود انسان کے مشاہدات ہوتے ہیں جنکے ذریعے وہ کائنات میں بکھری ہوئی اشیاء میں ہم آہنگی تلاش کرتا ہے اور عرفانیات کی زبان میں ''کثرت میں وحدت'' کو ڈھونڈتا ہے۔ یہ مشاہدات ہی ہیں جو خواصِ اشیاء کو جاننے کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور انسان جس شے کو بھی جانتا ہے تو اسکے خواص کے حوالے سے ہی جانتا ہے۔ اور یہ خواص کسی ایسی قوت کیطرف انسان کی رہنمائی کرتے ہیں جو حقیقتِ خواص اور روحِ موجودات ہے۔ اور پھر انسان اسی قوت کو خدا کا نام دے کر اسکی پرستش شروع کر دیتا ہے۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ انسان کی عقل کی انتہاء یہ ہے کہ وہ خالق کا ادراک کرلے لیکن خالق کا تعین کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں اور خود تاریخِ آدم ہماری بات پر دلیل بنتی ہے کیونکہ یہ بہرحال حقیقت ہے کہ تعینِ خالق کے مسئلے پر انسان کبھی بھی متفق نہیں ہو سکا اور مختلف انسانی گروہوں نے ہر دور میں خالق سے مراد مختلف اشیاء کو لیا ہے۔ خدائے واحد کو ماننے والے اگرچہ بظاہر متحد الخیال دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقتاً انکے تصوراتِ خدا میں بھی ایک وسیع خلیج موجود ہے اور یونان کے دیوتا آج بھی انکی توحید کی روحِ رواں بنے ہوئے ہیں۔ خود

مسلمانوں کے درمیان اس مسئلے پر بے پناہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔اور یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ خود ازواج واصحابِ رسولؐ اس معاملے میں مختلف الخیال تھے اور ان میں ایسے لوگ قابلِ ذکر تعداد میں موجود تھے جو رویتِ باری تعالٰی کے قائل تھے۔اسی نظریے کو ابن تیمیہ نے فروغ دیا۔ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ ''ایک مرتبہ مجھے ابن تیمیہ کے درس میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔وہ منبر پر بیٹھا ہوا یہ بیان کررہا تھا کہ ہر شبِ جمعہ اللہ تعالٰی اپنے بندوں کے حالات کی خبر لینے کے لئے آسمان سے زمین پر اترتا ہے۔سامعین میں سے کسی نے پوچھا کہ کیسے اترتا ہے؟تو ابن تیمیہ نے منبر کی نچلی سیڑھی تک اتر کر بتایا کہ ایسے اترتا ہے''۔

بہت سے مسلمان علماء نے اللہ تعالٰی کا حلیہ بشری بھی بیان کیا ہے۔فقہاء اربعہ میں سے ایک نے یہ بھی دعوٰی کیا ہے کہ اس نے سو مرتبہ اللہ سے بالمشافہ ملاقات کی تھی اور یہ بات انکے فضائل کے دوران آج بھی بیان کی جاتی ہے۔کچھ لوگ اسکے بھی قائل ہوئے کہ ویسے تو اللہ کی رویت ممکن نہیں ہے لیکن قیامت میں اسکا دیدار ضرور ہوگا اور اس مدعا کیلئے قرآن کی ایک آیت کو دلیل بناتے ہیں۔موجودہ دور کے شیعہ علماء بھی اس معاملے میں اگرچہ زبانی حد تک متفق نظر آتے ہیں لیکن رویّے کے اعتبار سے انکی توحید اور وہابیوں کی توحید میں کوئی فرق نہیں۔اگر ان تمام اختلافات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ یہ جھگڑے پیدا ہی اس لئے ہوئے کہ اس بات کو فراموش کردیا گیا کہ تعیین خدا حدودِ عقلانی سے باہر ہے اور انسان جب بھی ان امور پر

اپنی عقل کے بل بوتے پر غور کرے گا تو ہمیشہ نا کام ہو گا۔نا کام ہو کر ٹھوکر کھائے گا اور ٹھوکر کھا کر ایسی وادی میں جا پڑے گا جہاں ایک ٹھوکر کھانے والا پہلے سے ہی موجود ہے اور ہر تازہ گرنے والے کو خوش آمدید کہتا ہے۔

اس تمام نافہمی کی جڑ یہ ہے کہ معرفتِ خدا کے باب میں ایک ایسی شے کو نظر انداز کیا گیا۔اس سے غفلت برتی گئی اور اسکی تفہیم میں تقصیر کی گئی جو کلیدِ توحید ہے اور جسکے بغیر توحید کوئی شے ہے ہی نہیں۔اور وہ ہے ''وسیلہ''۔

مجھے نہیں معلوم کہ کتنے لوگ میری بات کو سمجھیں گے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اللہ کی ذات میں شرک ہوتا ہی نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔شرک ہمیشہ وسیلے میں ہوتا ہے اور اسی کو خدا کے ساتھ شرک کرنا کہتے ہیں۔جو لوگ بتوں کی پرستش کرتے ہیں وہ بھی ان بتوں کو خدا نہیں سمجھتے بلکہ وسیلہ سمجھتے ہیں اور یہی بات انکو مشرک بناتی ہے کہ اللہ کے بنائے ہوئے وسیلے کو چھوڑ کر انھوں نے خود ہی وسیلہ بنالیا۔ایسے لوگوں کے بارے میں سورۂ زمر کی تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔''اور جن لوگوں نے اسکے سوا دوسروں کو ولی بنالیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم انکی عبادت نہیں کرتے ہیں مگر اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کردیں''۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وسیلے کے لئے ولی ہونا لازمی ہے۔

ہم چونکہ توحید کے حوالے سے بات کرر ہے ہیں اس لئے یہ بات ذہن میں

رہنی چاہئے کہ وسیلہ صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ جو شے بندے کو معبود سے ملاتی ہے وہ ازروئے قرآن صراطِ مستقیم ہے۔ جیسا کہ سورۂ حجر آیت ۴۱ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے''۔ (اس آیت کا ترجمہ ہم نے قرآن سے لکھا ہے لیکن ائمۂ معصومین سے جو کچھ منقول ہے وہ یہ ہے کہ ''علیؑ ہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے'')۔ اور جیسا کہ ہم اور آپ ہر نماز میں دعا مانگتے ہیں کہ پروردگار ہمیں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ۔

''خطِ مستقیم'' کے معنی جو ریاضی دانوں نے بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ ''دو نقطوں کے درمیان کم سے کم فاصلے کو خطِ مستقیم کہتے ہیں''۔ لہٰذا عقلی اعتبار سے خطِ مستقیم ایک ہی ہوسکتا ہے اور یہی علمِ ریاضی کا اصول ہے۔ پس صراطِ مستقیم بھی ایک ہی ہے اور چونکہ صراطِ مستقیم وسیلہ ہے اس لئے وسیلہ صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ باقی تمام وسیلے اس وسیلے کے وسیلے ہیں۔ یعنی باقی تمام وسیلے خلقِ خدا کو اس وسیلے تک پہنچاتے ہیں اور یہ وسیلہ اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں جہاں اللہ نے وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا وہاں صیغۂ واحد ہی استعمال کیا اور فرمایا۔ ''وابتغوا الیہ الوسیلہ''۔ یعنی اللہ کیطرف جانے کے لئے ایک خاص وسیلہ تلاش کرو۔ اور نہیں فرمایا کہ ''وابتغوا الیہ الوسائل''۔ یعنی اللہ کیطرف جانے کے لئے بہت سے وسیلے تلاش کرو۔ اللہ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے سلسلۂ نبوت کو جاری فرمایا ہے اور

تمام علماء وحکماء اس بات پر متفق ہیں کہ نبوت ظاہر ہے اور اسکا باطن ولایت ہے۔ تفسیر صافی صفحہ ۳۵ پر آیت ''اولو العلم قائماً بالقسط ''(صاحبانِ علم جو عدل پر قائم ہیں) کی تفسیر کرتے ہوئے امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''عدلِ ظاہری سے مراد محمدؐ کی ذات ہے اور عدلِ باطنی سے علیؑ ابن ابی طالبؑ مراد ہیں''۔ لہٰذا انبیاء کا منصب وفریضہ اپنے باطن کو ظاہر کرنا یعنی ولایتِ علیؑ کی تبلیغ کرنا ہے۔ چنانچہ تفسیر فرات صفحہ ۳۵۹ پر یہ ارشادِ معصومؑ موجود ہے کہ ''جب اللہ کا بندہ (محمدؐ) عبادت کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو علیؑ کی ولایت کیطرف لوگوں کو بلاتا ہے''۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء کی عبادت یہی ہے کہ وہ خلقِ خدا کو ولایتِ علیؑ کیطرف دعوت دیں۔

ولایت وہ شے ہے جو ہر شعبۂ حیات میں جاری وساری ہے اور جسکے بغیر نظامِ حیات چل ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے ولایت کے مختلف درجات ہیں اور جب تک ایک سطح کی ولایت کو دوسری سطح کی ولایت سے ممیز کر کے نہ دیکھا جائے اور انکے درمیان خطِ امتیاز نہ کھینچا جائے اس وقت تک ولایت سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی اور اس بارے میں جتنے شکوک وشبہات اور جتنی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں انکا سبب یہی عدمِ امتیاز ہے۔ عام روش یہی ہے کہ ولایت اور مختلف خدائی عہدوں کو ایک دوسرے کا متبادل سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ ولایت ان چیزوں سے ماوراء ہے۔ یہ بات عقلی وحتمی ہے کہ اللہ ایک اعلیٰ صفت کے ہوتے ہوئے کسی ادنیٰ صفت کو اختیار نہیں کر سکتا۔ اللہ نے نہ کبھی خود کو نبی

کہا اور نہ امام کہا کیونکہ یہ دونوں عہدے ہیں جو اللہ خود اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔اسکے برخلاف اس نے خودکو ولی کہہ کر متعارف کرایا جسکا مطلب ہی یہ ہے کہ ولایت کوئی عہدہ نہیں بلکہ ایک اعلیٰ ترین مقام کا نام ہےاور علم وقدرت وتصرفِ کلیہ کی علامت ہے۔آپ اگر بنظرِ انصاف دیکھیں تو ہم اللہ کے بارے میں جتنا کچھ جانتے ہیں وہ اسکی ولایت ہی کے حوالے سے جانتے ہیں۔خلاّقیت۔رزّاقیت۔ رحمانیت۔رحیمیت۔غفاریت۔معبودیت۔یہ سب کی سب صفات ہیں جنکے ذریعے سے ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اسکی عبادت کرتے ہیں۔لیکن اللہ کی تمام صفات تحتِ ولایت ہیں کیونکہ اسکی ہر صفت کا تعلق اسکے علم وقدرت وتصرف سے ہےاور یہی ولایت ہے۔لہٰذا جب تک ولایتِ خدا ہماری سمجھ میں نہیں آتی اسوقت تک ہم توحید سے بے بہرہ رہیں گے اور ہمارا ایمان باللہ کا دعویٰ بے حقیقت رہے گا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ولایتِ خدا کو جانا جائے اور ولایت خدا اسوقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک وہ ہمارے مشاہدے میں نہ آئے اور مشاہدے میں آنے کے لئے ایک ولیِ خدا کا وجود لازمی ہے جس سے ولایتِ خدا کو ظہور ملے۔اسی ولیِ خدا کی معرفت توحید کہلاتی ہے۔

درجاتِ ولایت

اللہ نے اپنی ولایت کا تعارف کرانے کے لئے اور اسے مشاہدے میں لانے کے لئے

ہر سطح انسانی کو ولایت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور عطا فرمایا ہے تا کہ انسان درجہ بہ درجہ ولایت کا مشاہدہ کر سکے اور مختلف ولایات میں تمیز قائم کر سکے اور اسطرح اللہ کی ولایت کو پہچان کر اس پر ایمان لا سکے ۔ہم اجمالی طور پر ان مختلف ولایات کا جائزہ لیتے ہیں تا کہ ولایت کے بارے میں آئندہ آنے والے حقائق میں کوئی اشتباہ پیدا نہ ہو لیکن یہ بہر حال واضح رہنا چاہئے کہ ولایت ہمیشہ وہبی ہوتی ہے اور اسے کسب نہیں کیا جا سکتا حالانکہ تصوف و عرفان سے جو لوگ متعلق ہیں انکا دعویٰ یہ ہے کہ ارتکازِ توجہ اور کچھ اعمال و افعال بجالا کر ولایت کسب کی جا سکتی ہے ۔لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے جسے دور ہو جانا چاہئے کیونکہ یہ ولایت نہیں بلکہ کمال ہے جو مختلف جسمانی ۔ذہنی اور روحانی ریاضات سے حاصل ہو جاتا ہے اور کوئی بھی شخص بلاتفریقِ مذہب و ملت چند ریاضات و عملیات کر کے یہ کمالات حاصل کر سکتا ہے چنانچہ ایسے صاحبانِ کمال آپ کو تمام مذاہب میں مل جائیں گے ۔کوئی کتنی بھی عبادت و ریاضت کر لے لیکن پھر بھی حضرت سلمانؑ فارسی کی برابری نہیں کر سکتا۔ ہمیں بتایا جائے کہ کیا حضرت سلمانؑ نے کبھی کوئی چلّہ کاٹا تھا؟ ۔یا کبھی انھیں کسی قسم کی عملیات و ریاضات میں مشغول پایا گیا تھا؟ ۔یا کبھی وہ مراقبے میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے تھے؟ ۔

جو درجاتِ ولایت بیان کئے جا رہے ہیں انکا مطالعہ فرمانے سے قبل یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ کوئی کتابی چیز نہیں ہے بلکہ اس درجہ بندی کی بنیاد خالصتاً مشاہدے پر رکھی گئی ہے اور ان درجات کے نام بھی مشاہدے ہی کی مناسبت سے

تجویز کئے گئے ہیں۔ یہ ایک تجزیہ ہے جو تدبر کی انتہا نہیں بلکہ ابتداء ہے۔

ولایتِ فطری

ہر انسان اپنے اپنے مقام پر ولایت کا حامل ہے کیونکہ کم سے کم ولایت جو ایک انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ اسکے جسم اور اعضاء و جوارح پر اسکا تصرف ہے۔ لیکن یہ ولایت کبھی کبھی منقطع بھی ہو جاتی ہے۔ اگر انسان کا کوئی عضو بیکار ہو جائے مثلاً ہاتھ یا پاؤں مفلوج ہو جائیں یا آنکھیں ضائع ہو جائیں یا کان بہرے ہو جائیں تو پھر ان اعضاء پر انسان کا تصرف باقی نہیں رہتا۔

ولایتِ شرعی

یہ وہ ولایت ہے جو انسان از روئے شریعت حاصل کرتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹی کا ولی ہوتا ہے یا باپ کی وفات کے بعد بیٹا اسکا ولی ہوتا ہے یا اگر کوئی کسی یتیم بچے کو اپنی کفالت میں لے لے تو وہ اسکا ولی ہوتا ہے۔ یہ ولایت اگر چہ عام ہے لیکن عملاً صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو دینِ اسلام میں داخل ہوں اور شریعتِ محمدیؐ کے دائرے میں آتے ہوں۔ یہ ولایت بھی مستقل نہیں ہوتی اور بعض حالات میں منقطع ہو جاتی ہے مثلاً جب بیٹی کی شادی ہو جائے تو اس پر سے باپ کی ولایت اٹھ جاتی ہے اور اگر بیٹا عاق ہو جائے تب بھی یہی صورت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب یتیم بالغ ہو جائے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو اس کے سرپرست کی ولایت ساقط ہو جاتی ہے۔

ولایتِ ظلّی

ولایت کا تیسرا درجہ وہ ہے جو محبت سے حاصل ہوتا ہے۔جب دل میں ولی خدا کی محبت رچ بس جاتی ہے تو انوارِ ولایت اسکے دل پر وارد ہونے لگتے ہیں اور تجلیاتِ ولایت ایسے بندوں سے ظاہر ہونے لگتی ہیں اور یہ ولی خدا کا تصرف وعطا ہوتی ہے نہ کہ انکی ذاتی کوشش۔اور یہی وہ مقام ہے جہاں سورۂ یونس ۶۲ میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے۔"اَلا اِنّ اولیاء اللّٰہ لا خوف" علیہم ولا ہم یحزنون " (آگاہ ہو جاؤ کہ بیشک جو اولیاءاللہ ہوتے ہیں ان پر نہ خوف ہوتا ہے اور نہ حزن)۔

اس ولایت کے ظلّی ہونے کی دلیل لفظِ خوف اور حزن ہیں کیونکہ خوف جہل کی بناء پر پیدا ہوتا ہے اور ولایتِ خدا ہر قسم کے جہل سے منزہ ومبرا ہے۔اور حزن پچھتاوے کو کہتے ہیں اور پچھتاوا ہمیشہ غلط کام پر ہوتا ہے اور ولایتِ خدا معصیت کو مانع ہے۔ان اولیاءاللہ میں حضرت سلمان فارسیؒ۔حضرت ابو ذرؒ۔حضرت میثم تمارؒ اور حضرت بہلولؒ وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ولایت بھی منقطع ہوسکتی ہے مثلاً کسی کے دل میں لالچ یا خود پسندی پیدا ہو جائے یا پھر وہ اپنی ولایت کو حصولِ دنیا کے لئے استعمال کرنے لگے تو اس سے ایسی حالت میں ولایت سلب کر لی جاتی ہے اور اس سلسلے میں بلعمِ باعور کی مثال ہمارے سامنے ہے جس کو اللہ نے اسقدر اکرام سے نوازا کہ اسے اپنا اسمِ اعظم عطا فرما دیا لیکن

جب اس نے دنیاوی لالچ میں آ کر اللہ کی حجتوں یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے غداری کی تو اللہ نے اس سے یہ اسمِ اعظم سلب کرلیا۔

ولایتِ الٰہیہ صغریٰ

ولایت کا چوتھا درجہ توسلّی وتقرّبی ہے جو ائمہ معصومینؑ کی اولادِ اخیار اور امّہاتِ المعصومینؑ کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ولایت ائمہؑ کی ولایت سے متصل ہوتی ہے اور کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ اس ولایت سے وابستہ ہونے والے ولایتِ معصومؑ سے ملحق ہوجاتے ہیں اور درمیان میں کوئی تفریق حائل نہیں رہتی۔ ان اولیاء اللہ میں جناب آمنہؑ۔ جناب خدیجۃؑ الکبریٰ۔ جناب فاطمہؑ بنتِ اسد۔ جناب شہر بانوؑ اور دیگر امّہاتِ ائمہؑ۔ جناب زینبؑ علیا۔ حضرت عباسؑ علمدار۔ حضرت علیؑ اکبر۔ حضرت علیؑ اصغر۔ حضرت قاسمؑ اور حضرت سید محمدؑ جیسی مقدس اور بلند و بالا ہستیاں شامل ہیں۔

ولایتِ الٰہیہ کبریٰ

ولایت کا پانچواں درجہ وہ ہے جو مشروط بہ نبوت و امامت و وصایت ہوتا ہے اور جو حدودِ نبوت و امامت و وصایت سے محدود ہوتا ہے یعنی جس درجے کا نبی۔ امام یا وصی ہوگا اسی درجہ کی ولایت اسے حاصل ہوگی۔ اسکی حد ولی کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے اور عالمین پر ختم ہوجاتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں اگر کہا جائے تو ایسی ولایت کی بلند ترین حد مقامِ سدرۃ المنتہیٰ ہے جہاں حدودِ عالمین اور حدودِ امکان ختم ہوتی ہیں۔

ولایتِ الٰہیہ مطلقہ

ولایت کا چھٹا اور آخری درجہ خود اللہ کی ولایت ہے جو حدود و قیود سے ماوریٰ ہے اور عالمین اسکا ایک جزو ہے۔ الوہیت اور عالمِ امکان متصل نہیں ہیں کیونکہ اگر انکا اتصال ممکن ہوتا تو وسیلہ کی ضرورت نہ رہتی جبکہ ''وابتغوا الیہ الوسیلہ'' اس بات کی دلیل ہے کہ امکان و وجوب کے درمیان ہر حال میں وسیلے کا وجود لازمی ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ الوہیت اور امکان کے درمیان لازماً کوئی نہ کوئی وسیلہ۔ برزخ اور حجاب ضرور ہے جسکے ذریعے فیوضِ باری تعالیٰ عالمین تک پہنچتے ہیں اور یہی مقامِ ولایتِ خدا ہے اور اسی وسیلے۔ برزخ اور حجاب کی معرفت اللہ کی معرفت کہلاتی ہے۔ رزق کے ایک دانے سے لیکر نبوت و امامت و ولایت تک ہر شے اسی برزخِ کبریٰ و حجابِ اکبر سے جاری ہوتی ہے۔ اور ہم پورے اعتماد اور مکمل وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ برزخِ کبریٰ اور حجابِ اکبر ہونے کا دعویٰ سوائے حضرت امیرؑ المومنین کے کسی اور نے کیا ہی نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جسطرح دعویٰ بغیر دلیل کے بیکار ہوتا ہے اسی طرح دلیل بھی بغیر دعوے کے بیکارِ محض ہوتی ہے۔ اگر کوئی وکیل بغیر کوئی دعویٰ دائر کئے جج کے سامنے کھڑے ہو کر دلائل دینا شروع کردے تو جج سب سے پہلا سوال یہی کرے گا کہ وکیل صاحب! وہ دعویٰ کہاں ہے جسکی دلیلیں آپ دے رہے ہیں؟۔ پس جب تک کسی کا دعویٰ موجود نہ ہو اسوقت تک

کوئی بھی دلیل فائدہ نہیں دے سکتی اور مقامِ برزخ کبریٰ وحجاب اکبر میں حضرت امیرٌ المومنین کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آنجنابؑ مظہر توحید ہیں اور آپؑ کی ذاتِ مقدس میں شرک ہی ذاتِ خدا میں شرک کہلاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ شرک ہمیشہ وسیلے میں ہوتا ہے۔ ذاتِ خدا میں نہیں۔

ولایتِ علیؑ مشکل کیوں ہے؟۔

یہ ایک اصول ہے کہ جب کوئی لفظ بولا جائے تو اسکے جس معنی کیطرف ذہن سب سے پہلے متوجہ ہو وہی اس لفظ کے حقیقی معنی ہوتے ہیں اور اسکے علاوہ تمام معنی اضافی۔ تاویلی۔ تشریحی۔ عرضی۔ مجازی اور توضیحی ہوتے ہیں۔ اس اصول کے تحت کوئی بھی منصف مزاج شخص اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ جب بھی لفظ ''ولایت'' یا ''ولی'' بولا جاتا ہے تو جوشے ذہن میں سب سے پہلے بلکہ فوراً آتی ہے وہ حضرت امیرٌ المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ذاتِ گرامی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ ولی اپنے خالص ترین۔ کامل ترین اور مطلق معنوں میں علیؑ کے ہی لئے مخصوص ہے اور باقی تمام ولایاتِ جزئیہ وظلّیہ کا سرچشمہ ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے ''ولایت اللہ'' کہا جاتا ہے اور اس مقام پر ولایت خدا اور ولایت علیؑ میں تفریق کرنا درحقیقت ولایت خدا کا انکار کرنا اور شرک کرنا ہے کیونکہ ولایت خدا کا ظہور اسی نقطۂ وحدت سے ہوتا ہے اور اسکا انکار نہ صرف ولایت اللہ کو بلکہ تمام عالم ہست وبود کو

کالعدم قرار دیتا ہے کیونکہ یہی نقطہ اصلِ وجود۔عین وجود۔دلیل وجود۔مبداءِ وجود۔منتہاءِ وجوداور ہر شے کووجود بخشنے والا ہے۔

ہمارے یہاں مذہب کوجن خطوط پر رائج کیا گیا ہے اور جو جو عقائد بقلم خود تصنیف کر لئے گئے ہیں انکا بنیادی سبب وہ حالات تھے جن میں شیعہ قوم زندہ رہی ہے۔ان ادوار میں اپنی زندگی اور عزت آبرو بچا لیجانا ہی گویا ایک معرکہ سر کرنا تھا اور ان حالات میں تقیہ ناگزیر تھا۔اس لئے ان لوگوں کو الزام دینا نا انصافی ہوگی۔مگر بعد میں آنے والوں پر ضرور حیرت ہوتی ہے کہ ہر چند کہ تاریخ ظلم کے اوراق انکے سامنے تھے مگر اسکے باوجود انھوں نے سعی وجستجو کرنا اپنے اوپر حرام کرلیا اور مکھی پر مکھی مارتے رہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ جو عبوری عقائد ایک نسل سے منتقل ہوکر دوسری نسل تک پہنچتے رہے وہ تاریخی تسلسل اور عوام کی سادہ لوحی کی وجہ سے اسقدر راسخ ہوگئے کہ اب ان سے بال برابر تجاوز کرنا بھی ممکن نہ رہا۔چنانچہ آج یہ حال ہے کہ ایٹم بم بنانا آسان ہے لیکن ولایت علیؑ بیان کرنا مشکل ہے اور ایسا کرنا اپنوں اور بیگانوں کو اپنا دشمن بنانے کے مترادف ہے۔

یہ معروضی حالات تھے جنکا تذکرہ کرنا ضروری تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ولایت علیؑ خود اپنی ذات میں مشکل ہے جسکو سمجھنا اور قبول کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر اختلاف ولایتِ علیؑ پر ہوا۔کسی اور شے پر

اسکا عشرِ عشیر بھی نہ ہوا۔مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان وجہِ نزاع ولایتِ علیؑ ۔ شیعہ سنی میں باعثِ اختلاف ولایت علیؑ اور شیعوں کے آپس کے جھگڑوں کا سبب بھی یہی ولایتِ علیؑ ۔آخرولایتِ علیؑ میں ایسی کونسی بات ہے جولوگوں کے حلق سے نہیں اترتی؟۔اس بات پراگرآپ نے غورفرمالیاتو انشاءاللہ آئندہ آنے والے مباحث پر آپکوکوئی تعجب نہیں ہوگا۔

خطبہ نورانیہ میں حضرت امیر المومنین سورہ بقرہ کی آیت ''استعانت (مدد) چاہو صبر سے اور صلوۃ سے۔ لیکن وہ ایک نہایت بزرگ اور مشکل چیز ہے مگر خاشعین کے لئے نہیں ''۔کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

''پس مراداس آیت میں صبر سے رسول خدااور مراد صلوۃ سے میری ولایت برپا کرنا ہے پس اسی لئے خدائے علیم وحکیم نے کہا کہ وہ ایک نہایت مشکل کام ہے اور نہیں کہا کہ دونوں مشکل ہیں۔اس لئے کہ میری ولایت کا متحمل ہونا سخت کام ہے نہ کہ نبوتِ پیغمبرؐ کا۔مگر خاشعین کیلئے آسان ہے کہ خاشعین سے مراد ہمارے وہ شیعہ ہیں جومستبصر ہیں''۔

اس فرمانِ ذیشان میں آنجنابؑ نے واضح کردیا کہ آپؑ کی ولایت کواللہ نے انتہائی مشکل قرار دیا ہے۔ نبیؐ کی نبوت کو ہرکوئی تسلیم کرلیتا ہے چاہے وہ مقصر ہو۔ناصبی ہو یا خارجی۔لیکن علیؑ کی ولایت کسی کے حلق سے نہیں اترتی سوائے ان شیعوں کے جو

مستبصر ہیں۔ اسکی تائید مزید تفسیرِ فرات کے صفحہ ۲۱۰ سے ہوتی ہے جہاں معصومؑ فرماتے ہیں۔ ''علیؑ صرف کافر کی زبان کو کڑوا اور منافق کی زبان کو بھاری لگتا ہے۔ مومنین کی زبان پر شیریں اور انکے دلوں پر خفیف لگتا ہے''۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ جس پر ولایتِ علیؑ گراں گزرے وہ معصومؑ کے فرمان کے مطابق یا تو کافر ہے یا پھر منافق ہے۔

تفسیر فرات صفحہ ۱۱۸ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ ''یا علیؑ! اگر تم نہ ہوتے تو خدا کے گروہ کی پہچان نہ ہوتی۔ اگر تم نہ ہوتے تو دشمنِ خدا کی شناخت نہ ہوتی۔ اگر کسی کے پاس تیری ولایت نہیں ہے تو اسکے پاس کچھ نہیں ہے۔ میرا اتباع کرنے والے سے میرا مرتبہ بہت بلند ہے۔ خدا نے تمھارے بارے میں یہ آیت نازل کی ہے۔ ''اے رسولؐ! وہ بات پہنچا دو جو تمھارے رب کیطرف سے تم پر نازل ہوئی ہے اور اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو تم نے رسالت کا کوئی کام انجام نہ دیا''۔ اگر میں وہ بات نہ پہنچاتا جسکا مجھے حکم ہوا تھا تو میرا عمل باطل ہو جاتا۔ وہ دھمکی جو میں نے بیان کی ہے وہ میرے رب نے مجھ سے بیان کی ہے''۔

گروہِ خدا اور دشمنِ خدا کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا مشکل ترین کام ہے کیونکہ ایک شخص جو اقرارِ توحید کر رہا ہے اور عبادتِ خدا میں مشغول ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دشمنِ خدا ہے۔ دوستدارِ خدا اور دشمنِ خدا میں تمیز کرنا اس اعتبار سے بھی انتہائی

مشکل کام ہے کہ دشمنِ خدا کا خارج میں کوئی وجود ہے ہی نہیں۔اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دو گروہوں میں تمیز و امتیاز صرف اور صرف ولایتِ علیؑ کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے لہذا ولایتِ علیؑ کا مشکل ہونا ایک لازمی امر ہے۔اسی لئے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس ولایتِ علیؑ نہیں ہے اسکے پاس کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ایسا شخص تا ابد حق و باطل میں فرق نہیں کرسکتا اور وہ ہمیشہ ہر پکارنے والے کے پیچھے بھاگتا پھرے گا اور حق سے محروم رہے گا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس حدیث میں حضرت ختمی مرتبتؐ نے یہ بھی جتلا دیا کہ میرا اتباع کرنے والے یعنی میرے اُمتی کا درجہ میرے مقابلے میں بہت پست ہے۔جب مجھ جیسی ہستی کو جسے اللہ اپنا محبوب کہتا ہے۔ولایتِ علیؑ کے اعلان میں ذرا سی تاخیر کی وجہ سے اسکی کیطرف سے دھمکی ملتی ہے اور نبی الانبیاء ہونے کے باوجود میری رسالت ختم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے تو میرے اُمتی جنکا درجہ مجھ سے کہیں پست ہے اگر ولایتِ علیؑ کیطرف سے ذرا سی بھی غفلت برتیں تو ان کو سوچ لینا چاہئے کہ انکا حشر کیا ہونا ہے؟۔عجب نہیں کہ ایسے لوگوں سے شرفِ انسانیت ہی چھین لیا جائے اور وہ روزِ محشر کتوں۔بندروں اور خنزیروں کی شکل میں محشور کیے جائیں!

<u>اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ولایتِ علیؑ کا جھگڑا بعد وفاتِ رسولؐ شروع</u>

ہوا۔ لیکن یہ ایک شدید غلط فہمی اور قرآن و تاریخ سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر میدانِ غدیر تک اگر آپ باریک بینی سے جائزہ لیں تو آپ کو ادراک ہو جائے گا کہ اصل نزاع ہر دور میں ولایتِ علیؑ پر ہی رہا ہے۔

سورۂ یونس ۱۵ میں ارشاد ہو رہا ہے۔ ''وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اسکے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ یا اسے بدل دو۔ (اے رسولؐ) کہہ دو کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔

تفسیر فرات صفحہ ۱۷۷ پر اس آیت کی تفسیر میں امامؑ فرماتے ہیں۔ ''دشمنانِ خدا نے اللہ کے رسولؐ سے کہا کہ علیؑ کے علاوہ کسی اور کو امام بنائیے یا اسکو تبدیل کر دیجئے۔ خدا نے انکی بات یہ کہہ کر رد کر دی کہ ''ان سے کہہ دو کہ میں اسکو نہیں بدل سکتا جو میرے نفس کا قائم مقام ہے یعنی علیؑ۔ میں تو اس کا اتباع کروں گا جسکی مجھے علیؑ کے بارے میں وحی ہوئی ہے''۔

سورۂ یونس مکی سورہ ہے اور مکے میں آنحضرتؐ کا واسطہ مشرکین سے تھا نہ کہ منافقین سے۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ مشرکینِ مکہ سے بھی اصل نزاع ولایتِ علیؑ پر ہی تھا۔

اس آیت میں ملاقاتِ رب کا بھی ذکر آیا ہے اور یہ بذاتِ خود اتنا بڑا موضوع ہے کہ

اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے لیکن ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے حدیث کے آخری حصے پر انتہائی مختصر گفتگو کرتے ہیں بلکہ صرف اشارہ کرتے ہیں جس سے نتائج اخذ کرنا خود آپکا کام ہے۔

حدیث کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ ''میں تو اسکا اتباع کروں گا جسکی مجھے علیؑ کے بارے میں وحی ہوئی ہے''۔ عربی میں دو الفاظ ہیں۔ ''اطاعت'' اور ''اتباع''۔

اطاعت قول کی کیجاتی ہے اور اتباع عمل کا کیا جاتا ہے۔ وحی قول ہوتی ہے جسکی اطاعت کی جائے گی لیکن یہاں اطاعت نہیں بلکہ لفظِ ''اتباع'' استعمال ہوا ہے جسکے لئے کسی عمل کرنے والے کی ضروت ہے۔ اس مقام پر رسولؐ اتباع کر رہے ہیں نہ کہ اطاعت۔ پس یہ غور کرنا آپکا کام ہے کہ وہ عمل کرنے والا کون ہے جسکا اتباع کیا جا رہا ہے؟۔

بہر حال گفتگو اس امر پر ہو رہی ہے کہ ولایتِ علیؑ مشکل کیوں ہے اور ہم نے مندرجہ بالا سطور میں انہی وجوہات کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن حقیقی سبب کیا ہے اس پر ہم اب بات کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے کہ اللہ حسیات و عقول و اوہام سے ماوریٰ ہے لہٰذا اسکی معرفت حاصل کرنا عملی اعتبار سے محالِ ابدی ہے جبکہ حضرت امیرؑ المومنین کا ارشاد ہے کہ ''اوّل الدین معرفتہ ''۔ یعنی دین کی ابتداء یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل کی جائے۔ اور یہ بات معقول ہے کہ اللہ ہمیں اس شے کی تکلیف نہیں دے سکتا جسکی ہم

طاقت نہ رکھتے ہوں اور خود اسی کا ارشاد ہے کہ ''اللہ کسی نفس کو اسکی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔ اس صورت میں ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ کی معرفت کیسے حاصل کی جائے کیونکہ اسکے بغیر پورا دین ہی ساقط ٹھہرے گا۔ اعمال و عبادات تو بعد کی بات ہے۔ ہم نے کشف العقائد میں عرض کیا تھا کہ انسان کے لئے کسی کو جاننا یا ماننا اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ وہ اسکا مشاہدہ نہ کرلے۔ اس لئے اللہ کی معرفت اور ایمان باللہ اسی وقت ممکن ہوگا جبکہ اسکا مشاہدہ کرلیا جائے۔ اس پر قدرے تفصیلی گفتگو انشاءاللہ آئندہ اوراق میں ہوگی۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ چونکہ مخلوق اپنے خالق کو اسکی صفات کے ذریعے جانتی ہے اور اسکی تمام صفات اسکی ولایت کے تحت ہیں اس لئے عقلی طور پر واجب ہے کہ اللہ اپنے اس ولی کو ظاہر کرے جو اپنی ذات میں اسکی تمام صفات کا جامع ہو۔ لوگ اسکا مشاہدہ کرکے اللہ کو جانیں۔ پہچانیں۔ مانیں۔ سرِ تسلیم خم کریں اور اسکی عبادت کریں۔ اسی لئے ''وما خلقتُ الانس و الجن الّا لیعبدون '' کی تفسیر میں معصومؑ نے فرمایا ہے کہ یہاں ''لیعبدون'' سے مراد ''لیعرفون'' ہے۔

فُزتُ بربِّ الکعبہ

یہ وہ جملہ ہے جو میرے مولاؑ کے لب ہائے مبارک پر اس وقت جاری ہوا جب عبدالرحمٰن ابن مُلجم ملعون نے آپؑ کے سرِ اقدس پر تلوار کی ضرب لگائی۔ اس ایک جملے

میں میرے مولاؑ نے حقائقِ کائنات ۔اپنی ولایت اور حقیقتِ توحید کو سمو دیا ہے اور جس نے اس جملے کو سمجھ لیا وہ کبھی ''غالی غالی'' کا شور نہیں مچائے گا۔اس جملے سے یہ بات بھی ظاہر ہو جائے گی کہ ولایتِ علیؑ کو اللہ نے مشکل کیوں قرار دیا ہے۔

تاریخِ آدم و عالم میں علیؑ وہ پہلی اور واحد شخصیت ہے جسکی زبانِ مبارک سے وقتِ احتضار یہ جملہ صادر ہوا ہے۔غور طلب امر یہ ہے کہ مولاؑ نے جو فرمایا ہے کہ ''ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا'' تو وہ کونسی کامیابی تھی جو اس وقت علیؑ کو ملی تھی اور کیا اس سے قبل علیؑ (معاذ اللہ) ناکام تھا؟۔اغیار جو کچھ کہتے ہیں کہا کریں لیکن مجھے دکھ ہوتا ہے شیعہ علماء کے طرزِ عمل کو دیکھ کر جو اس وجودِ علیؑ و اعلیٰ کی شان میں تقصیر کر کے خود بھی بھٹکتے ہیں اور سادہ لوح عوام کو بھی بھٹکاتے ہیں۔انکا کہنا ہے کہ تمام مراتب کے باوجود حضرت امیرؑ المومنین شہادت کی سعادت سے (معاذ اللہ) محروم تھے اس لئے حصولِ شہادت پر انھوں نے اپنی کامیابی کا اعلان کیا۔اس سے گھٹیا بات شاید ہی کسی کی زبان سے نکل سکے۔سب سے ظاہر بات تو یہ ہے کہ آپؑ سے پہلے جو لوگ شہید ہوئے مثلاً حضرت حمزہؓ ۔حضرت جعفرؑ طیار۔حضرت عمار یاسرؓ ۔حضرت اویس قرنیؓ وغیرہ تو کیا انکی نظر میں شہادت کی کوئی قدر و قیمت و وقعت نہیں تھی؟۔پھر انھوں نے یہ جملہ کیوں نہ کہا؟۔اور علیؑ کے لئے شہادت ایک ایسی انہونی سعادت تھی کہ اس عالم میں بھی جبکہ انسان کے ہوش و حواس بحال نہیں ہوتے انھوں نے اس پر فخر کیا؟۔تفو ہے ایسا کہنے اور سمجھنے والوں پر!

دوسری بات یہ کہ شہادت تو وہ شے ہے جو علیؑ کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص علیؑ کی محبت میں بستر پر پیر رگڑ کر اپنی طبعی موت مرے اسکو بھی مرتبۂ شہادت مل جاتا ہے جیسا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''مَن مَاتَ علیٰ حبِّ آلِ محمدٍ مَاتَ شہیدا ''۔ ایسی صورت میں علیؑ کے لئے شہادت کونسی خصوصی فضیلت کا باعث بن سکتی تھی؟۔

بات یہ ہے کہ اللہ نے علیؑ کے ذمے دو کام کیئے تھے اور وہ دونوں کام ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اجتماعِ ضدین کو محال سمجھا جاتا ہے لیکن علیؑ نے اسکو ممکن ثابت کر دکھایا۔ اور یہ علیؑ ہی کا کام تھا ورنہ اجتماعِ ضدین عقلی اور عملی دونوں اعتبارات سے محال ہے۔ علیؑ کا اوّلین فریضہ یہ تھا کہ وجودِ خدا اور توحیدِ خدا کو عملی طور پر ثابت کرے تا کہ لوگ موحد بنیں اور عبادتِ خدائے واحد کیطرف متوجہ ہوں۔ اور یہ کام ممکن ہی نہ تھا جب تک لوگوں کو تمام صفاتِ خدا کا مشاہدہ نہ کرا دیا جاتا اور مشاہدہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب یہ تمام صفات خود علیؑ کی ذاتِ اقدس سے ظہور کریں تا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر انکی تصدیق کریں۔ لیکن اس صورت میں کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہ ہوتا کہ علیؑ کے علاوہ بھی کوئی اور خدا ہوسکتا ہے کیونکہ انکے ذہنوں میں اللہ کا جو تصور تھا اور وہ اللہ کو جن جن صفات سے متصف کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ وہ علیؑ سے ظاہر ہوتا دیکھ رہے تھے اور اس سے علیؑ کا مقصد ہی

ناکام ہوتا نظر آرہا تھا۔لہذا اب علیؑ کو اپنی عبدیت ثابت کرنا تھی اور عبدیت اس وقت تک ثابت نہیں ہوتی جب تک اپنے عجز کا اظہار نہ کیا جائے ۔ قدرت اور عجز ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔اگر قدرت ثابت کی جائے تو عجز ثابت نہیں ہوتا اور اگر عجز ثابت کیا جائے تو قدرت ہاتھ سے جاتی ہے اور علیؑ کا مقصد ہی پورا نہیں ہوتا۔

لیکن ۱۹ رمضان کو مسجدِ کوفہ میں رونما ہونے والے اس روح فرسا واقعے کو تاریخ نے اسطرح اپنے سینے میں قیامت تک لئے محفوظ کرلیا کہ جب علیؑ کے سر پر ضربت لگی تو وہ کسی کو سجدہ کر رہا تھا اور اب اس بات کا انکار کوئی کر نہیں سکتا۔پس یہی علیؑ کی کامیابی تھی کہ اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔یہاں اہلِ علم کے لئے ایک جملہ عرض کر رہا ہوں کہ وہی اسکی قدر کریں گے ۔ قدرت کا تعلق امکان سے ہے۔محالات سے نہیں ۔پس غور کرنا چاہئے کہ یہ کون قادر علی الاطلاق ہے جو محال کو ممکن میں تبدیل کر رہا ہے؟۔

عجزِ معصومؑ

اس مقام پر ہمیں لازم ہے کہ اس عجز کو سمجھیں جو حضرات ائمۂ معصومین تحفظِ توحید کے لئے ظاہر فرمایا کرتے تھے ورنہ ناپختہ ذہنوں میں شاید یہ خلش رہ جائے کہ ائمۂ اطہار کبھی قادر ہوتے تھے اور کبھی عاجز ۔یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ چونکہ معصومینؑ مظہرِ توحید تھے اور انکا منصب ہی توحید کو ثابت کرنا تھا اس لئے عقلاً

واجب ہے کہ وہ تمام صفاتِ توحید کے جامع ہوں کیونکہ مقامِ ظہور پر اگر ذرہ برابر بھی نقص رہ گیا تو جو چیز ثابت ہوگی وہ ناقص توحید ہوگی جو ہرگز ہرگز مطلوب و مقصودِ خداوندی نہیں ہے لہٰذا اس بات پر یقین رکھنا ضروری ہے کہ یہ مقدس ہستیاں قادر علی الاطلاق تھیں۔ انکی قدرت وقتی یا عارضی نہیں تھی کہ کبھی یہ قادر ہوں اور کبھی نہ ہوں۔ بلکہ انکی قدرت دائمی و قیومیہ تھی جو انکی ذات کا جزو تھی اور جسکا ان سے چشم زدن کے لئے بھی جدا ہو جانا محالِ ابدی تھا۔ پس انکا اظہارِ عجز ایک اختیاری فعل تھا نہ کہ انکی مجبوری۔ اسکی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی چیونٹی آپ کے بدن پر چل رہی ہو تو آپ اسے جھٹک دیتے ہیں۔ مارتے نہیں۔ بعض اوقات وہ کاٹ بھی لیتی ہے جسکی وجہ سے بدن پر ورم آجاتا ہے اور سوزش محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن آپکا اسے نہ مارنا آپکا عجز نہیں کہلائے گا بلکہ رحم کہلائے گا۔ اسی طرح جب معصومؑ کسی شے کو اپنے اوپر قابو دیتے ہیں تو یہ انکا عجز نہیں ہوتا بلکہ انکی حکمت ہوتی ہے۔ اسکی بہت سی مثالیں تاریخ میں مل جائیں گی۔ فاتحِ بدر و احد و خیبر و حنین حضرت امیرؑ المومنین جو اکیلے پورے لشکر پر بھاری ہوتے تھے۔ کیا یہ بات ممکن تھی کہ محض چند آدمی انکے گلے میں رسی باندھ کر انھیں گھسیٹتے ہوئے لے جائیں؟ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ جب لوگ سیاسی دھینگا مشتی سے فارغ ہو کر واپس آئے تو رسولؐ اللہ کو دفن کیا جا چکا تھا۔ اس پر وہ مشتعل ہو گئے اور اس بات پر مُصر ہوئے کہ قبرِ رسولؐ کو اکھاڑ

کر جسدِ رسول کو باہر نکالا جائے اور ان پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے۔ اس وقت لوگوں کا ایک جمِ غفیر موجود تھا اور روایتِ عرب کے مطابق سب کے سب مسلّح تھے۔ دوسری طرف حضرت امیرؑ المومنین تنہا تھے۔ آپؑ قبر رسولؐ پر بیٹھ گئے اور اپنی تلوار سے زمین پر ایک خط کھینچا اور فرمایا۔ ''جس نے اس خط سے بال برابر بھی قدم بڑھایا وہ میری تلوار سے بچ نہیں سکے گا''۔ کیا مشکل تھا اگر پورا لشکر یکبارگی علیؑ پر ٹوٹ پڑتا۔ مگر وہ آج کل کے مولوی کیطرح نادان نہیں تھے اس لئے چپ چاپ واپس لوٹ گئے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت علیؑ میں یہ قدرت کہاں سے آ گئی اور بعد میں یہ قدرت کہاں تھی؟۔ فعلِ معصومؑ میں یہ تضاد خود بتا رہا ہے کہ عجزِ معصومؑ کا تعلق حکمت سے ہوتا ہے نہ کہ عجزِ واقعی سے۔ پس یہی عجز تھا جسکا وہ اظہار فرمایا کرتے تھے تا کہ نا سمجھوں کو دھوکا نہ ہو اور وہ لوگ جو ہزارہا برس سے بتوں کو پوج رہے تھے اور بت پرستی جن کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی کہیں اسلام لانے کے بعد پھر الٹے پاؤں نہ پھر جائیں اور بتوں کی جگہ ان معصوم ہستیوں کی پرستش نہ کرنے لگیں۔ اسی مقصد کے لئے ان مقدس نفوس نے ہزارہا تکالیف اٹھائیں۔ لاکھوں ظلم سہے۔ یہاں تک کہ قتل ہوئے اور یہی اللہ کے نزدیک انکی عظمت ہے جس سے پورا قرآن بھرا پڑا ہے۔

ہم نے جو اجتماعِ ضدین کا لفظ استعمال کیا ہے اسکا مقصد یہی ہے کہ قادر ہوتے ہوئے عاجزوں کے ہاتھوں ظلم سہنا اور قتل ہو جانا صرف انہی ہستیوں کا

کام تھا ورنہ طاقتِ بشری تو اسکا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ اجتماعِ ضدین خود اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت امیرؑ المومنین مظہرِ تامۂ ذاتِ خدا ہیں جیسا کہ حضرت امام حسینؑ اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

''اس (اللہ) کے علاوہ کسی کیلئے بھی دو متضاد صفات ایک وقت میں جمع نہیں ہوسکتیں''۔(صحیفۃ الحسینؑ صفحہ ۲۱۹)

بربّ الکعبہ

اس امر میں بھی لوگ بہت سر کھپاتے ہیں کہ وقتِ ضربت علیؑ نے خاص طور پر ربِ کعبہ کی قسم کیوں کھائی لیکن میں نے اسکی کوئی قابلِ قبول توجیہ نہ آج تک سنی نہ پڑھی۔حقیقت یہ ہے کہ علیؑ کا کعبے کے اندر ایک خاص اہتمام کے ساتھ ظہور فرمانا کائنات کی تاریخ کا ایک انوکھا اور نادر واقعہ تھا۔جو تاریخ سے شغف رکھتے ہیں وہ اچھی طرح اس بات سے واقف ہیں کہ قبلِ اسلام کعبے پر ہمیشہ مشرکین کا قبضہ رہا ہے اور بعدِ اسلام بھی منافقین ہی اکثر ادوار میں کعبے پر قابض رہے اور آج بھی دشمنانِ اسلام اس پر مسلط ہیں۔ان تمام ادوار میں یہ بات بہت آسان تھی کہ کعبے کے اندر کوئی بچہ پیدا کرادیا جاتا لیکن یہ قہرِ مشیت ہے کہ ایسا کرنے کی جراءت کسی ایک کو بھی نہ ہوئی اور نہ انشاءاللہ قیامت تک کوئی یہ جراءت کرپائے گا۔یہ واقعہ ہمیشہ سے لوگوں

کیلئے باعثِ تعجب بنا رہا ہے اور نتیجے کے اعتبار سے اسے اور بھی اہمیت حاصل ہوئی اور بت پرستوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو جانا بعید از فہم نہیں کہ چونکہ کعبہ اللہ کا گھر ہے اس لئے اس میں صرف اللہ ہی آ سکتا ہے۔ اس لئے علیؑ یقیناً اللہ ہے یا کم از کم اللہ کا بیٹا تو ضرور ہے کیونکہ بیٹا ہمیشہ اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ اب علیؑ کو کعبے میں ظاہر کرنے میں اللہ کی کونسی حکمت کارفرما تھی یہ تو وہی جانتا ہے لیکن اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ اللہ کا گھر نہیں بلکہ علیؑ کا گھر ہے اور یہ کہ اللہ کا مشاہدہ سوائے علیؑ کے اور کسی ذریعے سے ہو ہی نہیں سکتا ورنہ اللہ بجائے علیؑ کے اسے کعبے میں پیدا کرتا۔ جیسا کہ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۳۹۴ پر خود حضرت امیرؑ المومنین ارشاد فرماتے ہیں۔ "جس وقت میری ماں فاطمہؑ بنت اسد کے وضعِ حمل کا وقت قریب آیا تو وہ حرم میں تھیں۔ پس دیوارِ کعبہ شق ہوئی اور وہ کسی کہنے والے کو کہتے سنیں کہ اندر داخل ہو۔ پس وہ خانہ کعبہ میں داخل ہو گئیں اور بیت اللہ کے وسط میں میں تولد ہوا۔ پس یہ فضیلت میرے قبل اور میرے بعد سوائے میرے کسی کے لئے نہیں۔

یہی علیؑ تھا جو انبیاءؑ کے روپ میں جلوہ گر ہوتا رہا اور یہی اپنے بعد والوں کی صورتوں میں منتقل ہوتا رہا کیونکہ مقصد سب کا یہی تھا کہ اللہ کا مشاہدہ کرا دیا جائے تا کہ لوگ اس پر ایمان لائیں اور اسکی عبادت کریں۔

اس سے اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ علیؑ کا کعبے میں ظاہر ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس میں لوگوں کے لئے ایک عظیم امتحان مضمر تھا۔ اسی لئے میرے مولاؑ

نے اپنی کامیابی کا اعلان کرتے وقت کعبے کا حوالہ دیا تاکہ لوگوں کے اذہان سے یہ غلط فہمی دور ہو جائے اور وہ سمجھ لیں کہ کعبے میں ظاہر ہونے کے باوجود علیؑ ایک عبد ہے اور حالتِ عبدیت میں ہی جان دے رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ولایتِ علیؑ مشکل کیوں ہے۔ سبب یہی ہے کہ جیسے ہی ولایت کا پردہ اٹھتا ہے تو انوارِ الٰہیہ سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جاتی ہے اور گمان ہوتا ہے کہ یہی خدا ہے۔ اس وقت بظاہر دو ہی صورتیں ممکن رہ جاتی ہیں کہ یا تو اسکو خدا مان لو یا پھر آنکھوں سے دیکھ کر بھی اسکا انکار کر دو تاکہ توحید ہاتھ سے نہ جائے۔ یہ شان صرف مومن کی ہے کہ وہ اس بال سے زیادہ باریک فرق کو محسوس کر لیتا ہے جو عبد و معبود میں تمیز کراتا ہے۔

ولایت مطلقہ مخصوص ہے علیؑ سے

ہم نے درجاتِ ولایت بیان کرتے ہوئے ان تمام ولایات کا ذکر کر دیا ہے جو منجانب اللہ عطا ہوئی ہوں اور ایک ایسی ولایت کا بھی ذکر کیا ہے جو عطا نہیں ہوئی بلکہ ظاہر ہوئی ہے اور وہ ہے خود اللہ کی ولایت۔ اللہ کی ذات کا تعارف اسی ولایت سے ہوتا ہے اور چونکہ وہ ذات واحد ہے اس لئے وہاں دوئی کا گمان تک نہیں پہنچ سکتا لہٰذا جو کچھ بھی اس ذاتِ واحد سے صادر ہوگا وہ عقلی اعتبار سے واحد ہی ہوگا۔ وحدت سے کثرت کا صادر ہو جانا محالاتِ عقلیہ سے ہے۔ کثرت تو صادرِ اوّل کی مخلوق کے طور

پر وجود میں آئی ہے۔اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی ولایت مخصوص ہے علیؑ ابن ابی طالبؑ سے اور اسی لئے علیؑ کے علم۔علیؑ کی قدرت اور علیؑ کے تصرفات میں نقص تلاش کرنا حقیقتاً اللہ کو ناقص و عاجز سمجھنا ہے۔

ا۔کہف ۴۴۔''ہنالك الولایة للہ الحق''

ترجمہ:۔''اس جگہ تو ولایت خدائے برحق ہی کی ہوگی''۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔''اس سے مراد ولایتِ امیرؑ المومنین ہے''۔

۲۔حق الیقین (اردو) ج ۲ صفحہ ۵۷۔رسول اللہؐ سے لوگوں نے پوچھا کہ یا نبیؐ اللہ ولی کون ہے؟۔حضرتؐ نے فرمایا۔''<u>اس زمانے میں</u> تمھارے ولی علیؑ ہیں اور انکے بعد انکے وصی (یعنی گیارہ ائمہؑ)''۔

۳۔عمدۃ المطالب ج ا صفحہ ۴۳۳۔رسول اللہؐ نے فرمایا۔''اللہ عزوجل نے مجھے نبوت سے اور میرے اہلبیتؑ کو ولایت کے ساتھ مخصوص کیا ہے''۔

۴۔نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۳۹۔''نبوتِ مطلقہ رسول اللہؐ سے اور ولایتِ مطلقہ علیؑ سے مخصوص ہیں''۔

۵۔معانی الاخبار (اردو) صفحہ ۱۰۵ حدیث ۴۔

حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا۔''علیؑ میرا ولی ہے اور ان لوگوں کے لئے ولی ہے کہ جنکا

میں ولی ہوں اور کوئی امارت وحکومت اسکے ساتھ کسی اور کو حاصل نہیں ہے"۔

ولایت زندگی ہے

عالمین کی ہر شۓ زندہ رہنا چاہتی ہے۔ حیات ہی مقصود ومطلوبِ کائنات ہے۔ حیات ہی روحِ موجودات ہے۔ معصومؑ نے صاحبِ عقل کو زندہ اور بے عقل کو مردہ کہا ہے۔ اللہ نے مومن کو زندہ اور کافر کو مردہ کہا ہے جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۲۷ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے"۔ معصومؑ اسکی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "یعنی اللہ سلبِ کافر سے مومن کو نکالتا ہے اور سلبِ مومن سے کافر کو نکالتا ہے"۔ سوال یہ ہے کہ اللہ نے مومن کو زندہ کیوں کہا ہے؟ صرف اس لئے کہ اسکے اندر ایمان ہے۔ لہٰذا ایمان زندگی ٹھہرا۔ پس جو کلِ ایمان ہے وہی حقیقتِ حیات ہے اور جسکے پاس اسکی ولایت نہیں وہ مردہ ہے۔

۱۔ انفال ۲۴۔ "اے ایمان والو! جب اللہ اور اسکا رسولؐ تمھیں زندگی عطا کرنے کے لئے بلائیں تو انکی آواز پر لبیک کہو"۔

علیؑ فی القرآن صفحہ ۱۵۳ پر ابن مردویہ سے روایت ہے کہ "یہ آیت ولایتِ علیؑ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی جب اللہ اور اسکا رسولؐ تمھیں ولایتِ علیؑ کیطرف دعوت دیں تو لبیک کہو"۔

۲۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۱۳۲۔ جناب امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ "اللہ نے اپنے نبیؐ کو مہر

کوثر عطا فرمائی اور مجھے آبِ حیات عطا فرمایا''۔

پس جو ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے (یعنی ہمیشہ مومن رہنا چاہتا ہے) اسے لازم ہے کہ علیؑ کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم نے کشف العقائد میں صحیفۂ کاملہ سے امام زین العابدینؑ کی دعا کا ایک جملہ نقل کیا تھا جس میں آپؑ فرماتے ہیں۔'' بِسمِ اللّٰہِ خیر الاسماء ۔بسم اللہ ربّ الارضِ و السماء ''۔(پروردگار تجھے واسطہ ہے ''بسم اللہ'' کا۔وہ بسم اللہ جو زمین و آسمان کا رب ہے)۔ہم نے عرض کیا تھا کہ بسم اللہ حضرت امیرؑ المومنین کا اسمِ مبارک ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ اسکی تھوڑی سے وضاحت اور کردیں۔اسکے بعد ''بسم اللہِ ربّ الارض والسماء'' پر کچھ گفتگو کریں گے۔

ا۔بنی اسرائیل ۴۶۔''اور جب تو نے قرآن میں اپنے پروردگار کی توحید کا ذکر کیا تو وہ نفرت کے ساتھ اپنی پیٹھیں پھیر کر پلٹ گئے''۔

تفسیر صافی میں بحوالہ کافی امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ''جب آنحضرتؐ اپنے مکان میں داخل ہونے لگتے اور قریش کا بہت سا مجمع آپؐ کو گھیرے ہوئے ہوتا تھا تو آپؐ بلند آواز سے فرماتے ۔''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ۔تو قریش اسکو سن کر بھاگ جاتے''۔

ہر سمجھدار انسان اس بات کو جان سکتا ہے کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' میں ایسی کونسی بات ہے جسکو سن کر دشمن بھاگ جائے؟۔ اگر تاثیر کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس جملے میں اللہ کی صفتِ رحم کا ذکر ہے۔ صفتِ قہر کا تو نہیں کہ جس سے ڈر کر کوئی بھاگ کھڑا ہو۔ پس یہ وہی ہے جسے اللہ نے اپنے رسولؐ کے لئے سلطاناً نصیرا قرار دیا تھا اور قریش اسی سے ڈر کر بھاگا کرتے تھے۔

۲۔ آپ سب اس بات سے واقف ہیں کہ ہفتے کے ساتوں دن کسی نہ کسی معصومؑ سے منسوب ہیں۔ اتوار کا دن حضرت امیرؑ المومنین سے منسوب اور انہی کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں ہم مفاتیح الجنان صفحہ ۶۷ سے ''اتوار کے دن کی دعا'' کا ایک جملہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ جملہ آپ کو ہفتے کے کسی اور دن کی دعا میں نہیں ملے گا۔

''بسم اللہ۔ جسکے فضل و کرم ہی کا امیدوار ہوں اور اسکے عدل سے ہی ڈرتا ہوں اور اسکے قول پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی رسی پکڑے ہوئے ہوں''۔

۳۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۳۱۔ (دعائے نورِ صغیر)۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بسم اللہ جو نور ہے۔ بسم اللہ جو نور کا نور ہے۔ بسم اللہ جو نور پر نور ہے۔ بسم اللہ جو مدبر الامور ہے۔ بسم اللہ جس نے نور کو نور سے پیدا کیا''۔ (ہم نے صرف متن نقل کیا ہے اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تاکہ نازک مزاجوں کی پیشانی پر پسینہ نہ آئے لیکن یہ بہر حال انکو ذہن میں رکھنا پڑے گا کہ بسم اللہ کون ہے!)

۴۔ التوحید صفحہ ۱۹۰۔ حدیث ۱۔ امام علیؑ رضاؑ نے فرمایا۔ ''بسم اللہ کہنے والے کے قول کا

مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی علامتوں اور نشانیوں میں سے ایک علامت اور نشانی اپنے نفس پر لگاتا ہوں جو عبادت ہے''۔

۵۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۶۱۔ (دعائے مشلول)۔'' اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں تیرے اسم ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے واسطے سے۔ اے جلالت و بزرگی والے! اسی کا واسطہ۔ اسی کا واسطہ۔ اسی کا واسطہ۔ اسی کا واسطہ۔ اسی کا واسطہ۔ اسی کا واسطہ۔ اسی کا واسطہ''۔

۶۔ تفسیر سورہ حمد صفحہ ۱۳۰ پر آغا خمینی لکھتے ہیں۔ ''ظہر الوجود ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ''۔ یعنی وجود بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ظاہر ہوا۔ اور یہی ہم کہتے چلے آئے ہیں کہ علیؑ اصلِ وجود۔ عینِ وجود۔ دلیلِ وجود اور مظہرِ وجود ہے۔ وجود جسے بھی ملا ہے علیؑ ہی سے ملا ہے۔ یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں بائے بسم اللہ کو بھی علیؑ ہی سے وجود ملا ہے کیونکہ وہ نقطۂ تحت الباء ہے اور بغیر نقطے کے ''ب'' وجود میں ہی نہیں آتا جب کہ خود نقطہ اپنے وجود میں سوائے اللہ کے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ سمجھنے والوں کے لئے اتنا ہی بہت ہے۔

۷۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۴ پر خمینی صاحب فرماتے ہیں۔ ''سورۂ مبارکۂ الحمد میں موجود ''بسم اللہ'' سے جامع تر اور وسیع تر کوئی اسم نہیں''۔

ربّ الارضِ والسّماء

''رب'' ایک ایسا لفظ ہے جسے نہ تو کبھی سمجھا گیا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ جہالت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور غیر اللہ کے ہوے نے دلوں پر ایسی وحشت بٹھائی کہ لوگوں نے عقل کو ایک کونے میں رکھا۔قرآن وفرمائشاتِ معصومینؑ سے آنکھیں پھیریں اور ہر اس بندۂ مومن پر شرک وکفر کے فتوے لگانا شروع کر دیے جو انکے اندھے مفروضے کے خلاف حقیقت بیان کرتا ہو۔ہم نے چونکہ ان لوگوں کی باتوں کو نہ تو کبھی اہمیت دی ہے اور نہ کبھی ان سے خوف کھایا ہے۔ہم جن پاک ہستیوں کے غلام ہیں انہی کے ارشادات کو بیان کریں گے اور بیان کرتے رہیں گے۔اور علیؑ کو ''ربّ الارضِ والسماء'' ہمارے واجب الاطاعت امامؑ نے ہی کہا ہے۔

''رب'' کے معنی ہیں پالنے والا۔پرورش کرنے والا۔تربیت کرنے والا اور ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی ناقص کو کامل بنانے والا۔یہ لفظ اسقدر عام ہے کہ ہر شخص کے لئے بولا جاسکتا ہے اور بولا جاتا ہے۔رب کی جمع ہے ارباب۔یہ لفظ ہماری روزمرہ کی بات چیت میں بے تکلف استعمال ہوتا ہے۔آپ میں سے کون ہے جس نے ''اربابِ اقتدار۔اربابِ حکومت اور اربابِ دانش'' قسم کے الفاظ نہ سنے ہوں۔لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ یہ اور ان جیسے دوسرے الفاظ سن کر کسی نے کسی پر شرک وکفر کا فتویٰ لگایا ہو۔لیکن جیسے ہی کسی نے علیؑ اور اولادِ علیؑ کے لئے یہ لفظ

استعمال کیا۔ گویا ایک بھونچال آجاتا ہے اور غیر تو رہے ایک طرف۔ خود اپنے بھی بلبلا اٹھتے ہیں اور چاروں طرف سے فتووں کا پتھراؤ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ مذہبی وڈیروں کا مطالبہ یہ ہے کہ دین کو بس اتنا ہی جانو اور مانو جتنا وہ بتلادیں۔ اس سے آگے اگر سوچا یا کہا تو دین سے خارج ہو جانا لازمی ہے۔ حالانکہ اگر ذرا سا بھی تدبر کیا جائے تو اس مسئلے کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ ہم کہیں اور سے نہیں بلکہ خود قرآن سے ثابت کریں گے کہ اللہ نے یہ لفظ کس کس کے لئے استعمال فرمایا ہے۔

۱۔ بنی اسرائیل ۲۳۔۲۴ میں جہاں حقوقِ والدین کے احکام بیان کئے گئے ہیں وہاں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اور ان دونوں (باپ اور ماں) کے لئے رحمت سے عاجزی کا بازو جھکا دے اور کہو کہ اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے بچپن میں میری ربوبیت کی تھی''۔

یہاں والدین کو رب کہا گیا ہے بلکہ انھیں رب کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ یوسف ۲۴۔ جب زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو گناہ پر مجبور کیا تو انھوں نے فرمایا۔ ''خدا کی پناہ! وہ (عزیزِ مصر) میرا رب ہے۔ اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے''۔

یہاں اللہ کا نبی ایک کافر کو اپنا رب کہہ رہا ہے۔

۳۔ یوسف ۴۱۔ ''اے میرے قید خانے کے دو ساتھیو! رہا تم دونوں میں سے ایک پس

وہ اپنے رب کو شراب پلائے گا''۔

۴۔ یوسف ۴۲۔ ''اور اس (یوسفؑ) نے ان دونوں میں سے جس شخص کے متعلق یہ یقین تھا کہ وہ نجات پانے والا ہے کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کیجیو''۔

۵۔ یوسف ۵۰۔ ''اور بادشاہ (عزیزِ مصر) نے کہا کہ اس (یوسفؑ) کو میرے پاس لاؤ۔ پس جب اسکے پاس قاصد پہنچا تو اس نے کہا کہ اپنے رب کے پاس واپس چلا جا۔ پھر اس سے پوچھ کہ کیا حال ہے ان عورتوں کا جنھوں نے (مجھے دیکھ کر) اپنے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے''۔

ان تینوں آیتوں میں بھی زبانِ نبوت سے ایک کافر کو رب کہا گیا ہے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک کافر کو رب کہتے ہوئے لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی لیکن اگر اللہ کے اس ولی کو جسکے پاس وہی ولایت ہے جو اللہ کے پاس ہے رب کہہ دیا جائے تو انھیں فوراً شرک یاد آجاتا ہے۔ حالانکہ ہر وہ شخص جو شیعہ ہونے کا محض دعویٰ ہی نہیں کرتا بلکہ حقیقتاً شیعہ ہے اسکا اعتقاد یقیناً یہی ہونا چاہئے کہ امامؑ نہ صرف رب الارض بلکہ رب الکائنات ہوتا ہے کیونکہ وہ اللہ کا ہاتھ ہے جسکے ذریعے سے پوری کائنات کو رزق عطا کیا جاتا ہے اور جو تمام عالمِ ہست و بود کی ربوبیت کرتا ہے۔

ا۔ فجر ۲۲۔ ''اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے صف در صف آموجود ہونگے''۔

یہاں ہمارے امام زمانہؑ کو رب کہا گیا ہے اور بالاتفاق یہ آیت ظہورِ امامؑ سے متعلق ہے۔ اللہ کے لئے آنا اور جانا جیسے الفاظ کا استعمال ہرگز جائز نہیں اور نہ اللہ فرشتوں سے سلامی لیتا ہے۔

۲۔ بنی اسرائیل ۲۰۔ ''(اے رسولؐ) تیرے رب کی عطا سے ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں۔ ان کی بھی اور اُن کی بھی اور تیرے رب کی عطا روکی ہوئی نہیں ہے''۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ یہاں رب کوئی اور ہے اور جو مدد کرتا ہے وہ کوئی اور ہے۔

ایک اور مغالطہ

ہم نے یہ سوال بہت سے مولویوں سے کیا ہے کہ قرآن مجید میں کہیں تو اللہ نے اپنے لئے صیغہ واحد متکلم یعنی ''میں'' استعمال فرمایا ہے مثلاً ''اِنّی جاعلٌ فی الارضِ خلیفہ'' یا ''اِنّی انا اللہ'' وغیرہ۔ اور کہیں اپنے لئے صیغہ جمع متکلم یعنی ''ہم'' استعمال کیا ہے مثلاً گزشتہ آیت میں یا جیسے سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں ارشاد فرمایا۔ ''اِنّا نحنُ نزّلنا الذکر و اِنّا لہ لحافظون''۔ (بیشک ہم نے ہی ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں) تو یہ تضاد کیسا ہے؟۔ یہ سوال سن کر پہلے تو ہر مولوی کھنکارتا ہے اور پھر سامنے والے کو جاہل سمجھ کر یہ جواب دیتا ہے کہ ''جہاں کہیں اللہ نے اپنے لئے صیغہ جمع متکلم استعمال کیا ہے اسکا مقصد اپنی تعظیم کو ظاہر کرنا ہے

جیسے بعض لوگ اردو میں اپنے آپ کو ''ہم'' کہتے ہیں''۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر دنیا میں بیوقوفوں کی اکثریت نہ ہوتی تو مولوی کی روٹی پانی کہاں سے چلتی؟۔ اوّل تو عربی میں نہ ایسا کوئی قاعدہ موجود ہے اور نہ عرب معاشرے میں ایسا کوئی رواج ہے جسکے بموجب ''میں'' کو ''ہم'' بولا جائے اور اگر بالفرضِ محال ایسا ہے بھی تو پھر ہر مقام پر اللہ اپنے لئے ''ہم'' ہی استعمال کرتا کیونکہ تعظیم تو اسکی ہر مقام پر ہے۔ اسکا کیا مطلب ہوا کہ کہیں وہ اپنی تعظیم کرتا ہے اور کہیں نہیں کرتا؟۔

آخرکار ہم نے قرآن میں ڈھونڈنا شروع کیا تو سورۂ المعارج کی آیت ۴۰ ہمیں نظر آئی جو ہم آپکی خدمت میں ہدیہ کرتے ہیں۔ اسے پڑھئے اور ہمیں بتائیے کہ اس آیت میں ''میں'' کون ہے اور ''ہم'' کون ہے؟۔ بلکہ اس آیت میں ایک تیسرا فریق بھی ہے۔ وہ کون ہے؟۔

''میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی کہ ہم قدرت رکھنے والے ہیں''۔

اب مولوی مجھے بتائے کہ اس آیت میں:۔

۱۔ ''میں'' کون ہے جو قسم کھا رہا ہے؟۔

۲۔ ''ہم'' کون ہے جو قدرت رکھنے والا ہے؟۔

۳۔ یہ ''رب المشارق والمغارب'' کون ہے جسکی قسم کھائی گئی ہے؟۔

یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا متکلم چونکہ اللہ ہے اس لئے ''میں'' سے مراد تو اللہ ہی ہوسکتا ہے ورنہ پھر قرآن کو کسی اور کی طرف منسوب کرنا پڑے گا۔ اوراسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ''رب المشارق والمغارب'' کوئی اور ہے جو پورے کارخانۂ حیات کی ربوبیت کررہا ہے اور وہ کوئی نہیں ہوسکتا سوائے اسکے جو اللہ کا ہاتھ ہے۔ اور ''ہم'' ایک جماعت ہے جو ''علیٰ کل شیٍ قدیر'' ہے۔

ان صاحبانِ قدرت کو جاننے کے لئے خود قدرت کا جاننا ضروری ہے تاکہ اسے کوئی عمومی لفظ سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جاسکے۔ اس لئے چند احادیث پیشِ خدمت ہیں جن سے اندازہ ہوجائے گا کہ قدرت کیا ہے۔

۱۔ التوحید صفحہ ۳۶۔ حدیث ۴۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''اس نے اپنی قدرت کی مضبوطی سے تمام خلق شدہ اشیاء کو پیدا کیا''۔

۲۔ نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں آپؑ فرماتے ہیں۔ ''فطر الخلائق بقدرة''۔ اس نے خلائق کو اپنی قدرت سے پیدا کیا۔

۳۔ التوحید صفحہ ۱۱۱۔ حدیث ۶۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا۔ ''اس نے جو چاہا اپنی مشیت وقدرت سے پیدا کیا''۔

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقتاً قدرت ہی خلاقِ کون ومکاں ہے اور مخلوق کی ربوبیت کرنا خالق ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

۴۔ التوحید صفحہ ۹۸۔ حدیث ۳۔ امام علیؑ رضاؑ نے فرمایا۔ ''اللہ کا اعتماد اپنی قدرت پر ہے''۔

چونکہ اللہ کا اعتماد قدرت پر ہے اسلئے قدرت میں کسی قسم کا نقص یا عجز موجود ہونا ناممکنات میں سے ہے کیونکہ اسکی زد براہِ راست اللہ پر پڑتی ہے نیز اللہ کی قدرت سے کسی شے کا غائب یا پوشیدہ رہنا اسکے ضعف پر دلیل ہوگی اس لئے کوئی غیب اسکے لئے غیب نہ رہا کیونکہ غیب بھی مخلوق ہے اور اسکی خالق قدرت ہے اور مخلوق کا اپنے خالق سے محجوب ہو جانا ممکن نہیں ہوتا۔

۵۔ التوحید صفحہ ۷۵۔ حدیث ۳۱۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''جس نے اسکی قدرت کا انکار کیا وہ کافر ہے''۔

پس جو کوئی بھی ان ''ہم'' میں سے کسی ایک کا انکار کرے یا انکی قدرت کو ناقص سمجھے یا انکی شان میں تقصیر کرے یا خود کو یا کسی اور کو انکی برابری پر لائے وہ پہلے اپنے ایمان کی خبر لے۔

ربّ ابراہیمؑ

حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے درمیان ایک مباحثہ ہوا جسے قرآن نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۸ میں بیان فرمایا ہے۔ ''ابراہیمؑ نے کہا کہ بیشک میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ پس (اگر تو رب ہے تو) اسے مغرب کیطرف سے نکال لا''۔

صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان ''رب'' پر بحث ہو رہی تھی ۔نمرود کہتا تھا کہ میں رب ہوں اور ابراہیم کہتے تھے کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جسے میں رب مانتا ہوں ۔اب فیصلہ کیسے ہو کہ کون سچا ہے؟ ۔ابراہیم اپنے رب کی ایک نشانی بتاتے ہیں اور نمرود کو چیلنج کرتے ہیں کہ اگر وہ ایسا کر دکھائے تو ابراہیم اسے رب تسلیم کر لیں گے ۔معلوم ہوا کہ ابراہیم جو دلیل دے رہے تھے وہ اپنے رب کے حق میں دے رہے تھے ۔اور اگر کوئی ایسا کر دکھائے جسکی ابراہیم نے شرط رکھی ہے تو یقیناً وہی ابراہیم کا رب ہے ۔ابراہیم وہ بلند و پاک ہستی ہیں جنھیں اللہ نے اپنا ''صدیق نبی'' کہا ہے یعنی ابراہیم سے جھوٹ کا صادر ہونا محال ہے ۔لیکن جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے ابراہیم کی شرط کبھی پوری کی ہی نہیں بلکہ یہ شرط تو اللہ کے ایک بندے نے پوری کی ہے اور وہ بھی ایک مرتبہ نہیں بلکہ ۱۵ مرتبہ ۔

میرا سوال یہ ہے کہ اگر نمرود حضرت امیرالمومنین کے زمانے میں زندہ ہوتا تو حضرت ابراہیم کے بارے میں کیا سوچتا؟ ۔کیا وہ یہ خیال نہ کرتا کہ (معاذ اللہ) ابراہیمؑ مجھے بے وقوف بنا گئے؟ ۔لہٰذا یہ ماننا کہ حضرت ابراہیم نے یہ دلیل اللہ کے حق میں دی تھی اس مقدس ہستی پر بہتانِ عظیم لگانا ہے اور کذب کو اسکی طرف منسوب کرنا ہے ۔پس ماننا پڑے گا کہ ابراہیم نے یہ دلیل علی ہی کے حق میں دی تھی اور انھیں ہی اپنا رب کہا

تھا اور وہ علیؑ ہی کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔

ربِّ موسیٰ

سورۂ اعراف ۱۴۳۔ ''اور جب ہمارے مقررہ وقت پر موسیٰ آیا اور اسکے رب نے اس سے کلام کیا۔ موسیٰ نے کہا (ربّ اَرنی انظر الیک) اے میرے رب تو مجھے دکھلا کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ (قالَ لن ترانی) فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا۔ لیکن تو پہاڑ کیطرف نظر کر۔ پس اگر یہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو تو مجھے عنقریب دیکھ لے گا۔ پس جب اسکے رب نے پہاڑ پر اپنے نور کا چمکارا ڈالا (تجلی کی) تو اسے ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰ بیہوش ہوکر گر پڑا''۔

پہلی بات تو خود اس آیت کے پہلے ٹکڑے پر غور کرنا ہے۔ ''جب ہمارے مقررہ وقت پر موسیٰ آیا''۔ اس جملے میں متکلم کون ہے؟۔ پھر ''اسکے رب نے اس سے کلام کیا''۔ اس جملے میں ''اسکا رب'' کون ہے؟۔ کج بحثی کی بات الگ ہے لیکن جملے کا قرینہ بتا رہا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ شخصیات ہیں ورنہ یہ جملہ یوں ہونا چاہئے تھا کہ ''اور جب ہمارے مقررہ وقت پر موسیٰ آیا اور ہم نے اس سے کلام کیا''۔ یا پھر یوں ہوتا کہ ''اور جب اپنے رب کے مقررہ وقت پر موسیٰ آیا اور اسکے رب نے اس سے کلام کیا''۔ دوسری بات یہ کہ اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ موسیٰ اپنے رب سے کلام کیا کرتے تھے۔ اسی کی بات سنا کرتے تھے اور اسی کو جواب دیا کرتے تھے۔

کلام اور قول میں فرق

کلام اس معنی کو کہتے ہیں جو متکلم کے ذہن میں ہوتا ہے جو وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے اور قول ان الفاظ اور اس آواز کا نام ہے جسکے ذریعے سے کلام کو سامع تک پہنچایا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قول کے لئے الفاظ کی ضرورت ہے۔ زبان کی ضرورت ہے اور آواز کی ضرورت ہے۔ جسکا کلام ہوتا ہے اسے متکلم کہتے ہیں اور جسکا قول ہوتا ہے اسے قائل کہتے ہیں۔ مخلوق کی صورت میں عام طور پر متکلم اور قائل ایک ہی شخص ہوا کرتا ہے لیکن خالق کی صورت میں کلام تو بیشک خالق کا ہوتا ہے لیکن قول کو خالق سے ہرگز منسوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اعضاء و جوارح سے منزہ ومبرا ہے۔ اسلیئے اس نے علیؑ کو اپنی زبان قرار دیا تا کہ اسکا کلام قول کی صورت اختیار کر سکے۔ لہذا جب بھی علیؑ بولے گا تو کلام اللہ کا ہوگا اور قول علیؑ کا۔ اور اسی سے سمجھئے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی اللہ کیطرف کسی قول کو منسوب کیا گیا ہے وہ حقیقتاً علیؑ ہی کا قول ہے۔ مثلاً ''واذقال ربّك للملٰئكة انی جاعلٌ فی الارض خليفه''۔ یا ''قال انی جاعلك للناس اماما''۔ حضرت موسیٰؑ بھی باقاعدہ آواز سنتے تھے اور اسی کا جواب دیتے تھے۔ پس یہ آواز اللہ کی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ لسان اللہ کی آواز تھی۔ دو مقامات ہیں جہاں موسیٰؑ نے اپنے رب سے بات کی ہے۔ ایک تو وہ شجر جس سے آواز آیا کرتی تھی۔ اسے ''شجرۃ النداء'' کہتے ہیں اور زیارتِ امیرؑ المومنین میں یہ

جملہ موجود ہے۔ ''السلام علیک یا شجرۃ النداء''۔ دوسرے ایک آگ تھی جہاں سے حضرت موسیٰ کو آواز آیا کرتی تھی۔ اسکا ذکر سورۂ نمل کی آٹھویں آیت میں ہو رہا ہے۔ ''پس جب وہ اسکے پاس آیا آواز دی گئی کہ جو آگ میں ہے اور جو اسکے گرد ہے برکت دیا گیا ہے''۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ آگ سے باقاعدہ آواز آ رہی تھی اور اس آگ میں کوئی تھا اور اس آگ کے اردگرد بھی کچھ ہستیاں موجود تھیں۔ اس آیت میں لفظ ''بورک'' استعمال کیا گیا ہے جسکے معنی ہیں ''اسکو برکت دی گئی''۔ ثابت ہوا کہ جو برکت دیا گیا ہے وہ اور ہے اور برکت دینے والا کوئی اور ہے۔ چونکہ برکت دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اس لئے جو آگ میں تھا اور موسیٰ سے کلام کر رہا تھا وہ اللہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ لامحالہ وہ کوئی اور ہے جسکو اللہ نے برکت دی اور وہ اللہ کی برکت کا محتاج تھا۔ یہ کون ہو سکتا ہے سوائے اسکے جو یہ دعویٰ کرے کہ ''انا صاحب الطور''۔ ''انا ذلك النور الظاهر''۔ (میں ہی صاحبِ طور ہوں اور میں ہی وہ نور ہوں جو ظاہر ہوا تھا)۔ اور جو یہ کہے کہ ''انا ذلك النور الذی اقتبس موسیٰ منه الهدیٰ''۔ میں ہی وہ نور ہوں جس سے موسیٰ ہدایت حاصل کیا کرتے تھے۔ (نہج الاسرار) پس شجر ہو یا آگ۔ دونوں صورتوں میں حضرت امیرؑ المومنین ہی تھے جو موسیٰ سے کلام کیا کرتے تھے اور یہیں سے ''اسکے رب نے اس سے کلام کیا'' کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱ میں ارشاد ہوا۔ ''پس جب وہ اس آگ کے پاس آیا تو اسے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ یقیناً میں تمہارا رب ہوں''۔

یہ ایک جملۂ معترضہ تھا جو کلام اور قول کے ضمن میں عرض کیا گیا لیکن ہمیں یقین ہے کہ جو لوگ حقائق دین کی جستجو میں لگے رہتے ہیں وہ اس کتاب پر ہی اکتفا نہیں کریں گے بلکہ قرآن میں وہ مقامات تلاش کریں گے جہاں اللہ نے اپنے لئے لفظِ ''قال'' استعمال فرمایا ہے اور اسطرح مقاماتِ امیرؑ المومنین کی سیر کریں گے۔ ہم نے اپنے ان برادرانِ ایمانی کی دلجوئی کے لئے جو گہرے سمندروں میں اترنے سے خوف کھاتے ہیں انتہائی اختصار سے کام لیا ہے اور اشارات پر اکتفاء کیا ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جو ہم نے چھپالی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قول کی بات تو اپنے مقام پر صحیح ہے لیکن جہاں تک خود کلام کا تعلق ہے تو کلام بذاتِ خود تحتِ مشیت ہوا کرتا ہے اور مشیت خدا کون ہے یہ آپ سب جانتے ہیں۔

بہر حال گفتگو سورۂ اعراف کی آیت پر تھی اور عرض یہ کرنا ہے کہ موسیٰ کوئی معمولی ہستی نہیں تھے۔ وہ نبی تھے۔ رسول تھے۔ صاحبِ کتاب تھے۔ صاحب شریعت تھے۔ صاحبِ کلمہ تھے۔ امام تھے۔ کلیم اللہ تھے۔ انکے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ اللہ کو دیکھنے کی تمنا کریں گے انتہائی نادانی اور اس ذاتِ پاک کی توہین کے مترادف ہے۔ انھوں نے کہا تھا۔ ''ربِّ اَرِنی'' (اے میرے رب مجھے نظر آجا)۔ اگر یہ ''رب'' بذاتہٖ ناقابلِ رویت ہوتا تو جواب یہ آنا چاہئے تھا کہ ''میں ہرگز ہرگز نظر نہیں آسکتا''۔ لیکن جواب جو آیا وہ موسیٰ کی نسبت سے آیا۔ یعنی ''تم مجھے ہرگز ہرگز نہیں دیکھ سکتے''۔ مراد یہ ہے کہ تم میں وہ استعدادِ نظر ہی نہیں جو میرے دیدار کو برداشت

کر سکے۔ اور اسکے بعد ارشاد ہوا۔ ''فَلَمَّا تجلّیٰ ربّہ ''۔ ہم نے اسکا ترجمہ قرآن مجید سے نقل کیا ہے۔ مترجمین ڈرتے ہیں اور بریکٹ لگا کر مفہوم کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں ورنہ اسکا حقیقی ترجمہ یہ ہے کہ ''پس جب اسکے رب نے تجلی کی''۔ یعنی جب اسکے رب نے اپنا جلوہ دکھایا۔ جب اسکے رب نے اپنی شان دکھائی۔ جلوہ اور شان چہرے سے ظاہر ہوتی ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ خود رب تھا جس نے اپنے چہرے کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی اور سوئی کے ناکے سے باریک تر سوراخ سے اسکے جلوے کی چھوٹ پہاڑ پر پڑی۔ یعنی اتنا سا بھی دیدار کر لینا موسیٰ کے بس کی بات نہیں تھی اسی لئے یہ چھوٹ موسیٰ پر نہیں بلکہ پہاڑ پر ڈالی گئی جو خود بھی اسکی تاب نہ لا سکا اور ریزہ ریزہ ہوگیا اور اسطرح موسیٰ کا فدیہ بن گیا۔ پھر ذرا اسکی بلندیٔ عظمت کا تصور کیجئے جسکے لئے ارشاد ہوا۔ ''نہ تو اسکی نگاہ ٹیڑھی ہوئی اور نہ وہ حد سے نکل گیا (بے خود ہوگیا)۔ یقیناً اس نے اپنے پروردگار کی آیات میں سے آیتِ کبریٰ کو دیکھا''۔ (النجم ۱۸)۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک ہی جواب

جب ہم کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں شخص کو دیکھا تو یقیناً مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم نے اسکا چہرہ دیکھا کیونکہ ہر کسی کی پہچان اسکا چہرہ ہی ہوتا ہے اور اسکا تمام جلال و جمال چہرے سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں ہم عمدۃ المطالب جلد ا۔ صفحہ ۳۴۲ سے ایک

اقتباس پیش کرتے ہیں جو ہمارے قارئین کے لئے دعوتِ تدبر ہے:۔

''ابو زبیر سے ایک روایت ہے کہ میں رسولؐ اللہ کے دراز گوش (گدھے) کے پیچھے جاتا تھا(چل رہا تھا)۔آپؐ دراز گوش سے باتیں کررہے تھے اور دراز گوش آنحضرتؐ سے باتیں کر رہا تھا۔ آپؐ کا غابہ اور غیطہ میں جانے کا ارادہ تھا۔جب دونوں (مقامات) کے درمیان پہنچ گئے تو فرمایا۔''اے معبود! مجھے وہ شخص دکھلادے''۔یہ تین مرتبہ فرمایا۔چوتھی مرتبہ فرمایا۔''اے میرے معبود! مجھے اپنا چہرہ دکھادے''۔فوراً ہی حضرت امیرؑ المومنین کھجوروں کے درمیان سے نکلے اور آنحضرتؐ کو گلے لگالیا اور رسولؐ اللہ نے علیؑ کو گلے لگالیا اور بوسے لینے شروع کردیئے''۔

ہم نے صرف روایت نقل کردی۔اس پر غور کرنا آپ کا کام ہے کہ آخر رسولؐ اللہ کو اتنی بے قراری کیوں تھی جبکہ حضرت امیرؑ المومنین ہمہ وقت آپؐ کے ساتھ ہی رہتے تھے؟۔اور''میرے معبود مجھے اپنا چہرہ دکھادے'' کا مطلب کیا ہے؟۔اور اسکے بعد دیکھئے کہ مومنین خود اپنے لئے کیا دعا مانگتے ہیں۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۲۵۴۔''اے معبود! مجھے ان لوگوں میں قرار دے جنکو تو نے اپنے چہرے کا نظارہ کرنے کا شرف بخشا''۔

ملاقاتِ رب

ملاقاتِ رب کے بارے میں قرآن مجید میں لاتعداد آیات موجود ہیں جنکو نقل کرنا

ہمارے لئے ممکن نہیں اور نہ ہی اسکا کوئی فائدہ ہے۔اس لئے اس مقام پر ہم صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ ہمارے مطلب کے لئے یہی آیت کافی ہے۔

روم ۸۔ ''آدمیوں میں سے اکثر اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں''۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رب سے ملاقات ضرور ہونی ہے لیکن اس ملاقات کا یقین بہت ہی کم لوگوں کو ہے جبکہ اکثریت اس ملاقات کی منکر ہے۔ جو لوگ اس ملاقات کے منکر ہیں ان سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔البتہ جن لوگوں کو اسکا یقین ہے ان سے ہم ضرور بات کریں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ رب سے ملاقات کا وہ کیا مطلب لیتے ہیں؟۔ اگر مراد غلط ہے تو ہر چیز غلط ہے اور اس صورت میں انکا شمار بھی منکرین ملاقات میں ہوگا۔

سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ لفظِ ''ملاقات'' کے معنی کیا ہیں۔لغت میں اسکے معنی ہیں ''استقبال کرنا۔پانا۔دیکھنا۔آمنے سامنے آنا اور ملنا''۔ان سب سے جو خلاصہ نکلتا ہے وہ ہے ''جسم وجسمانیات کے ساتھ آمنے سامنے ہو کر دیکھتے ہوئے ملنا''۔اس معنی کی روشنی میں اگر ''ملاقاتِ رب'' کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بادی النظر میں ہی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہاں رب سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ سے اس قسم کی ملاقات کے بارے میں سوچنا بھی شرک وکفر کے زمرے میں آتا ہے۔لہذا تلاش کرنا پڑے گا کہ یہ رب کون ہے؟۔

سورۂ دہر آیت ۲۱۔ ''وسقٰھم ربّہم شراباً طہوراً ''۔ترجمہ:۔''اور انھیں انکا رب پاکیزہ شراب پلائے گا''۔

اس آیت کی تفسیر میں معصومؑ فرماتے ہیں۔''لوگوں کے سردار علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں اور وہی انھیں شرابِ طہور پلائیں گے''۔(عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۳۱۷)۔

پس معلوم ہوجانا چاہئے۔واضح ہوجانا چاہئے اور یقین آجانا چاہئے کہ جس رب سے ہمیں ملاقات کرنا ہے وہ حضرت امیرؑ المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ کے سوا کوئی نہیں جن کے ہاتھوں سے ہم شرابِ طہور پیئیں گے اور جنکے شربتِ دیدار کے ہم پیاسے ہیں۔

جو بات ہم نے اتنی آسانی سے کہہ دی اسے کہتے ہوئے مفسرین ومحدثین ہمیشہ شرمائے ہیں۔اور وہ کیوں نہ شرمائیں جبکہ انکے دل میں چور ہے۔سورۂ قیامت کی آیت ۲۲ کے سلسلے میں بھی عجیب مضحکہ خیز رویے دیکھنے میں آتے ہیں جن پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔اس آیت میں ارشاد ہورہا ہے۔''بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہونگے۔وہ اپنے رب کو دیکھنے والے ہونگے''۔اس آیت میں سنی شیعہ دونوں نے رب سے مراد اللہ تعالٰی کو لیا ہے۔لیکن غیر شیعہ حضرات تو مزے میں رہے کیوں کہ وہ تو پہلے ہی رویتِ باری تعالٰی کے قائل ہیں اس لئے آرام سے بیٹھے ہوئے اللہ تعالٰی کے دیدار کا انتظار کررہے ہیں۔انکا خیال ہے کہ ہم جو دنیا میں اسے نہیں دیکھ پاتے تو اسکا سبب مادّیت کے وہ کثیف پردے ہیں جن میں ہم بحیثیت انسان لپٹے ہوئے ہیں لیکن قیامت میں جب یہ کثافتیں نہ رہیں گی تو ہم اللہ کو روبرو دیکھ سکیں

گے۔ مگر اصل مصیبت شیعوں کے لئے ہے کیونکہ انکے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ بالذات نا قابلِ رویت ہے چاہے کثافتیں ہوں یا نہ ہوں اور اسکی دلیل سورۂ انعام کی آیت ۱۰۳ ہے جس میں اللہ فرماتا ہے۔ ''اسے (یعنی اللہ کو) آنکھیں نہیں پاسکتیں اور وہ آنکھوں کو پالیتا ہے''۔ یہاں لفظِ ''ابصار'' میں وہم و گمان و خیال بھی آجاتے ہیں۔ لہٰذا جو وہم و گمان میں بھی نہ آسکے وہ بینائی کی گرفت میں کیسے آسکتا ہے؟۔ سورۂ قیامت کی آیت میں ''رب'' سے مراد اللہ لے کر شیعہ دوہری مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ انھیں اوّل تو اپنے اس عقیدے کا دفاع کرنا پڑ رہا ہے کہ اللہ قابلِ رویت نہیں ہے اور دوسری طرف حضرت امیرؑ المومنین کو بھی راستے سے ہٹانا پڑ رہا ہے اور اسکا سبب اغیار کا وہ خوف ہے جو شیعوں کے دلوں پر بری طرح بیٹھا ہوا ہے اور جسکی بناء پر اکثر عقائدِ شیعہ کو ملیا میٹ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اب اس آیت کی بھی طرح طرح کی تاویلیں شروع ہوئیں اور ارشاداتِ معصومینؑ کو پسِ پشت ڈال کر قیاسی جوڑ توڑ کا سہارا لیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ غیروں کے نشانے سے بچا جائے۔ اس مقصد کے لئے اوّل تو اس آیت کا ترجمہ ہی غلط کیا گیا ہے اور ''رب کو دیکھنے والے'' کی جگہ ''رب کی نعمتوں کو دیکھنے والے'' کر دیا گیا حالانکہ نعمتوں کا آیت میں نہ ذکر ہے اور نہ قرینہ۔ اس سے بھی کام نہ بنا تو یہ کہا جانے لگا کہ اس آیت میں لفظِ ''رویت'' نہیں ہے بلکہ ''ناظر'' ہے جسکے معنی ہے ''نظر کرنے والا''۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھیں کہ ''کیا کر رہے ہو؟'' وہ کہے کہ ''چاند دیکھ رہا ہوں''۔ اس سے پوچھیں کہ ''چاند نظر آیا؟'' اور

وہ کہے کہ ''نہیں''۔ مطلب یہ کہ یہاں دیکھنے سے مراد رویت نہیں بلکہ ڈھونڈ نا ہے۔ یہ تاویل کر کے انھوں نے اس بات کا اعتراف کرلیا کہ جو ترجمہ انھوں نے کیا تھا وہ غلط تھا۔ اس تضاد سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ انکی نیت صاف نہیں ہے اور وہ محض اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں تاکہ اغیار راضی رہیں۔ حالانکہ اگر آپ آیت کو دیکھیں تو اس قسم کا کوئی قرینہ آپکو نہیں ملے گا بلکہ پورے قرآن میں جہاں جہاں ''ناظر''۔ ''نظر''۔ ''انظر'' اور اس قسم کے دیگر الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ دیکھنے کے ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ پھر پورے قرآن سے ہٹ کر اس آیت میں یہ استثنٰی کیسے کیا جائے؟۔ اسکے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ انسان جب کسی شے کو ڈھونڈتا ہے تو اسکے چہرے پر تفکر کے آثار ہوتے ہیں بلکہ اگر کافی دیر تک وہ مطلوبہ شے نظر نہ آئے تو چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں جبکہ آیت مذکورہ میں صاف کہا گیا ہے کہ ''انکے چہرے ترو تازہ ہونگے''۔ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ ''ناظر'' ''فاعل'' کے وزن پر ہے جسکے معنی ہیں ''مستقل دیکھنے والا''۔ جب کوئی شخص کسی شے کو تلاش نہ کر سکے تو پھر وہ تلاش کرنا چھوڑ دیتا ہے اور ایسی صورت میں ''ناظر'' نہیں رہتا جبکہ قرآن ان لوگوں کو ناظر کہہ رہا ہے۔ پھر یہ بھی کہ جن مومنین کا دنیا میں ہمیشہ یہی عقیدہ رہا ہو کہ اللہ نظر نہیں آسکتا تو کیا قیامت میں انکا عقیدہ بدل جائے گا؟۔ اگر نہیں تو پھر وہ اللہ کو دیکھنے کی کوشش کیوں کریں

گے ؟۔اس تمام گفتگو سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مومنین اللہ کو نہیں بلکہ اپنے رب کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہونگے اور مسرور و شاد ہو رہے ہونگے کیونکہ انکی ساری زندگی کی تمنا اس روز پوری ہو رہی ہوگی اور اسی لئے انکے چہرے تر و تازہ ہونگے ۔

ہم سے پوچھا اے جانِ جاں کیا ہے ترے ملنے کی عید
عمر بھر تکتے رہے ہیں تب نظر آیا ہے چاند

ان عقلی و منطقی مباحث سے قطعِ نظر اگر ارشاداتِ معصومینؑ پر نگاہ کی جائے تو یہ بات روزِ روشن کیطرح واضح ہو جائے گی کہ اس آیت میں ''نظر'' سے مراد ''رویت'' ہی ہے جسکی بہت سی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں لیکن خوفِ طوالت سے یہاں صرف تین مقامات کی نشاندہی کی جارہی ہے جو سمجھنے والوں کے لئے کافی و وافی ہیں۔یہ تینوں حوالے مفاتیح الجنان سے پیش کئے جارہے ہیں:۔

۱۔صفحہ ۲۵۳۔(مناجاتِ مریدین)۔''پروردگار تیری رضا میرا مقصود ہے اور تیری رویت ہی میری ضرورت ہے اور تیرا قرب میری انتہائی خواہش ہے''۔

۲۔صفحہ ۲۶۲۔(مناجاتِ زاہدین)۔''پروردگار اپنی ملاقات کے دن اپنی رویت سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی فرما''۔

۳۔صفحہ ۲۵۴۔(مناجاتِ محبین)۔''میرے معبود! مجھے ان لوگوں میں قرار دے ......جنکو تو نے اپنے مشاہدے کے لئے چن لیا ہے''۔

چنانچہ شیخ صدوق اپنی کتاب ''معانی الاخبار'' کے صفحہ ۱۱۲ پر لکھتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''تم لوگ اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جسطرح تم چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو اور اسکو دیکھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی''۔

اس مسئلے پر ہم مزید گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ ائمہؑ معصومین کا رب ہونا تو اترات شیعہ سے ہے اور اسی لئے نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۷۷ پر حضرت امیرؑ المومنین حصولِ علم کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ''علم حاصل نہیں کرنا چاہئے مگر اپنے ربوں (آلِ محمدؐ) سے''۔

<u>شہادتِ ولایتِ علیؑ</u>

یہ صرف چند جملوں کی زحمت ہے کیونکہ ہم اس بات کو اپنی شرعی اور ایمانی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے کیطرف مومنین کی توجہ مبذول کراتے رہیں اور آپ کو ہماری ہر کتاب میں یہ موضوع ضرور ملے گا۔

بات یہ ہے کہ ولایتِ امیرؑ المومنین اصلِ اصولِ دین تو ہے ہی لیکن یہ سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ <u>ولایتِ علیؑ پر ایمان رکھنا اور اسکی شہادت دینا دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں سے کوئی ایک دوسری کی کفایت نہیں کرسکتی</u>۔ پھر شہادت بھی دو اقسام پر مشتمل ہے۔ ایک قولی شہادت اور دوسری عملی شہادت۔ قولی شہادت یہ ہے کہ جب بھی توحید و رسالت کی شہادت دی جائے تو فوراً ولایت کی شہادت بھی دی جائے

اور اس شہادت کو ہم کشف المسائل میں اچھی طرح ثابت کر آئے ہیں۔ عملی شہادت یہ ہے کہ انسان کے افعال واعمال سے ولایتِ علیؑ ظاہر ہوتی ہو اور اسکی آخری حد انسان کا وہ عمل ہے جب وہ اس ولایت پر قائم رہتے ہوئے اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کرے۔ جہاد فی سبیل اللہ اسی کا نام ہے اور شہید فی سبیل اللہ اسی کو کہتے ہیں کیونکہ بتواتر ثابت ہے کہ سبیل اللہ سے مراد حضرت امیرؑ المومنین اور انکی ذریتِ طاہرہ ہے اور شہید فی سبیل اللہ وہ ہے جو انکی محبت و ولایت کی راہ میں جان دے دے۔

ہم نے کشف العقائد میں ثابت کیا تھا اور اب پھر عرض کر رہے ہیں کہ اجراءِ سلسلۂ نبوت سے مقصدِ خداوندی صرف ولایت کا تعارف کرانا تھا۔ پس اس شہادت کو چھپانا دراصل مقصدِ خداوندی کو ناکام بنانے کی ناپاک کوشش ہے۔ جس ولایت کے تعارف کے لئے انبیاءِ کرام نے ہزار ہزار تکالیف اٹھائی ہوں۔ جسکی خاطر ستر ہزار انبیاءِ بنی اسرائیل قتل ہوئے ہوں اور جسکے اعلان میں معمولی سی تاخیر کی وجہ سے محبوبِ کبریا حضرت محمد مصطفیٰؐ کو اللہ کیطرف سے دھمکی ملتی ہو اس شہادت کو چھپانے والے کا ٹھکانا کہاں ہوگا یہ بات خود اسے ہی سوچنا چاہئے۔ چنانچہ بقرہ ۱۴۰ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "<u>اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جسکے پاس اللہ کیطرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے</u>"۔

کبھی کبھی قرآن مجید میں غور وتدبر کر لینے سے صحت خراب نہیں ہو جاتی۔ اس بات کا

میں یقین دلاتا ہوں۔ یہ سنجیدہ معاملات ہیں اس لئے ان سے سرسری طور پر نہیں گزرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اللہ کیطرف سے وہ کونسی گواہی لوگوں کے پاس ہے جسے وہ چھپاتے ہیں؟ کیا وہ توحید کی گواہی ہے؟ کیا وہ رسالت کی گواہی ہے؟۔ ہر عقل یہ گواہی دے گی کہ یہ گواہیاں ہرگز وہ نہیں ہیں جنکو لوگ چھپاتے ہیں کیونکہ یہ تو وہ گواہیاں ہیں جو ہر مسلمان خواہ وہ خارجی و ناصبی ہی کیوں نہ ہو ضرور دیتا ہے اور خوشی خوشی دیتا ہے یہاں تک کہ لشکرِ یزید بھی یہ دو گواہیاں ادا کرتا تھا۔ پھر وہ شہادت کونسی ہے جسکو لوگ چھپاتے ہیں اور جسکی طرف خداوندِ علیم وحکیم اشارہ فرما رہا ہے۔ اگر صرف مشاہدے پر ہی اعتماد کیا جائے تو مشاہدہ خود گواہی دے گا کہ وہ گواہی جسے اپنے پرائے سب چھپانے کے درپے ہیں وہ صرف اور صرف شہادتِ ولایتِ علیؑ ہے۔ اگر یہ شہادت اتنی ہی غیر ضروری ہوتی جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں یا جیسا کہ انکے ذہنوں میں ڈالا جاتا ہے تو پھر اللہ کو کیا پڑی تھی کہ ہر ہر مرحلے پر اپنے بندوں سے یہ گواہی دلواتا۔ حضرت ختمی مرتبتؐ کو متعدد بار معراج ہوئی ہے اور ہر بار یہی گواہی دلوائی گئی ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جا سکتا اسلیے صرف ایک حدیث نقل کر رہا ہوں جو تفسیر فرات صفحہ ۵۷ سے اخذ کی گئی ہے:۔

''جناب سیدہ کونینؑ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''معراج کی رات میں جب سدرۃ المنتہٰی کے مقام پر پہنچا تو میں نے اذان دو دو دفعہ اور اقامت کی فصل کو ایک ایک مرتبہ سنا۔ میں نے ایک آواز دینے والے کی آواز کو سنا۔ ''اے میرے فرشتو!

میرے آسمانوں اور میری زمین میں رہنے والو! اور میرے عرش کو اٹھانے والو! گواہی دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں اکیلا ہوں میرا کوئی شریک نہیں"۔انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا۔"میرے فرشتو! میرے آسمانوں اور زمین میں رہنے والو! اور میرے عرش کو اٹھانے والو! گواہی دو کہ محمدؐ میرے بندے اور رسول ہیں"۔انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں۔فرمایا۔"میرے فرشتو! میرے آسمانوں اور زمین میں رہنے والو! اور میرے عرش کو اٹھانے والو! گواہی دو کہ علیؑ میرا اور میرے رسولؐ کا اور مومنین کا میرے بعد ولی ہے"۔انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں"۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اقرار اور چیز ہے اور گواہی دوسری چیز۔یہ ایک دوسرے کا بدل نہیں ہوسکتیں اور مومن کہلانے کے لئے دونوں ضروری ہیں۔پس اگر کوئی شخص اقرارِ ولایت تو کرے لیکن شہادتِ ولایت کو چھپائے تو ایسا شخص یقیناً ظالم بلکہ اظلم کے زمرے میں آئے گا۔علیؑ ذکر اللہ ہیں اور ذکر اللہ کو چھوڑ کر جتنی بھی عبادتیں کی جائیں گی وہ سب کی سب عبادتِ شیطان کہلائیں گی اور اسی کے بارے میں اللہ نے سوال کیا ہے کہ"اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا؟"۔

ذکر

ذکر پر ہم اسلئے گفتگو کر رہے ہیں کیونکہ اس سے نکلنے والے نتائج سے ہمیں اگلے عنوان میں مدد لینا ہے۔

قرآن مجید میں لفظِ ذکر دو طریقوں پر استعمال ہوا ہے۔ کہیں یہ مفرد آیا ہے اور کہیں مرکب۔ یعنی کہیں صرف ''ذکر'' آیا ہے اور کہیں ''ذکر اللہ۔ ذکر الرحمٰن اور ذکرہٗ '' استعمال ہوا ہے۔ جہاں یہ مفرد طریقے پر آیا ہے یعنی صرف ''ذکر'' وہاں اسکے دو معنی نکلتے ہیں۔ ایک ''قرآن'' اور دوسرے ''رسولؐ''۔ مثلاً سورۂ حجر کی آیت ۹ میں ارشاد ہوا۔ ''اِنّا نحن نزّالنا الذکر و اِنّا لہٗ لحافظون ''۔ یعنی ہم نے ہی ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔

یہاں ذکر سے مراد قرآن مجید ہے۔ اسی طرح سورۂ طلاق آیات ۱۰ اور ۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف ذکر کو نازل کیا ہے جو رسول ہے۔ وہ تم پر اللہ تعالیٰ کی واضح آیات پڑھتا ہے...... الخ''۔

یہاں ذکر سے مراد ذاتِ ختمی مرتبتؐ ہے۔ لیکن جہاں جہاں اللہ نے ذکر کو اپنی طرف منسوب کیا ہے جیسے ''ذکر اللہ''۔ ''ذکر الرحمٰن''۔ ''ذکرہٗ '' یا ''ذکری'' وغیرہ تو وہاں مراد حضرت امیرؑ المومنین ہیں جسکی مثالیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

ا۔ طٰہٰ ۱۲۴۔ ''اور جو کوئی میرے ذکر سے روگردانی کرے گا تو یقیناً اسکی زندگی تنگی میں

بسر ہوگی اور وہ قیامت کے دن اندھا محشور کیا جائے گا‘‘۔

تفسیر فرات صفحہ ۳۱۷ پر امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔’’اگر علیؑ کی ولایت چھوڑ دی تو خداوندِ عالم اسکو اندھا اور آواز نہ سننے والا بہرا بنائے گا۔ذکری (میرا ذکر) رسولؐ اللہ کی زبان پر علیؑ ابن ابی طالبؑ مراد ہیں‘‘۔

تفسیر صافی صفحہ ۳۲۴ پر بحوالہ کافی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں معصومؑ فرماتے ہیں۔’’ذکری سے مراد ولایت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے اور اندھے سے مراد آخرت میں آنکھوں کا اندھا اور دنیا میں ولایت امیرؑ المومنین کیطرف سے دل کا اندھا ہے‘‘۔

۲۔عنکبوت ۴۵۔’’یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور ضرور اللہ تعالیٰ کا ذکر اکبر (سب سے بڑی چیز) ہے‘‘۔

معصومؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔’’نحن ذکر اللہ و نحن اکبر ‘‘۔یعنی ہم ہی اللہ کا ذکر ہیں اور ہم ہی اکبر ہیں۔(شہادت ولایت علیؑ صفحہ ۱۸۰ بحوالہ مراۃ الانوار۔تفسیر برہان۔کنایت الموحدین)۔

۳۔جمعہ ۹۔’’اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو جب جمعے کے دن نماز کے لئے نداء دی جائے تو تم اللہ تعالیٰ کے ذکر کیطرف دوڑ پڑو......الخ‘‘۔

امام محمد باقرؑ اسکی تفسیر میں فرماتے ہیں۔’’ذکر اللہ امیرؑ المومنین ہیں‘‘۔(شہادت ولایت علیؑ صفحہ ۱۸۰ بحوالہ اختصاص)۔

۴۔جن ۱۷۔’’جو شخص اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرے گا اسے سنگین ترین عذاب

بھگتنا پڑے گا''۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ ''اس آیت میں ''ذکر رب'' سے مراد ولایت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے''۔ (اکمال الدین بولایت امیرؑ المومنین۔صفحہ۳۴۲)

ہم نے یہاں صرف چار مقامات کا ذکر کیا جو سمجھنے والوں کے لئے کافی ہے اور اب اس بات پر مزید بحث کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ ''ذکر اللہ'' حضرت امیرؑ المومنین ہیں۔ اور اب اس ''ذکر اللہ'' کے بارے میں چند آیات اور روایات آپکی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں تا کہ آپکے دلوں کو ٹھنڈک پہنچے۔

۱۔ زخرف ۳۶۔ ''اور جو شخص رحمٰن کے ذکر سے اندھا ہو جاتا ہے ہم اسکے لئے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔ پس وہی اسکا ہم نشین ہوتا ہے''۔

پس جو شخص بھی علیؑ کے ذکر سے غافل نظر آئے۔ سمجھ لیجئے کہ اسکے ساتھ کوئی نہ کوئی شیطان ضرور لگا ہوا ہے اور اگر آپ تھوڑی سی جستجو کریں گے تو انشاءاللہ وہ شیطان نظر بھی آ جائے گا جسکی وضاحت اگلی آیت سے ہو رہی ہے۔

۲۔ زمر ۴۵۔ ''اور جس وقت خدائے واحد کا ذکر کیا گیا تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں انکے دل نفرت کرنے لگے اور جب انکا ذکر کیا گیا جو اسکے سوا ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں''۔

اس بارے میں ہم کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔ جو شے آپکو اس آیت کا مفہوم بتائے گی وہ صرف اور صرف آپکا مشاہدہ ہے۔

۳۔ منافقون ۹۔ ''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے تمھیں تمھارے مال اور تمھاری اولا د اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرے اور جو ایسا کرے گا پس وہی نقصان اٹھانے والے ہیں''۔
اس آیت سے آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ علیؑ سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں رہا جا سکتا کیوں کہ یہ وہ ذکر ہے جو ہر حال میں جاری رہتا ہے اور انسان چاہے کوئی کام بھی کر رہا ہو مگر دھیان علیؑ ہی طرف رہنا چاہئے۔
۴۔ رعد ۲۸۔ ''جو لوگ ایمان لا چکے انکے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں''۔
تفسیر قمی میں ہے کہ اس آیت میں ''الذین امنوا'' سے مراد شیعہ ہیں اور ''ذکر اللہ'' امیرؑ المومنین اور ائمہؑ معصومین ہیں۔
اس آیت پر اگر میں چاہوں تو بہت کچھ لکھ سکتا ہوں مگر شاید اسے میرا ذاتی عقیدہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن مختصراً یہ عرض کر دوں کہ تقرب الی اللہ کے کئی مراحل ہیں۔ اوّل ایمان اور ایمان کے بہت سے درجات ہیں مثلاً ایمان بالقول۔ ایمان بالتصدیق اور ایمان بالمعرفت۔ ان تمام مراحل سے گزرے تو انسان مومنِ مستبصر کہلاتا ہے۔ دوئم یقین اور اسکے بھی تین درجات ہیں۔ علم الیقین۔ عین الیقین اور حق الیقین۔ اور یقین کے بارے میں فرمانِ معصومؑ یہ ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں جو شے سب سے کم تقسیم کی ہے وہ یقین ہے۔ اس یقین کے بعد اطمینان ہے۔ اس اطمینان کے بھی درجات ہیں۔ مثلاً اطمینانِ قلب اور اطمینانِ نفس۔ اس آیت میں اطمینانِ

قلب کی بات کی گئی ہے۔یہ وہی اطمینان ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنے رب سے مانگا تھا۔عین ممکن ہے کہ انھیں بھی یہی جواب ملا ہو کہ ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ''۔اب آپکو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اطمینان کتنا ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔اللہ نے حضرت ابراہیم کو عالمِ ملکوت کی سیر کرائی تھی اور علیؑ کی ولایت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لینے کے بعد ہی انھیں اطمینانِ قلب عطا ہوا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب انھوں نے دعا کی تھی کہ ''پروردگار مجھے علیؑ کے شیعوں میں قرار دے''۔جسکی سند انھیں اسطرح ملی تھی کہ ''اِنّ شیعۃ' لَا براہیم ''۔مومن بھی اپنے ظرف اور استطاعت کے مطابق مقاماتِ ولایت کی سیر کرتا ہے اور اس بات کا یقین کر لیں کہ اسکا دل دھڑکتا ہے تو دھڑکن کے بجائے ''علیؑ۔علیؑ۔علیؑ'' کی آواز آتی ہے۔جس شخص پر یہ کیفیت گزرتی ہے وہ میری تصدیق کرے گا۔باقی لوگ تو شاید صرف مسکرا کر ہی رہ جائیں۔لیکن وہ لوگ بھی اس بات کو آزمالیں اور پھر یقین کر لیں کہ کیسی ہی پریشانی اور کیسی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ایک بار سب کچھ بھول کر پوری توجہ سے ''یا علیؑ'' کہو۔پھر دیکھو کہ پریشانیاں اور تکالیف کیسے بھاگتی ہیں۔اور کیوں نہ ہو جبکہ خود اللہ نے یہ گارنٹی دے دی ہو کہ ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ''۔

۵۔مفاتیح الجنان صفحہ ۱۰۱۔''وہ جسکا اسم دوا ہے اور جسکا ذکر شفا''۔

اسم پر گفتگو ہم انشاءاللہ آئندہ اوراق میں کریں گے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ وہ اسم ہر مرض کی

دوا ہے چاہے وہ مرضِ جسمانی ہو۔نفسانی ہو یا روحانی ۔اور کمال کی بات یہ ہے کہ دوا بھی وہی ہے اور شفا بھی وہی ۔یعنی اسکو اللہ سے مانگنا دوا ہے اور اسکا مل جانا شفا ہے۔

۶۔مفاتیح الجنان صفحہ ۱۳۸۔''اے اللہ میں تیرے ذکر کے ذریعے تیرا تقرب چاہتا ہوں اور تیرے نفس کو تیرے حضور اپنا سفارشی بناتا ہوں''۔

ہماری تمام عبادات کی نیت ''قربۃً الی اللہ ''ہوتی ہے اور اس دعا سے ثابت ہوتا ہے کہ تقربِ خدا صرف علیؑ ہی کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ ذکر اللہ وہی ذاتِ اقدس ہے لہٰذا اگر کوئی صرف زبانی کلامی'' قربۃً الی اللہ ''کہتا ہو تو اسکی بات الگ ہے لیکن اگر کوئی واقعی خلوصِ دل سے تقربِ خدا چاہتا ہے تو اسے ایسا کہتے وقت ذہن میں علیؑ کا تصور رکھنا ضروری ہے کیونکہ اگر بغیر علیؑ کے تصور کے'' قربۃً الی اللہ'' کہا تو خدا جانے کس کی قربت مل جائے اور انسان یہی سمجھتا رہے کہ اسے قربتِ خدا ملی ہے۔اس دعا میں اللہ کے حضور سفارش کے لئے بھی خود اللہ کے نفس کا انتخاب کیا گیا ہے۔کیا دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا شخص موجود ہے جو یہ کہہ سکے کہ ''نفس اللہ''علیؑ کے علاوہ کوئی اور بھی ہے؟۔پس یہ یقین کرلینا چاہئے کہ علیؑ سے فرار ہونا ممکن نہیں ہے۔

۷۔مفاتیح الجنان صفحہ ۲۰۱۔''اے وہ جسکا ذکر ذاکروں کے لئے وجہ شرف ہے''۔

اسکا صحیح اندازہ ان ذاکرینِ عظام کو ہوسکتا ہے جو منبر پر بیٹھ کر ذکرِ علیؑ کرتے ہیں۔وہ

دیکھیں کہ انکو جو عزت و شرف مل رہا ہے وہ کس کی وجہ سے مل رہا ہے اور لوگ جو کھنچ کھنچ کر انکی طرف آ رہے ہیں تو کس کی وجہ سے؟ لیکن ہر مومن یہ بات یاد رکھے کہ ذکر کرنے کے لئے منبر پر بیٹھنا ضروری نہیں ہوتا۔ انسان اپنے بستر پر لیٹ کر بھی ذکرِ علیؑ کر سکتا ہے اور ایسا ذکر بہت خالص ہوا کرتا ہے۔

۸۔ زخرف ۴۳۔ ''(اے رسولؐ) ضرور ضرور تمسک رکھ اس سے جو تیری طرف وحی کی گئی ہے۔ بیشک تو صراطِ مستقیم پر ہے''۔

عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۵۰۹ پر اس آیت کی تفسیر میں معصومؑ فرماتے ہیں۔ ''بیشک علیؑ تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے ذکر ہیں۔ عنقریب تم لوگوں سے علیؑ کی محبت کے متعلق سوال کیا جائے گا''۔

اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ جب محبوبِ خدا حضرت ختمی مرتبتؐ تک سے علیؑ کی محبت کے بارے میں سوال کیا جانا ہے تو ایک عام امتی اس سے کیونکر مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ لیکن علیؑ کی محبت اسی وقت ملتی ہے جب غیر اللہ کی محبت کو دل سے نکال دیا جائے۔

حقیقتِ نماز

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس موضوع پر گفتگو کرنا ہم اپنا اہم ترین فریضہ سمجھتے ہیں کیونکہ یہی وہ شے ہے جس سے غفلت برتی جا رہی ہے اور گروہِ شیاطین سب سے

زیادہ اسی کے در پے ہے اور اسی لئے ہم نے ''ذکراللہ'' پر بات کی ہے تا کہ اس موضوع کو سمجھنا آسان ہو جائے اور قرآن و حدیث سے اسکی اہمیت کا اندازہ ہو سکے اور ہم سمجھ لیں کہ نماز کا اصل مقصد کیا ہے اور دیگر اقوام کیطرح پوجا پاٹ میں ساری زندگی گزارنے کے بجائے ہم وہ کریں جو مقصودِ خداوندی ہے کیونکہ مقصدِ حیات یہ ظاہری حرکات وسکنات کرنا نہیں بلکہ اطاعتِ خدا کرنا ہے اور اسکے لئے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان احکام سے اللہ کی منشاء و مراد کیا ہے اور سوچا جائے کہ یہ کیا غضب ہے کہ جسکے لئے نماز قائم کی جارہی ہے خود اسی کو نماز سے نکال دیا جائے اور اللہ کی اطاعت کے بجائے ملاّ کی اطاعت کو اپنی زندگی کا منشور بنالیا جائے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھا جائے گا کہ نماز پڑھی کس کے لئے جاتی ہے؟۔لیکن یہ بات ذہن میں محفوظ رہنی چاہئے کہ ذکراللہ حضرت امیرؒ المومنین ہیں۔

ا۔طٰہٰ ۱۴۔ ''یقیناً میں ہی اللہ ہوں ۔میرے سوا کوئی معبود نہیں ۔پس تم میری ہی عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز پڑھو''۔

اس آیت سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ عبادتِ خدا کا مطلب ہی یہ ہے کہ ذکراللہ کے لئے نماز پڑھی جائے اور جس نماز میں یہ ذکراللہ مفقود ہو وہ اللہ کی عبادت نہیں بلکہ شیطان کی عبادت ہے۔

۲۔شمس ۱۵۔ ''اور اپنے رب کے اسم کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا''۔

اس آیت میں اسمِ رب کے ذکر کو نماز کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے۔آئندہ اوراق

میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ اسم اللہ سے مراد حضرت امیرؑ المومنین ہیں۔لہذا ظاہر ہوا کہ نماز ذکرِ علیؑ کے علاوہ کوئی شے ہے ہی نہیں۔اسی لئے معصومؑ نے ارشاد فرمایا ہے۔''نحنُ صلوٰۃ المومنین''۔یعنی ہم ہیں مومنین کی نماز۔

۳۔مائدہ۹۱۔''ماسوا اسکے نہیں کہ شیطان شراب اور جوئے کے لئے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈالنا چاہتا ہے اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتا ہے''۔

اس آیت سے جہاں ذکر اللہ اور نماز کی وحدت کا ذکر کیا گیا ہے وہیں یہ بات بھی سمجھائی گئی ہے کہ مختلف گناہوں سے بچنے کی جو تاکید کی گئی ہے اسکا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان ذکر اللہ سے غافل نہ ہونے پائے۔

۴۔اعلیٰ۱۴۔۱۵۔''یقیناً اس نے فلاح پائی جو پاک رہا اور اپنے رب کے اسم کا ذکر کیا پھر نماز پڑھی''۔

۵۔نور۳۶۔''ایسے گھروں میں جہاں اللہ نے بہ آواز بلند اپنے اسم کا ذکر کرنے اور اسکی تسبیح وتقدیس کی صبح وشام اجازت دے رکھی ہے''۔

علیؑ فی القرآن صفحہ۲۹۱۔رسول اللہؐ نے فرمایا۔''یہ گھر انبیاءؑ کے گھر ہیں اور علیؑ وفاطمہؑ کا گھر نہ صرف انہی گھروں میں سے ہے بلکہ ان تمام گھروں سے افضل ترین گھر ہے۔(کیونکہ اس گھر میں اللہ کا اسم بذاتِ خود موجود ہے)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ ''علی'' ولی اللہ'' بہ آوازِ بلند پڑھنا سنتِ انبیاءؑ ہے۔ اس حدیث میں صرف انبیاءؑ کے گھروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ عام مساجد کے بارے میں اللہ کا حکم کیا ہے۔

۶۔ حج ۴۰۔ ''اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو عیسائی راہبوں کے تکیے اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کے اسم کا بہت ذکر کیا جاتا ہے ضرور گرا دیئے جاتے''۔

اس آیت میں مسجدوں کا صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں اللہ کے اسم کا ذکر کثرت سے کیا جائے۔ لہٰذا ایسی مسجدیں جہاں اللہ کے ذکر سے روکا جائے مسجدِ ضرار کے مثل ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عیسائی اور یہودی بھی اپنے اپنے عبادت خانوں میں درحقیقت اللہ کے اسم کا ہی ذکر کرتے ہیں چاہے کسی بھی نام سے کریں کیونکہ نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔

۷۔ بقرہ ۱۱۴۔ ''اس سے بڑھ کر ظالم (اظلم) کون ہوگا جس نے اللہ کی مسجدوں میں اسکے اسم کے ذکر کیے جانے کو روکا''۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر وہ کونسی مسجد ہے جہاں اللہ کا ذکر نہ ہوتا ہو؟ معلوم ہوا کہ مطلوب و مقصود خداوندی اپنے اسم کے ذکر کو بلند کرنا ہے اور اسطرح اگر کوئی زندگی بھر مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہے لیکن ذکرِ علیؑ نہ کرے اور اسکے بجائے دوسری کہانیاں بیان کرتا رہے تو وہ اللہ کی نظر میں نہ صرف ظالم بلکہ اظلم ہے اور اگر کوئی شخص چاہتا ہے

کہ خود کو ظالمین میں شامل ہونے سے بچائے تو اسکو ایسی مسجدوں میں جانے سے احتراز کرنا چاہئے۔

عہد

میرے ایک بزرگ نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ اس جملے کا مطلب کیا ہے کہ ''محمدؐ و آلِ محمدؐ حقیقتِ نماز ہیں''؟۔ اس کا جواب مختصراً دیا جارہا ہے تا کہ دیگر مومنین بھی استفادہ کرسکیں۔

بات یہ ہے کہ ہمیں یوں ہی کسی صحرائی اونٹ کی طرح اس دنیا میں نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ ہمیں خلق کرنے اور دنیا میں بھیجنے کا ایک مقصد ہے اور وہ ایک عہد ہے جو ہم سے عالمِ ذر میں لیا گیا ہے اور ہمیں دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہی ظاہر کرنا ہے کہ کون اس عہد کو پورا کرتا ہے اور کون اس سے روگردانی کرتا ہے۔ پہلے ہم اس عہد کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس سوال کا جواب خود بہ خود سمجھ میں آجائے گا۔

۱۔ رعد ۲۰۔ ''جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور میثاق کو نہیں توڑتے''۔

تفسیر صافی بحوالہ تفسیر قمی امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے کہ ''یہ آیت آلِ محمدؐ کے بارے میں اور اس عہد کے متعلق جو اللہ نے انکے بارے میں لیا اور عالمِ ذر میں جو عہد و پیان جناب امیرؑ المومنین اور دیگر ائمہؑ معصومین کی ولایت قبول کرنے کے متعلق لیا گیا تھا اسکے بارے میں نازل ہوئی ہے''۔

۲۔ دہر ۷۔ ''وہ نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جسکی سختی پھیل جانے والی ہے''۔

اس آیت کی تفسیر میں امام رضاؑ نے فرمایا۔ ''مراد یہ ہے کہ ان سے ہماری ولایت کا عہد لیا گیا''۔ (اصولِ کافی۔ کتاب حجت۔ باب ۱۰۷۔ حدیث ۵)

۳۔ بقرہ ۴۰۔ ''اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جس سے میں نے تمھیں سرفراز کیا اور تم میرے عہد کو پورا کرو تو میں بھی اپنا عہد پورا کرونگا''۔

تفسیر صافی اور تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''اسکا مطلب یہ ہے کہ تم علیؑ کی ولایت جو خدا کیطرف سے فرض ہے تسلیم کرو۔ میں تم کو جنت دوں گا''۔

ان آیات سے ثابت ہو گیا کہ دنیا میں بھیجنے سے پہلے اللہ نے ہم سے ولایت علیؑ کا عہد لیا اور ہمیں اسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا کہ ہم نے اپنی زندگی میں یہ عہد پورا کیا یا نہیں۔ چنانچہ سورۂ المعارج آیات ۳۲ تا ۳۵ میں جہاں نماز اور نمازیوں کا ذکر ہو رہا ہے وہاں بھی اسی عہد کا ذکر ہے۔ ''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی شہادات پر قائم رہنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جنتوں میں عزت پانے والے ہونگے''۔

اللہ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اس عہد کو پورا کرتے ہیں اور ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو اس عہد سے روگردانی کرتے ہیں جیسا کہ حسبِ ذیل آیات سے ظاہر

ہے۔

۴۔ رعد ۲۰ تا ۲۲۔ ''جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور میثاق کو نہیں توڑتے اور جو اس تعلق کو ملائے رکھتے ہیں جنکے ملائے جانے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔۔۔انہی کے لئے عاقبت کا گھر ہے''۔ (اس آیت کی تفسیر اوپر گزر چکی)۔

۵۔ رعد ۲۵۔ ''اور جو لوگ اللہ کے عہد کو پختہ ہونے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور جسکو ملائے جانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے قطع کرتے ہیں تو زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی ہیں جنکے لئے لعنت ہے اور انکے لئے آخرت کی خرابی ہے''۔

اس سے زیادہ وضاحت کرنا نہ تو میرے بس کی بات ہے اور نہ میں اسکی ضرورت سمجھتا ہوں۔ ہر چند کہ عہد کر لینے کے بعد یہ ذمہ داری عہد کرنے والے پر ہوتی ہے کہ اپنے کئے ہوئے عہد کو یاد رکھے اور اسے پورا کرے۔ لیکن یہ انتہائے لطف ہے اور منتہائے کریمیت ہے کہ اللہ نے انسانوں کو یہ عہد یاد دلانے کے لئے یکے بعد دیگرے مسلسل اپنے انبیاء کو بھیجا جو اسی عہد کی یاد دہانی کراتے رہے۔ خود حضرت ختمی مرتبت ؐ زندگی بھر اسی عہد کا ذکر کرتے رہے۔ پھر بھی ''الانسان مرکب من الخطاءِ و النسیان '' کے پیشِ نظر اللہ نے ایسا اہتمام کر دیا کہ انسان اس عہد کو کبھی بھول ہی نہ سکے۔ جسطرح اگر آپکو سویرے اٹھنا ہوتا ہے تو آپ الارم لگا لیتے ہیں جو زبردستی آپ کو جگا دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے بھی آپ کے لئے چند الارم

لگادیئے ہیں تا کہ آپ اس سے کئے ہوئے عہد کو کسی صورت میں بھی بھول نہ پائیں۔اگر آپ غور کریں تو اللہ نے نماز کے اوقات کچھ ایسے رکھے ہیں جن میں انسان کے غافل ہوجانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔صبح جب انسان اٹھتا ہے تو طبیعت بھاری ہوتی ہے اور انسان کروٹیں بدل بدل کر دوبارہ سونے کی کوشش کرتا ہے۔ایسے میں الارم بجتا ہے اور اسکے کانوں میں اذان کی آواز آتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ تجدیدِ عہد کا وقت آ گیا۔دوپہر کو جب انسان کام کاج میں مشغول ہوتا ہے تو یہ امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے غافل ہوجائے گا کہ اتنے میں پھر الارم بجتا ہے اور وہ پھر سے مستعد ہوجاتا ہے۔شام کو وہ تھکا ہارا گھر واپس آتا ہے تو تھکن کی وجہ سے طبیعت میں سستی پیدا ہوجاتی ہے اور کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔پھر ایک الارم بجتا ہے اور وہ ہوشیار ہوجاتا ہے۔

نماز کیا ہے؟ صرف یہ کہ بندہ اپنے معبود کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ پروردگار! گواہ رہنا کہ میں اپنے عہد پر قائم ہوں اور غافل نہیں ہوا۔یہی سبب ہے کہ جب وہ نماز کیطرف متوجہ ہوتا ہے تو اپنے عہد کی تجدید کرتا ہے اور جب عہد کی تجدید کر لی تو گویا اس نے مقصدِ نماز کو پورا کر دیا۔اسی لئے نماز شروع کرنے سے قبل ہی وہ اعلان کر دیتا ہے ''قد قامتہ الصلوۃ'' یعنی یقیناً نماز قائم ہوچکی۔حالانکہ ابھی اس نے ایک بھی رکنِ نماز ادا نہیں کیا ہوتا۔یہاں تک کہ نیتِ نماز بھی نہیں کی ہوتی۔تجدیدِ عہد کے بعد نماز میں کی جانے والی حرکات وسکنات صرف تعمیل حکم اور اپنی بندگی کا اظہار

ہوتا ہے۔اسی لئے مفاتیح الجنان صفحہ۸۲ پر دعا کا یہ جملہ موجود ہے۔''اے معبود! میری مہار تیرے ہاتھ میں ہے اور میں اپنی طاقت کے مطابق تیرے عہد و پیان پر قائم رہا ہوں''۔پس یہ عہد ہی حقیقت نماز اور روحِ نماز ہے اور یہی مطلب ہے اس قول کا کہ ''محمدؐ و آلِ محمدؐ حقیقت نماز ہیں''۔

اللہ نے ہم پر ''صلوۃ'' فرض کی ہے لیکن یہ ہمارے مقتدر کرم فرماؤں کی کارگزاری ہے کہ انھوں نے اپنی مصلحتوں اور اپنے مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک فارسی لفظ ''نماز'' کو زبردستی لفظِ ''صلوۃ'' کا متبادل قرار دے دیا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ نماز لوگوں کے ذہنوں پر اس حد تک مسلط ہوگئی ہے کہ صلوۃ کی طرف انکا دھیان جاتا ہی نہیں۔ یہ صلوۃ وہی ہے جسکا ذکر آیۂ درود میں کیا گیا ہے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ پر صلوۃ بھیجنے کا مطلب کیا ہے یہ ہم شیخ صدوق کی کتاب ''معانی الاخبار'' صفحہ ۱۵۷ حدیث ا سے بیان کرتے ہیں۔

''الصادق جعفرؑ بن محمدؑ نے فرمایا۔''جو شخص نبیؐ پر صلوۃ بھیجتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ بیشک میں ایک میثاق و وفاء پر قائم ہوں کہ جسکو میں نے عالمِ ارواح اور اصلابِ اجداد میں پروردگار کے قول ''الست بربکم'' پر قبول کیا تھا''۔

ایک علامہ صاحب نے جو دشمنی علیؑ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اپنی ایک تقریر کے دوران یہ قیمتی جملے ارشاد فرمائے۔

''ہم نماز میں شہادتِ ولایت نہیں دیتے لیکن نماز تو پڑھتے ہیں۔لیکن جو لوگ ولایتِ علیؑ کا شور مچاتے ہیں وہ تو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتے۔ بتایئے کون اچھا رہا؟''۔

ہم علامہ صاحب کو ضرور بتائیں گے کہ کون اچھا رہا لیکن سب سے پہلے انھیں چاہیئے کہ وہ اس اتہام کی توجیہ فرمائیں جو انھوں نے قائلینِ علیؑ ''ولی اللہ پر لگایا ہے اور بتائیں کہ انکے دل پر کس نے وحی کی ہے کہ کون نماز پڑھتا ہے اور کون نہیں؟۔ایسی بچکانہ باتیں علامہ صاحب کو زیب نہیں دیتیں اور ا نکا فرض ہے کہ اپنے منصب کا خیال رکھیں اور ذمہ دارانہ رویہ اختیار کریں۔

یہ ساری غلط فہمی اس تصور کا شاخسانہ ہے جو علامہ صاحب اور انکے دیگر ہم مشربوں نے عوام میں پھیلایا ہوا ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات پختہ کر دی گئی ہے کہ ''نماز نہ پڑھنے سے نماز پڑھنا بہتر ہے''۔اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اب عام لوگ دشمنانِ آلِ رسولؐ کو نماز میں مشغول دیکھ کر انھیں تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ انکی مثالیں دیتے ہیں کہ ''دیکھو ان لوگوں کی مسجدیں نمازیوں سے کس طرح بھری ہوتی ہیں؟''۔یہ لوگ اگر کربلا میں ہوتے تو یقیناً لشکرِ یزید کی بھی ضرور تعریف کرتے اور انکو بھی مثال بناتے۔ یہ سب کچھ حقیقتِ نماز سے غفلت کا نتیجہ ہے اور حقیقتاً یہ عقیدہ شیطانی ہے۔ہم علامہ صاحب کو خبردار کرتے ہیں کہ ان جیسے لوگوں کے لئے نماز

پڑھنے سے زیادہ نماز نہ پڑھنا بہتر ہے۔ کیونکہ بغیر ولایتِ علیؑ جتنی جتنی نمازیں وہ پڑھتے جائیں گے اتنے ہی عذاب بالائے عذاب میں گرفتار ہوتے جائیں گے۔ نماز نہیں پڑھیں گے تو کم ازکم عذاب میں تو تخفیف ہوجائے گی کیونکہ جنھوں نے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے انھوں نے ہی یہ بھی فرمایا ہے جو ہم ذیل میں درج کررہے ہیں۔ اسے غور سے پڑھئے اور اپنے رخِ حیات کی صحیح سمت متعین کیجئے۔

ثواب الاعمال وعقاب الاعمال صفحہ ۲۲۷ سے دو احادیث پیش کی جارہی ہیں جو علامہ صاحب کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں۔

۱۔ حدیث ۱۷۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''جو شخص اس امر یعنی ولایتِ علیؑ کی مخالفت کرتا ہے اسکے لئے برابر ہے کہ نماز پڑھے یا زنا کرے''۔

۲۔ حدیث ۱۸۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''ہم اہلِ بیتؑ کا دشمن پرواہ نہ کرے۔ روزہ رکھے یا نماز پڑھے۔ زنا کرے یا چوری کرے۔ بیشک وہ (جہنم کی) آگ میں ہے۔ بیشک وہ (جہنم کی) آگ میں ہے''۔

لہٰذا جو شخص ولایتِ علیؑ کی مخالفت کرے اور پھر نماز پڑھے تو سب سے پہلے تو اس پر حدِ شرعی جاری ہونا چاہئے۔ تعریف تو بعد میں ہوگی۔

قاتلِ رسولؐ

حضرت ختمی مرتبتؐ کا ارشاد ہے ''یا علیؑ! تجھے مجھ سے وہی منزلت حاصل ہے جو میرے

سر کو میرے بدن سے''۔

اگر کوئی کسی کا سر کاٹ دے تو وہ اسکا قاتل کہلاتا ہے۔پس شہادتِ رسالت سے شہادتِ ولایت کو جدا کرنے والا قاتل رسولؐ قرار پائے گا۔اسی لئے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تھا کہ ''تم میں سے کوئی بھی۔کبھی بھی اور کہیں بھی جب لا الہ الا اللہ و محمدؐ الرسول اللہ کہے تو فوراً کہے ''علی امیر المومنین ولی اللہ''۔

فوراً کی شرط معصومؑ نے اسی لئے لگائی ہے تا کہ دونوں شہادتوں کے درمیان کوئی فصل اور فاصلہ نہ رہے کیونکہ سر اور بدن ایک دوسرے متصل ہوتے ہیں اور انکے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔یہاں تو فاصلہ پیدا کرنے کی ممانعت وارد ہورہی ہے کجا یہ کہ سرِ رسولؐ کو بدنِ رسولؐ سے بالکل جدا کر دیا جائے۔کیا کہنا ہے ایسی نماز کا کہ جسکو پڑھ کر انسان قاتلِ رسولؐ ہو جائے! ایسی نماز علامہ صاحب کو ہی مبارک ہو۔

اسم اور معنی

اس موضوع پر ہم کشف المسائل میں گفتگو کر چکے ہیں جو اگر چہ انتہائی مختصر تھی لیکن فکر انگیز ضرور تھی جس نے قارئین کے ذوقِ تجسس کو انگیخت کیا اور میرے احباب کی ایک کثیر تعداد نے مجھ سے فرمائش کی کہ اس موضوع کی تفصیلات کو سامنے لایا جائے۔ یہ موضوع اتنا حساس اور نازک ہے کہ اسکا بیان کرنا اسکو سمجھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ دنیا میں نافہموں کی کوئی کمی نہیں اور اس بات کا اندیشہ ہر حال میں موجود رہتا ہے کہ کسی بھی جملے کو اسکے سیاق و سباق سے کاٹ کر کوئی مسئلہ کھڑا کر دیا جائے اور بے مقصد بحث و تمحیث کے متعدد دروازے کھول دیئے جائیں۔ ایسے عوامی مزاج لوگوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود رہتی ہے جو بغیر تصدیق کے محض سن کر ہی ان نافہموں کے ہم خیال بن جاتے ہیں کیونکہ لفظِ ''غلو'' بے عقلوں کا ایک من پسند موضوع ہے۔ یہ لفظ بولنے میں اتنا آسان ہے کہ توتلے اور ہکلے بھی اسے بہ آسانی ادا کر سکتے ہیں۔ شیطان نے یہ لفظ اپنے مریدوں کے منہ میں کچھ اسطرح ڈالا ہے کہ اب یہ چیونگم بن گیا ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ لیکن اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ ضروری تھا کہ یہ خطرہ مول لیا جائے اور احباب کے شدید اصرار نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ لہٰذا ہم اس وادی میں قدم رکھتے ہیں ان ہی پر اعتماد و توکل کر کے اور ان ہی سے طلبِ استعانت کر کے جن کے حق کی وکالت کرنا ہمارا مقصدِ حیات

ہے۔

توحید اسلام کا بنیادی رکن ہے جسکو سمجھے بغیر دین سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا اور بغیر سمجھے بوجھے کوئی عقیدہ رکھنا یا کوئی عمل کرنا گویا اندھیرے میں تیر چلانا ہے اور اسکا انجام ہمیشہ گمراہی پر ہوتا ہے۔ پھوٹ اسی لئے پڑتی ہے۔ فرقے اسی لئے بنتے ہیں اور لڑائی جھگڑے اسی لئے ہوتے ہیں کہ عقیدوں اور اعمال کی بنیاد جہالت کو بنالیا جاتا ہے اور نہ جاننے کو ہی جاننا تصور کرلیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج تک توحید نہ خواص کی سمجھ میں آئی اور نہ عوام کی اور توحید کو شرک کہنا اور شرک کو توحید سمجھنا ان کا وطیرہ بن گیا ہے۔ ایسے اندھوں اور بہروں کے سامنے توحید بیان کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور اسی بات نے ہمیں تحریص دلائی کہ ہم اس موضوع پر لکھیں تا کہ بات کم از کم ان تک تو پہنچ جائے جو اسکے اہل ہیں۔ نا اہلوں کی سزا ان بیچاروں کو کیوں ملے۔

توحید کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ کو ہوگیا ہے تو اس بات کو بھی سمجھ لیجئے کہ توحید کی کلید ''اسم و معنیٰ'' کی حقیقت کو جاننا ہے اور اسم و معنیٰ میں فرق جان لینا ہی حقیقتِ توحید کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسکے بغیر توحید کا کوئی تصور ہے ہی نہیں کیونکہ ایک ایسی ہستی کو جاننا۔ اسکی صفات کا ادارک کرنا اور اس پر ایمان لانا جو مشاہدے سے بالاتر ہو عقلاً محال ہے اور توہم پرستی کے زمرے میں آتا ہے۔ چنانچہ انقلابِ روس کے بعد یہ بیان اخبارات میں آیا کہ ''ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ (معاذ

اللہ) خدا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا ہے"۔اور جب روس کا پہلا خلائی راکٹ چاند پر جا کر واپس آیا تو یہ بیان دیکھنے میں آیا کہ "ہم تمام راستے خدا کو ڈھونڈتے ہوئے گئے مگر وہ ہمیں کہیں بھی نظر نہ آیا"۔ان بیانات کا سبب خود اہلِ توحید کا تصورِ توحید ہے جو وہ آج تک مخالفین کے حلق سے نہ اتار سکے اور وہ ایسا کیونکر کر سکتے تھے جب کہ آج تک توحید خود انکے حلق سے بھی نہیں اتر پائی۔

اسم و معنی میں اتحاد

ہر وہ شے جو کسی کا تعارف کرائے اسکا اسم کہلاتی ہے۔اور اسم وہ واحد ذریعہ و وسیلہ ہے جسکے ذریعے معنی کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔اسم کی کئی اقسام ہیں۔ملفوظی۔مکتوبی۔ذہنی اور حقیقی۔جو اسم بولا جائے وہ ملفوظی ہے۔جو لکھا جائے وہ مکتوبی ہے۔جسکا تصور کیا جائے وہ ذہنی ہے اور جسکو پالیا جائے وہ حقیقی ہے۔مثلاً پانچ حروف ہیں جو کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں۔" ال ل ا ہ"۔اگر ان حروف کا مجموعہ یہ دعویٰ کرے کہ "میں اللہ ہوں"۔تو کیا پوری دنیا میں ایک بھی آدمی ایسا ہو سکتا ہے جو اسکے دعوے کو جھٹلا سکے؟۔کیونکہ ان حروف کا مجموعہ یقیناً "اللہ" ہی بنتا ہے۔تو کیا یہ شرک ہو گیا؟۔ہر گز نہیں۔اور بلا استثنٰی ایک شخص بھی نہ اسے شرک کہہ سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ معنی نہیں بلکہ اسم ہے اور اسم و معنی دونوں ایک ہی نام سے پکارے جاتے ہیں۔اسکے باوجود نہ معنی اسم بنتا ہے اور نہ اسم معنی بن جاتا ہے۔اتنی آسان سی

بات ہے جسے لوگ نہیں سمجھتے اور لفظوں کے ہیر پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ یہ جان لیجئے کہ اسم حقیقی کوئی موہوم شے نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک وجودِ خارجی رکھتا ہے۔ اور لفظی و مکتوبی اعتبار سے متحد ہونے کے باوجود اپنے معنی کا غیر ہوتا ہے۔ اسی لئے التوحید صفحہ ۴۵ حدیث ۱۶ میں امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں۔ ''اللہ اپنے اسماء کا غیر ہے۔ جتنے اسماء ہیں وہ اسکی طرف مضاف ہیں اور یہی توحیدِ خالص ہے''۔

ہر معنی کے لئے اسم کا وجود لازمی ہے اور بغیر اسم کے معنی کا کوئی تصور نہیں۔ اسم و معنی میں ایک گہرا اتحاد ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ معنی کا مکمل تعارف اسم ہی کے ذریعے ہوتا ہے لہٰذا جو نوعیت معنی کی ہوگی وہی اسم کی بھی ہوگی۔ معنی اگر حادث ہے تو اسم بھی حادث ہوگا اور معنی اگر قدیم ہے تو اسم بھی قدیم ہوگا۔ اسی لئے کوئی مختصر سے مختصر وقفہ بھی ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا جب معنی موجود ہو اور اسم موجود نہ ہو۔ خود انسان ہی کی مثال لے لیں۔ انسان کا نفس اسکا معنی اور اسکا جسم اسکا اسم ہوتا ہے اور یہ دونوں متحد ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اپنا اسم اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ بچپن میں جب اسکا معنی یعنی نفس ضعیف ہوتا ہے تو اسکا اسم یعنی جسم بھی ضعیف ہوتا ہے۔ جوانی میں جب اسکا معنی قوی ہو جاتا ہے تو اسکا جسم بھی قوی ہو جاتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اسکا معنی مضمحل ہو جاتا ہے تو اسکا جسم بھی مضمحل ہو جاتا ہے۔ جب وہ مرتا ہے تو جسم بھی اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ اس صورت

میں چونکہ معنی حادث و فانی تھا اس لئے یہی صفات اسکے اسم کی بھی تھیں۔ اسی سے سمجھئے کہ جو معنی قدیم ہواور لافانی ہو اسکا اسم بھی قدیم اور لافانی ہوگا۔ آپ اسکی بشری حیثیت پر قیاس نہ کریں کیونکہ بشریت اسکے لئے بمنزلۂ لباس ہوتی ہے جسے وہ جب چاہے پہن سکتا ہے اور جب چاہے اتار سکتا ہے جبکہ اسکی حقیقت ازلی و ابدی ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کبھی وہ قوی ہوجائے اور کبھی ضعیف۔ کبھی وہ عالم ہوجائے اور کبھی جاہل۔ کبھی وہ قادر ہوجائے اور کبھی عاجز۔ اس صورت میں وہ اس معنی کا اسم نہ رہے گا جوان امور سے منزہ ومبرا ہے۔

انسان کے معنی یعنی نفس کے تمام کمالات کا ظہور اسکے اسم یعنی جسم سے ہوتا ہے۔ اگر جسم نہ ہوتو کمالاتِ نفسانی کا ظہور ہو ہی نہیں سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کی شجاعت۔ سخاوت۔ حسن اور دیگر صفات کی تعریف کرتے ہیں تو عملی صورت یہ ہوتی ہے کہ اسکے نفس کا تصور ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں ہوتا بلکہ ہم اسکے جسم سے ہی مخاطب ہوتے ہیں اور اسی کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اسم کی تعریف حقیقتاً معنی ہی کی تعریف متصور ہوتی ہے۔ پس اسم ومعنی کے باہمی اتحاد کو سمجھئے کہ یہاں من وتو کی تمیز باقی نہیں رہتی اور ایک کی تعریف بعینہ دوسرے پر بھی صادق آتی ہے۔ لہٰذا جب ہم علیؑ سے مانگتے ہیں تو ہمارا مقصود اللہ ہوتا ہے اور جب ہم اللہ سے مانگتے ہیں تو ہمارا مقصود علیؑ ہوتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ علیؑ

اللہ کا ہاتھ ہے اور جس کسی کو بھی جو کچھ بھی ملے گا وہ ہاتھ ہی سے ملے گا۔ لہذا اسم و معنی میں فرق نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ انسان کو اس بات کا ادراک حاصل ہو کہ دونوں میں اسم کون ہے اور معنی کون ہے۔ اسم و معنی کو خلط ملط کرنا ہی شرک کو جنم دیتا ہے۔ لہذا جہاں ہم اسم کے خصائص بیان کریں گے تو وہاں گڑبڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ ثابت کیا جا چکا کہ اسم کی تعریف درحقیقت معنی ہی کی تعریف ہوتی ہے۔

دلیل علی التوحید

جو کچھ بیان کیا جا چکا اسکی روشنی میں یہ جان لینا چاہئے کہ وجودِ خدا کی واحد دلیل اسکا اسم ہے اور جو شخص اسکے اسم سے واقف نہیں یا اسکی معرفت نہیں رکھتا اسکے لئے توحید کو سمجھنا ممکن ہی نہیں۔ اس پر ایمان لانا تو بہت دور کی بات ہے۔ اسی لئے حضرت امیرؑ المومنین کا ارشاد ہے۔ ''اللہ تو وہ ہے کہ جسکے متعلق انبیاءؑ سے سوال کیا گیا تو انھوں نے بھی اسکے جسمانی حدود اور اعضا نہیں بیان کئے بلکہ اسکے افعال بیان کئے اور اسکی نشانیوں سے اس پر دلیل پیش کی''۔ (التوحید صفحہ ۲۹ حدیث ۱)۔

یہاں سب سے پہلے ''فعل'' کو جاننے کی ضرورت ہے۔ فعل کا مطلب ہے ''ایک حالت سے دوسری حالت میں آنا''۔ لہذا فعلیت کا اطلاق ذاتِ خداوندِ قدوس پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ جس طرح نفسِ انسان کی تمام قوتوں اور کمالات کا ظہور جسم سے ہوتا

ہے اسی طرح اللہ کے تمام افعال کا ظہور اسکے اسم سے ہوتا ہے جسے اس نے اپنے افعال کا امین بنایا ہے۔ لہٰذا جس جس فعل کو اللہ کیطرف منسوب کیا جاتا ہے ان تمام افعال کا فاعلِ حقیقی اسکا اسم ہوتا ہے اور اللہ کی ذات کیطرف ان افعال کی نسبت بطورِ مجازدی جاتی ہے۔ لہٰذا خالق حقیقی۔ رازق حقیقی۔ قہارِ حقیقی۔ غفارِ حقیقی اور منتقمِ حقیقی اللہ کا اسم ہے نہ کہ اسکی ذات۔ یہ اور بات ہے کہ ان تمام افعال کی نسبت اسکی ذات کی طرف دی جاتی ہے۔ اس بات کو حضرت امیرؑ المومنین اسطرح بیان فرماتے ہیں۔ ''میں اللہ کا ہاتھ ہوں۔ جو کچھ وہ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے۔ جو کچھ اس سے صادر ہوتا ہے میرے ذریعے ہوتا ہے۔ کرتا میں ہوں کہلاتا اسکا ہے''۔

ذات کیطرف نسبت دینے کا واحد مقصد اس پر ایمان لانا۔ اسکی معرفت حاصل کرنا اور اسکی عبادت کرنا ہوتا ہے کیونکہ جب تک ہم اسے کسی نام سے یاد نہ کریں اس وقت تک نہ اس پر ایمان لایا جاسکتا ہے اور نہ اسکی عبادت کی جاسکتی ہے۔ اسی لئے امام جعفر صادقؑ فرمایا۔ ''اگر اللہ نہ ہوتا تو ہم پہچانے نہ جاتے اور اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ نہ پہچانا جاتا''۔ (التوحید صفحہ ۲۴۴)

اسم کو مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آیات (نشانیاں)۔ وسیلہ اور حجاب وغیرہ جن پر ہم اپنے اپنے مقام پر گفتگو کریں گے لیکن یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر دلیل کو رد کر دیا جائے تو دعویٰ خود بہ خود مسترد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا چونکہ

ذاتِ خداوندی کی دلیل اسکا اسم ہے اسلئے اسکے اسم کو رد کرنے کا مطلب ذاتِ خدا کو رد کرنا ہوگا۔سورہٗ یوسف ۱۰۶ میں ارشادِ ربّ العزت ہو رہا ہے۔ ’’اور ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور وہ مشرک ہیں‘‘۔

اسکی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ’’یہی وہ لوگ ہیں جو اسکے اسماء میں بغیر علم الحاد کرتے ہیں اور ان اسماء کو انکے مقامات کے خلاف استعمال کرتے ہیں‘‘۔یعنی جب بھی اسم کو معنی سے الگ کرکے اسے جداگانہ طور پر سوچا جائے گا تو وہی الحاد کہلائے گا اور اسی کا نام شرک ہوگا۔پس معلوم ہوگیا کہ شرک ہو یا الحاد۔یہ اللہ کی ذات میں نہیں ہوتا بلکہ اسکے اسماء میں ہوتا ہے۔اسی مطلب کو اللہ نے سورہٗ اعراف ۱۸۰ میں یوں بیان فرمایا ہے۔ ’’اور اللہ تعالٰی کے اچھے اچھے نام ہیں پس اسے انہی سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اسکے ناموں میں الحاد کرتے ہیں‘‘۔

یعنی جو اسم کو چھوڑ کر براہ راست اللہ کو پکارتا ہے یا اسکے حقیقی اسماء کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ اسماء کے ذریعے اسے پکارتا ہے وہ ملحد ہے۔الحاد اسکے سوا کوئی چیز نہیں۔

اس آیت میں اللہ نے اپنے اسماء کا ذکر کیا ہے اور اسماء اسکی صفات کے نام ہیں۔لیکن ایک اسم ہمیں ایسا نظر آیا جو لاشریک ہے اور جسکو اللہ نے اپنا نفس قرار دیا ہے۔کوکب دری صفحہ ۱۴۱ پر رسولؐ اللہ کی دعا کا ایک جملہ درج ہے۔

’’پروردگار تجھے واسطہ ہے تیرے اس اسم کا جس سے تو نے اپنے نفس کو مسمّٰی کیا ہے اور کسی مخلوق کے لئے اسکو نہیں لکھا‘‘۔

یہاں ہم نے صرف اس اسم کا ذکر کیا ہے لیکن انشاء اللہ ہم بہت جلد یہ بھی ڈھونڈ نکالیں گے کہ وہ اسم کون ہے جو نفس اللہ بھی ہے اور لاشریک بھی۔ یہ بات بہرحال ذہن میں رہنا چاہئے کہ اللہ نے مختلف مقامات پر اپنے اسماء کا ذکر کیا ہے لیکن جہاں اس نے صیغۂ واحد استعمال کیا ہے یعنی ''اسم'' تو اس سے مراد یہی اسم ہے کیونکہ اللہ واحد اور جمع میں فرق کو جانتا ہے اس لئے کوئی تاویل اس مقام پر کام نہیں آئے گی۔

اس دعا سے یہ بات بھی ثابت ہورہی ہے کہ وہ اسم خود رسول اللہ بھی نہیں ہیں کیونکہ آنجناب اس اسم کا واسطہ دے رہے ہیں۔

اسمِ مکنون

اللہ کا وہ اسم چونکہ اسکا نفس ہے۔ اسکی توحید ہے۔ اسکی ہوئیت ہے۔ اسکی معبودیت ہے۔ اسکی مسجودیت ہے اور اسکی تمام صفات و افعال کا جامع ہے اس لئے اسکے لئے ماسویٰ اللہ کی عقول و اوہام سے ماوریٰ ہونا بھی لازمی ہے۔ وہ اگرچہ معرفتِ توحید کرانے کے لئے مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ کبھی آدمؑ کی صورت میں۔ کبھی نوحؑ کی صورت میں۔ کبھی ابراہیمؑ کی صورت میں۔ کبھی موسیٰؑ وعیسیٰؑ کی صورت میں۔ کبھی نورِ محمدیہ کی صورت میں اور کبھی ائمۂ طاہرین کی صورت میں لیکن اسکے باوجود اسکی حقیقتِ اصلیہ ہمیشہ الوہیت کے سراپردوں میں پوشیدہ رہتی ہے جسکا ادراک کرنا

اسی طرح محال رہتا ہے جیسے خود حضرت باری تعالیٰ کا ادراک کرنا۔اس لئے وہ خود ارشادفرماتا ہے۔''میں ہی ظاہر ہوں اور میں ہی باطن ہوں''۔یہی اللہ کا وہ اسمِ مکنون ہے جسکو اللہ نے ہمیشہ پوشیدہ رکھا اور یہی وہ اسمِ مکنون ہے جس نے فرمایا تھا۔''کنت کنزاً مخفیہ''۔اوراس بات کا کوئی بھی عقل انکارنہیں کرسکتی کہ اللہ ظاہر بظاہر نظر نہیں آسکتا لہٰذا پردۂ شہود پر آنے والا ہرگز اللہ نہیں ہوسکتا بلکہ یہ وہی اسمِ مکنون ہے جوظاہر ہوکر بھی باطن رہتا ہےاور باطن ہوکر بھی ظاہر رہتا ہے۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۹۵ پر جو دعا درج ہے اسکا ایک جملہ یہ ہے۔''پروردگار! میں تیرے اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جسے تو نے پردۂ غیب میں پوشیدہ رکھا اور وہ تیرے پاس محفوظ ہے۔وہ تیرے سوا کسی چیز کیطرف اپنا رخ نہیں کرتا۔(کیونکہ وہ وجہ اللہ ہے)''۔اسی لئے میرے مولاؑ نے ایک موقعے پر حضرت سلمانؓ سے فرمایا تھا۔''میرا ظاہر امامت ہےاور میرا باطن غیب ہے''۔

نہج الاسرار جلد ۲ صفحہ ۲۲۱ پر حضرت امیرؑ المومنین اور ابلیس ملعون کا ایک مکالمہ درج ہے جو اسی اسمِ مکنون سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہم آپ کی خدمت میں ہدیہ کرر ہے ہیں۔

''مروی ہے کہ ایک روز حضرت امیرؑ المومنین نے ابلیس سے پوچھا کہ''اے ابو حارث! قیامت کے روز کے لئے تو نے کیا زادِ آخرت جمع کیا ہے؟''۔ابلیس نے کہا۔''آپؑ کی محبت !۔جب قیامت کا دن آئے گا تو آپؑ کے ان ناموں کو جنکا

وصف کرنے سے ہر واصف عاجز و مجبور ہے اور جنھیں میں نے ذخیرہ کیا ہے نکالوں گا۔آپ کا وہ نام انسانوں سے مخفی ہے اور مجھ پر ظاہر ہے۔خدا نے اسکا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے کہ اسکو سوائے خدا کے اور انکے جو علم میں راسخ ہیں کوئی نہیں جانتا۔خداوندِ عالم جب کسی بندے کو پسند فرماتا ہے تو اسکی بصیرت سے پردوں کو اٹھا دیتا ہے اور اسکو اس علم کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بندہ اس راز کے ذریعے امت کی حقیقی آنکھ بن جاتا ہے۔ یہ وہی اسم ہے جسکے ذریعے زمین و آسمان قائم ہوئے اور یہی اسم جیسا چاہے تصرف کرتا ہے''۔

بات کو مکمل کرتے ہوئے ہم سورہٗ واقعہ کی آیات ۷۷۔۷۸ پیش کرتے ہیں جس میں اس اسمِ مکنون کا ذکر ہے۔''یقیناً وہ عزت والا قرآن ہے جو کتابِ مکنون میں ہے''۔

ہم نے کشف العقائد میں سورہٗ بقرہ کی آیت '' ذالك الكتٰب لاريب فيه '' پر ایک مختصر گفتگو کی تھی اور حضرت امیرؑ المومنین کا یہ فرمان پیش کیا تھا کہ ''انــــا ذٰلك الكتٰب لاريب فيه ''(میں ہوں وہ کتاب جس میں کوئی ریب نہیں)۔

سورہٗ واقعہ کی آیات میں اسی کتاب کو کتابِ مکنون کہا گیا ہے کہ قرآن جسکا جزو ہے اور اسی لئے اسے قرآنِ ناطق کہتے ہیں۔

حجاب

یہی وہ اسم ہے جو اللہ کا حجابِ اکبر ہے۔حجاب وسیلے کو کہتے ہیں اور یہی اسم وہ وسیلہ ہے

جس سے تمام فیوضِ باری تعالی اسکی مخلوق تک پہنچتے ہیں خواہ وہ فیوضِ تکوینی ہوں یا فیوضِ تشریعی ہوں یا فیوضِ تنزیلی۔ اللہ نے جتنے انبیاء نازل فرمائے وہ اسی وسیلے سے۔ جیسا کہ آنجنابؑ نے خود ارشاد فرمایا۔ ''میں نے تمام انبیاء کو مبعوث کیا''۔ اور ان انبیاء پر جتنی کتابیں اور صحیفے نازل کئے گئے تو وہ بھی اسی وسیلے سے۔ جس جس نبی نے اللہ سے کلام کیا تو اسی وسیلے سے خواہ وہ وحی کی شکل میں ہو یا الہام کی صورت میں ہو یا آواز کے ذریعے۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۳۱ پر ''قید سے رہائی کی دعا'' درج ہے جو جناب سیدۂ کونینؑ کی تعلیم کی ہوئی ہے۔ اس دعا کا ایک جملہ یہ ہے۔

''پروردگار! تجھے واسطہ ہے وحی کا۔ اور اسکا جس نے وحی کی۔ اور واسطہ ہے نبی کا۔ اور اسکا جس نے اسے نبی بنایا''۔

صحیفۂ زہراؑ کے صفحہ ۱۳۱ پر یہی دعا اس طرح منقول ہے۔

''پروردگار! تجھے واسطہ ہے عرش کا اور اسکو بلند کرنے والے کا۔ تجھے واسطہ ہے وحی کا اور وحی کے نازل کرنے والے کا۔ تجھے واسطہ ہے نبی کا اور اسے نبوت دینے والا کا۔ تجھے واسطہ ہے بیت اللہ کا اور اسکی بنیاد رکھنے والے کا''۔

اسی طرح پروردگارِ عالم سورہ شوریٰ کی آیت ۵۱ میں ارشاد فرماتا ہے۔ ''اور کسی بشر کے لئے یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالی اس سے کلام کرے سوائے وحی کے یا حجاب کے پیچھے سے یا کوئی رسول بھیجتا ہے پس وہ اسکی اجازت سے جو چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ

علی حکیم ہے''۔اگر اس بات کا انکار کیا گیا یا اس وسیلے سے چشم پوشی کی گئی تو پورا دین ہی منہدم ہو جائے گا کیونکہ دین کچھ ہے ہی نہیں سوائے وسیلے کے۔اور اگر اس وسیلے کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو توحید وعدل ونبوت وامامت وقیامت۔کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔امام علی رضاؑ فرماتے ہیں۔''جو اللہ کو اپنے وہم میں لایا تو وہم میں آئی ہوئی شے سے مراد اللہ نہیں ہے۔اللہ نے مخلوق کو اسطرح خلق کیا کہ اسکے درمیان اور مخلوق کے درمیان حجاب رہا''۔(التوحید صفحہ۳۱۔۳۲حدیث۲)۔

اس حدیث سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ کبھی بے حجاب رہا ہی نہیں اور روزِ ازل سے خالق ومخلوق کے درمیان یہ حجاب موجود رہا ہے۔لہٰذا جو کچھ ہوا وہ اس حجاب کی وساطت سے ہوا۔اس پر آپ جتنا بھی غور فرمائیں گے اتنا ہی حقیقت سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔اشارتاً عرض ہے کہ خلق کی ابتداء ایک نور سے ہوئی۔مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں یہ بات یقینی ہے کہ جب یہ نور خلق ہو رہا تھا تو حجاب اس وقت بھی موجود تھا۔پھر جیسے جیسے خلق کا عمل آگے بڑھتا گیا یہ حجاب حائل رہا۔مخلوق کو جو جو نعمات وفضائل ومناصب عطا ہوتے رہے تو اسی حجاب کے توسط سے۔میرا کام صرف اشارات دینا ہے۔غور وتدبر کرنا خود آپکا کام ہے ورنہ مقصدِ مطالعہ ہی فوت ہو جاتا ہے۔آپ اگر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں تو جو شے انسان کو قبولِ حقائق سے روکتی ہے اور اس میں ضد۔ہٹ دھرمی اور عناد کو پروان چڑھاتی ہے وہ معاشرے کا خوف۔

اکثریت کی محبت اور وہ نظریات وعقائد ہوتے ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے لوگوں تک پہنچتے ہیں اور ذہن پر اسطرح مسلط ہو جاتے ہیں جیسے پتھر پر لکیر اور ان نظریات وعقائد سے انحراف کو انسان اپنی اور اپنے آباءواجداد کی شکست سمجھتا ہے۔

جہاں بھی عقل وتدبر کی کونپلیں پھوٹیں

وہیں عقیدوں نے ذہنوں کو یرغمال کیا

اسطرح اب بات شرفِ انسانیت کی نہیں بلکہ انانیت کی ہو جاتی ہے۔حقیقت تک انسان اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ ان تمام دیواروں کو گرا دے اور اپنا رخ اس طرف کرلے جہاں سے حقیقتیں تقسیم ہوتی ہیں۔اور جب وہ ایسا کرلے تو حقیقتیں خود چل کر اسکے پاس آتی ہیں۔اس کتاب میں بہت سی باتیں ایسی آئیں گی جو آبائی عقائد و روایات اور انانیت کے خلاف ہونگی لیکن کسی بھی شے کو اگر ذہنی تحفظات (pre-determined ideas) کے ساتھ پڑھایا سنا جائے تو وہ شے کبھی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ آپ اور ہم جس دین پر ہیں اور جو مذہب ہم نے اختیار کر رکھا ہے وہ ہم نے اپنے گھر میں بیٹھ کر نہیں بنایا۔بلکہ ہمارا مذہب وہی ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہو۔پس جو شے قرآن وحدیث سے ثابت ہو جائے اس پر ناک بھوں نہیں چڑھایا کرتے بلکہ شرفِ انسانیت اسی میں ہے کہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے چاہے آبائی عقائد پر ضرب ہی کیوں نہ پڑتی ہو اور

چاہے پوری دنیا مخالفت پر ہی کیوں نہ اتر آئے لیکن مخلوق کے خوف کی وجہ سے خالق کے ساتھ خیانت نہیں کی جاسکتی۔

التوحید صفحہ ۴۴ حدیث ۳۔حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔"وہ اپنی قدرت کی وجہ سے اشیاء سے جداگانہ ہے۔اسکے غیبِ مکنون کے آگے غیب کے حجابات حائل ہیں۔بلند پایہ عقول امورِ لطیفہ میں سے قریب ترین امور میں سرگشتہ ہیں"۔

اس حدیث میں سب سے پہلے جو بات نظر میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ اپنی مخلوق سے جدا ہے۔جیسا کہ اصولِ کافی میں امامؑ فرماتے ہیں۔"وہ شے ہے مگر اشیاء سے جدا"۔لیکن یہ بات ثابت کیسے ہو کہ وہ اشیاء سے جدا ہے۔آپ اس سے قبل پڑھ چکے کہ"قدرتِ خدا" سے مراد حضرت امیرؑ المومنین ہیں اور اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ اللہ اپنی قدرت کی وجہ سے اشیاء سے جداگانہ ہے۔یعنی قدرت وہ شے ہے جو اللہ کو اسکی مخلوق سے جدا کر کے ممتاز کرتی ہے۔پس اگر اللہ کو"شے" ماننا ہے تو علیؑ وہ واحد وسیلہ ہے جسکے ذریعے اللہ کو"شے" کہا جاسکتا ہے اور اگر علیؑ کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو یا تو وہ عام اشیاء جیسا ہو جائے گا (یعنی وہ خیالی خدا ہوگا حقیقی نہیں) یا پھر (معاذ اللہ)"لاشے" ہو جائے گا۔پس توحید علیؑ ہی کا دوسرا نام ہے کہ علیؑ کو وسیلہ مان کر ہی انسان موحد بن سکتا ہے۔

اسکے بعد ارشاد ہوتا ہے۔"اسکے غیبِ مکنون (یعنی ذاتِ امیرؑ المومنین) کے آگے غیب کے حجابات حائل ہیں"۔یعنی علیؑ تک پہنچنے کے لئے پہلے کئی حجابات سے گزرنا پڑتا

ہے۔میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان حجابات کا ایک اجمالی تعارف آپ سے کراؤں۔آپ خود پہچانئے کہ یہ حجابات کون ہیں۔

ا۔کتب احادیث میں تواتر کے ساتھ یہ بات آئی ہے کہ جب حضرت ختمی مرتبتؐ معراج پر تشریف لے گئے اور سدرۃ المنتہا سے نکل کر برزخِ کبریٰ میں داخل ہوئے تو انھیں آخری حجاب (اسمِ مکنون۔غیبِ مکنون) تک پہنچنے سے پہلے گیارہ حجابات سے گزارا گیا۔

۲۔عمدۃ المطالب جلد۲صفحہ۲۰۹۔۲۱۰۔"عیون المجالس میں انس بن مالک سے مروی ہے کہ (مکہ سے رخصت ہوتے وقت) میں امام حسینؑ کے ساتھ چل رہا تھا۔آپؑ جناب خدیجہؑ کی قبر پر تشریف لائے اور رو پڑے۔مجھے فرمایا کہ تم چلے جاؤ۔میں جا کر چھپ گیا۔آپؑ نے نماز پڑھنے میں طول دیا اور میں نے آپؑ کو فرماتے ہوئے سنا۔"اے بلندیوں والے! تجھ پر میرا بھروسہ ہے۔اسکے لئے خوشخبری ہے جس کا تو مولا ہے۔جب وہ اپنے دکھ اور تکلیف کی شکایت کرتا ہے تو پھر اللہ اسے جواب دیتا ہے اور لبیک کہتا ہے"۔جب امام مظلومؑ نے یہ کلمات ادا کئے تو آواز آئی۔"میں حاضر ہوں۔میں حاضر ہوں۔تم میرے سائے میں ہو۔جو بات تم نے کہی میں اسکو جانتا ہوں۔تیری آواز کے میرے فرشتے مشتاق ہیں۔بس تیری آواز کافی ہے۔ہم نے اسے سن لیا ہے۔تیری دعا میرے نزدیک حجابات میں گردش کر رہی ہے۔پس تجھے

وہ حجاب کافی ہے جسے میں نے ڈال دیا ہے۔(اس سے مراد ہمارے امام زمانہؑ ہیں)۔جب تیری محبت کی ہوا اسکے پہلو میں مچلتی ہے تو وہ غش کھا کر گر پڑتا ہے''۔

مجھے یقین ہے کہ ایک بھی مومن ایسا نہ ہوگا جس نے ان حجابات کو پہچان نہ لیا ہو۔ ہمارا سلام ہو ان سب پر۔

اب ہم حدیث کے آخری ٹکڑے کیطرف آتے ہیں۔مولاؑ فرماتے ہیں کہ یہ امور یعنی حجابات کی معرفت نہایت باریک و عمیق ہیں اور عقولِ انسانی کی انتہاء یہ ہے کہ انکے نزدیک ترین مقامات کو تلاش کرے۔اور ان حجابات کا وہ رخ جو بلند پایہ عقول سے نزدیک ترین ہے وہ انکی ہیئت بشریہ ہے۔انسانی عقل ابھی تک انکی بشریت کو سمجھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے لیکن ہزار کوشش کے باوجود اسکی حقیقتوں تک نہیں پہنچ پائی۔جب اپنی تمام تر صلاحیتوں اور توانائیوں کے باوجود ابھی تک انسان کو ''انـــــا بشـــر'' مثلکم '' کی حقیقت سمجھ میں نہ آئی تو پھر ''میرا ظاہر امامت ہے'' تک وہ کیسے پہنچے گی اور اس سے بڑھ کر ''میرا باطن غیب ہے'' کا تصور کیسے کرسکتی ہے؟۔اگر عقل کی اس بے مائیگی اور بے چارگی کے باوجود کوئی ان حجابات کے مقابلے میں آتا ہے اور انکی برابری کا دعویٰ کرتا ہے تو یقیناً وہ عقل سے محروم اور مقامِ انسانیت سے مایوس ہے۔

التوحید صفحہ ۷۳ حدیث ۵ میں حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''وہ اپنے نور کی وجہ سے حجاب میں رہا''۔

یہ ایک عجیب وغریب جملہ ہے اور صرف لسان اللہ سے ہی صادر ہوسکتا ہے۔ نور مقامِ ظہور ہے جو خفی یعنی پوشیدہ رہنے کی ضد ہے۔ جب چھپے گا تو ظاہر نہ رہے گا اور جب ظاہر ہوگا تو پوشیدگی ختم ہو جائے گی لیکن اللہ کی ذات وہ ہے جو اپنی پوشیدگی کو اپنے ظہور کے ذریعے ثابت کرتا ہے کیونکہ اگر پوشیدہ رہے تو کوئی اسکا اقرار نہ کرسکے گا اور اگر ظاہر ہو جائے تو پھر وہ، وہ نہ رہے گا۔ پس اس نے اپنے حجاب کو ظاہر کیا۔ اسکے ظہور کی وجہ سے وہ پوشیدہ رہتے ہوئے بھی پہچانا گیا اور مخلوق چیخ اٹھی کہ ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اور اسی ظہور سے اسکی پوشیدگی بھی ثابت ہوگئی اور دنیا نے جان لیا کہ آنکھیں اسکا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کو ادراک کرتا ہے جیسا کہ آنے والی حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

التوحید صفحہ ۴۱ حدیث ۱۳۔ جناب امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''نگاہیں اسکے جبروت کی بزرگی کو نہیں پاسکتیں اس لئے کہ اس نے ان نگاہوں کو حجابات میں چھپا دیا ہے جو حجابات کی کثافت کی موٹائی اور سختی سے نہیں گزر سکتیں اور اسکے حجابات کی خاصیتوں کی مضبوطی کو صاحبِ عرش کیطرف جانے کے لئے پھاڑ نہیں سکتیں۔ اللہ وہ ذات ہے کہ جسکی مشیت سے امور صادر ہوتے ہیں''۔

اس حدیث کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان میں یہ طاقت ہے ہی نہیں کہ ان حجابات سے گز رسکے یا انکے اندر جھانک کر دیکھ سکے۔ جو لوگ اشیاء عالم کو دیکھ کر اللہ کا ادراک کرنا چاہتے ہیں وہ اپنی حماقت میں گرفتار ہیں کیونکہ یہ تمام امور یعنی خلقتِ کون و مکاں اللہ سے نہیں بلکہ اللہ کی مشیت سے صادر ہوئے ہیں اور انسانی عقل کی انتہاء یہ ہے کہ وہ اسے مشیتِ خدا کا تصور کرادے کیونکہ وہی خالقِ **کل** ہے۔ اسی لئے غالبؒ نے فرمایا ہے۔

کہہ سکے کون کہ یاں جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

ذوالجلالِ والاِکرام

رحمٰن ۲۷۔ ''وَ یبقیٰ وجہُ رَبّکَ ذو الجللِ والاِکرام''۔
رحمٰن ۷۸۔ ''تبٰرکَ اِسمُ ربّکَ ذی الجلٰل والاِکرام''۔

ان آیات کا ترجمہ ہم نے دانستہ طور پر نقل نہیں کیا کیونکہ مترجمین اوّل تو صاحبانِ معرفت نہیں ہوتے۔ دوئم یہ کہ انھیں اپنوں اور پرایوں کا خوف کھائے جاتا ہے۔ بلکہ ہم عربی گرامر کی رو سے ان آیات کا جائزہ لیں گے اور پھر انکا صحیح ترجمہ خود بہ خود سامنے آجائے گا۔ لیکن بہر حال وہ احباب جن سے فضائلِ علیؑ برداشت نہیں ہوتے انھیں میں مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی سانسیں درست کرلیں۔

مرکّبِ اضافی

مرکّب اضافی اس مرکّب لفظ کو کہتے ہیں جو دو اسموں سے مل کر بنا ہو اور ان دونوں اسموں کو اضافت یعنی زبر۔ زیر یا پیش کے ذریعے ایک دوسرے سے ملایا گیا ہو۔ مثلاً ''کتابُ زیدٍ'' (زید کی کتاب)۔ ایسے مرکب لفظ کا پہلا جزو ''مضاف'' اور دوسرا جزو ''مضاف الیہ'' کہلاتا ہے۔ مثلاً ''کتابُ زیدٍ'' میں کتاب مضاف اور زید مضاف الیہ ہے۔ عربی گرامر کا اصول یہ ہے کہ چونکہ مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان کوئی اور لفظ نہیں آتا اس لئے مضاف کی صفت ہمیشہ مضاف الیہ کے بعد آتی ہے۔ مثلاً ''وَلَدُ الرَّجُلِ الصَّالِح ''۔ اس میں ''وَلَدُ'' (یعنی لڑکا) مضاف ہے۔ ''الرجل'' (یعنی مرد) مضاف الیہ ہے اور ''الصالح'' صفت ہے۔ پس عربی گرامر کی رو سے اس صفت یعنی ''الصالح'' کا تعلق مضاف یعنی ''وَلَدُ'' سے ہوگا نہ کہ مضاف الیہ یعنی ''الرجل'' سے۔ اور اسکا ترجمہ ہوگا ''مرد کا نیک لڑکا''۔ اسی بات کی ایک مثال ہم خود قرآن مجید سے پیش کرتے ہیں جہاں سورۂ نجم کی آیت ۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''لقد رأ ی من آ یات ربه الکبری''۔ ترجمہ ''یقیناً اس (رسولؐ) نے (شبِ معراج) اپنے پروردگار کی سب سے بڑی نشانیوں (آیات) میں سے کچھ کو دیکھا''۔

اس جملے میں ''آیات'' مضاف ہے۔ ''ربہ'' مضاف الیہ ہے اور ''الکبریٰ''

صفت ۔پس اس صفت کا تعلق مضاف یعنی آیات سے ہے نہ کہ مضاف الیہ یعنی ''ربہ'' سے۔

اس اصول کی روشنی میں ہم مندرجہ بالا آیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی آیت میں :۔

''وجہ'' مضاف ہے۔

''ربک'' مضاف الیہ ہے۔

''ذو الجلٰلِ والاِکرام'' صفت ہے۔

پس اس صفت یعنی ''ذو الجلٰلِ والاِکرام'' کا تعلق مضاف یعنی ''وجہ'' سے ہوگا نہ کہ مضاف الیہ یعنی ''ربک'' سے۔اور اب اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ ''اور باقی رہے گا تیرے رب کا وہ چہرہ جو ذو الجلٰلِ والاِکرام (بڑی شان اور بڑی عزت والا) ہے۔

دوسری آیت میں :۔

اسم مضاف ہے۔

ربک مضاف الیہ ہے۔

ذی الجلٰلِ والاِکرام صفت ہے۔

لہٰذا اس صفت یعنی ذی الجلٰلِ والاِکرام کا تعلق مضاف یعنی اسم سے ہوگا نہ کہ مضاف الیہ یعنی ربک سے اور اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔

''برکت والا ہے تیرے رب کا وہ اسم جو ذی الجلٰلِ والاِ کرام ہے۔

اسکی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔''خدا نے فرمایا ہے کہ تمھارے رب کا اسم مبارک ہے جو صاحبِ جلال واکرام ہے۔پس ہم ہیں جلالِ خدا اور کرامتِ خدا جنکی اطاعت کی وجہ سے خداوند عالم نے بندوں کو عزت بخشی ہے''۔(صحیفۂ سادات صفحہ ۵۸ بحوالہ تفسیرِ البرہان)۔

اب اگر کوئی عارفِ مستبصر علیؑ کو''ذوالجلال والاکرام'' کہہ دے تو مقصرِ کم ظرف تو شاید خون تھوکنے لگے۔حالانکہ جب اسے رزق یا اولاد کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بہت لہک لہک کر دعاؤں کو منتر سمجھ کر پڑھتا ہے اور کبھی یہ نہیں سوچتا کہ وہ زبان سے کونسے الفاظ ادا کر رہا ہے اور ان الفاظ کے معنی کیا ہیں۔یہاں ہم مفاتیح الجنان سے کچھ دعاؤں کے فقرے نقل کر رہے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ یہ''ذوالجلال و الاکرام'' کون ہے اور اسکے بعد بھی اگر کسی شخص کو اعتراض ہوتا ہے تو اسے چاہئے کہ مفاتیح الجنان پڑھنا چھوڑ دے یا اسے دریا برد کردے یا اسے زمین میں دفن کردے۔ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ علیؑ کی دشمنی میں کس کس چیز کا انکار کیا جاتا ہے۔

۱۔مفاتیح الجنان صفحہ ۱۵۴۔(دعائے سمات)۔

''وَبِجَلالِ وَجہِکَ الکریم الاکرم......الخ''۔

ترجمہ:۔''پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تیرے چہرے کے جلال کے ذریعے جو نہ

صرف یہ کہ عزت والا ہے بلکہ جتنے بھی عزت والے ہیں ان سب سے بڑا عزت والا ہے''۔

یہاں کون ہے ذوالجلال اور کون ہے ذوالاکرام؟۔وہی وجہ اللہ جو باقی رہنے والا ہے!

۲۔مفاتیح الجنان صفحہ ۹۵۔''پروردگار! میں تیرے اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جسے تو نے پردہ غیب میں پوشیدہ رکھا کہ تیرے پاس محفوظ ہے۔وہ تیرے سوا کسی چیز کیطرف اپنا رخ نہیں کرتا۔میں اسی اسم کے ذریعے۔اور تیرے ذریعے اور اسی کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جو تیرے اسماء میں اجلّ واشرف ہے''۔

یہ ''اجلّ'' اور ''اشرف'' کون ہے؟۔وہی اسم جو برکت والا ہے!

۳۔مفاتیح الجنان صفحہ ۱۵۶۔''بِاِسمِكَ العظیم الاَعظم الاَعزّ الاَجلّ الاَکرم''۔

ترجمہ:۔''(پروردگار! میں سوال کرتا ہوں) تیرے اس اسم کے واسطے سے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی۔عزت والا اور اجلّ واکرم ہے''۔

یہاں اجلّ واکرم کون ہے؟۔وہی اسم جو برکت والا ہے!

۴۔مفاتیح الجنان صفحہ ۳۶۰۔''اَعُوذُ بِجَلالِ وجہِكَ الکریم''۔

ترجمہ:۔''میں تیرے کریم چہرے کے جلال کے ذریعے پناہ چاہتا ہوں''۔

یہاں ذوالجلال والاکرام کون ہے؟۔وہی چہرہ جو باقی رہنے والا ہے!

اور کیونکر کریم نہ ہو وہ چہرہ جسکے اکرام کے نہ صرف اپنے بلکہ اغیار بھی قائل ہوں؟۔اگر قائل نہ ہوتے تو اسکے نام کے ساتھ ''کرم اللہ وجہہ'' کیوں لگاتے؟۔یہ الگ بات ہے کہ وہ اسکی توجیہ کچھ اور کریں اور بھولے شیعہ بھی انکے ہم نوا بن جائیں کہ علیؑ کو کرم اللہ وجہہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا تھا۔جاننا چاہئے کہ اس زمانے میں اور بھی بہت سے لوگ ایسے موجود تھے جنھوں نے کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ایک پورا گروہ ایسا تھا جو دینِ ابراہیمی پر تھا اور موحد تھا اور حضرت ابوذرؓ جسکے ایک فرد تھے۔خود حضرت سلمانؓ نے بھی کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا تھا۔پھر ان لوگوں کے نام کے ساتھ کرم اللہ وجہہ کیوں نہیں لگایا جاتا؟۔یہ سبب ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی قدرتِ قاہرہ ہے جس نے لوگوں کی گردنوں کو پکڑ کر ان سے کرم اللہ وجہہ کہلوایا ہے تاکہ اسکے چہرے کے اکرام کا اعلان ہو سکے۔

اور کیونکر کریم نہ ہو وہ چہرہ جسکے اکرام کا دوست تو دوست بلکہ دشمن بھی اعتراف کرتے ہوں؟۔عمرو بن عبدود جب جنگِ خندق میں حضرت امیرؑ المومنین کے مقابلے میں آیا تھا تو وہ انتہائی قیمتی زرہ اور زیورات پہنے ہوئے تھا اور اسکی تلوار میں اسقدر قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے کہ پورا عرب اسے للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتا تھا۔لیکن جب وہ قتل ہو گیا اور اسکی بہن اسکی لاش پر آئی تو دیکھا کہ ان قیمتی چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی ہاتھ تک نہیں لگایا گیا اور وہ جوں کی توں موجود ہیں۔اس وقت اس نے کہا۔''اے بھائی! اگر تیرا قاتل کوئی اور ہوتا تو میں زندگی بھر تیرا ماتم کرتی۔لیکن اب میں تجھ پر نہیں

روؤں گی کیونکہ تجھے کسی کریم نے قتل کیا ہے''۔

ہم نے مضاف۔مضاف الیہ اور صفت کا جو اصول بیان کیا ہے اسکو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ قرآن کا مطالعہ فرمایئے اور اپنے مولاؑ کی شان کا مشاہدہ کیجئے۔ اس کتاب میں آئندہ جب ایسے مضامین آئیں گے تو ہمیں وضاحت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

عظمت

ہمارے یہاں عربی زبان کی جو مشہور لغات ملتی ہیں ان میں الفاظ کے عمومی معنی پائے جاتے ہیں اور انکی خصوصیت کا خیال نہیں رکھا جاتا جسکی وجہ سے تفہیم قرآن وحدیث میں بڑی مشکلات درپیش آتی ہیں۔مثلاً حمد۔مدح۔مدحت۔ثناء۔توصیف۔ان تمام الفاظ کے معنی ''تعریف'' ملتے ہیں۔حالانکہ یہ مختلف الفاظ ہیں اور انکے معنی بھی مختلف ہیں۔یہی صورت لفظِ ''عظمت'' کی بھی ہے۔اسکے معنی ''بزرگی'' بتائے جاتے ہیں جو ایک انتہائی مجمل لفظ ہے اور اسکو پڑھ کر لفظِ عظمت کا صحیح مفہوم ذہن میں نہیں آسکتا۔ عظمت دراصل اس بزرگی اور بڑائی کو کہتے ہیں جسکے سامنے قہری طور پر گردنیں جھک جائیں۔اسی لئے ہم جب رکوع میں جھکتے ہیں تو ''سبحان ربی العظیم'' کہتے ہیں۔اسی سے عظمتِ خدا کا امکانی تصور کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا ہوگی کہ عظمتِ خدا اسکے اسم سے ظاہر ہوتی ہے اور وہی علی العظیم ہے۔چنانچہ نہج

الاسرار جلد ۱صفحہ ۹۰ پر حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''محمدؐ رؤف و رحیم ہے اور میں علی العظیم ہوں''۔ اسکی عظمت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا نہ صرف کائنات کے ذرے ذرے پر بلکہ تمام انبیاءو اولیاءو اوصیاء۔ یہاں تک کہ حضرت ختمی مرتبتؐ تک پر واجب ہے۔ اصولِ کافی۔ کتاب حجت۔ باب ۱۲۴۔ حدیث ۳ میں جابرؓ ابن عبداللہ انصاری سے روایات ہے کہ ''میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں حیاتِ رسولؐ میں جناب فاطمہؑ کی خدمت میں حاضر ہوا امام حسینؑ کی ولادت کی مبارک باد دینے کے لئے۔ میں نے انؑ کے ہاتھ میں ایک سبز لوح دیکھی۔ اس پر سورج کیطرح روشن ایک تحریر تھی۔ میں نے کہا۔ ''اے بنتِ رسولؐ! یہ لوح کیا ہے؟''۔ فرمایا۔ ''یہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے پاس بھیجی ہے''۔ اس کی تحریر کا ایک جملہ یہ تھا۔ ''اے محمدؐ! میرے اسماء کی تعظیم کرو اور میری نعمتوں کا شکر ادا کرو''۔

اور حضرتؑ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپؑ نے نہ صرف عظمتِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا بلکہ اس عظمت کا مشاہدہ کیا جو کوئی اور نبی نہ کر سکا جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ التوحید صفحہ ۸۳ حدیث ۲ میں امام حسن عسکریؑ کی ایک توقیعِ مبارک درج ہے جسکا ایک جملہ یہ ہے۔ ''بیشک اللہ نے اپنے رسولؐ کے قلب کو اپنے نورِ عظمت میں سے جو پسند کیا دکھایا''۔ اسی کتاب کے صفحہ ۸۶ حدیث ۹ میں آنحضرتؐ کا اپنا فرمان موجود ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں۔ ''اللہ نے اپنے نورِ عظمت میں سے

جتنا چاہا مجھ کو دکھایا''۔اس سے اللہ کے نورِ عظمت کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے حضرت ختمی مرتبت کو بھی اپنے عظمت کے نور کا کُلّی نہیں بلکہ جزئی مشاہدہ کرایا۔

اسی عظمتِ الٰہیہ کا ہم اپنی استطاعت کے مطابق ذکر کرنے جارہے ہیں لہٰذا شک اور تذبذب سے اللہ کی پناہ مانگئے اور اپنے دلوں کو اسماءِ خداوندی کی تعظیم کے لئے جھکا دیجئے۔جیسا کہ نور ۳۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔''یہ نوران گھروں میں ہے جنکے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ انکی تعظیم کی جائے اور ان میں اسکے اسم کا ذکر کیا جائے''۔

اسمِ اعظم

ادعیہ و زیارات جو کتبِ معتبرہ میں منقول ہیں وہ خود ائمہ معصومینؑ کی تعلیم کردہ ہیں لہٰذا بابِ عقائد میں ہمارے لئے سند ہیں۔علامہ عباس قمی شیعہ دنیا میں ایک بڑا نام ہے اور انکی کتاب مفاتیح الجنان ہر شیعہ گھر میں موجود ہے جس میں درج دعاؤں اور زیارات کو شیعہ حضرات بڑی عقیدت اور کثرت سے پڑھتے ہیں لہٰذا جب ہم اسی کتاب سے اللہ کے اسم کے مقامات کی نشاندہی کریں تو کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ کوئی حرفِ اعتراض زبان پر لائے کیونکہ طالبِ رزق واولاد و ردِّ بلا کے لئے وہ انہی دعاؤں کو بہت خضوع و خشوع سے پڑھتے ہیں لہٰذا ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ ان ہی دعاؤں میں اگر علیؑ کا تذکرہ نکل آئے تو لوگ سارا خضوع و خشوع بھول کر پتھر مارنے میں

مشغول ہو جائیں۔

ان دعاؤں اور زیارات میں اللہ کے اسم کی عظمت کا تعارف بڑے لطیف وجمیل پیرائے میں کرایا گیا ہے جسکا ذکر انشاء اللہ آئندہ اوراق میں آتا رہے گا۔ یہاں ہم اللہ کے اسمِ اعظم کے بارے میں ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں لیکن سب سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہ جان لیں کہ وہ اسمِ اعظم کون ہے۔

۱۔ نہج الاسرار جلد ۱۔ حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہوں جو اعظم و اعلیٰ ہے''۔

اسمِ اعظم کے بارے میں تو ہم بات کر ہی رہے ہیں لیکن اس حدیث میں آنجنابؑ نے خود کو ''اسمِ اعلیٰ'' بھی فرمایا ہے جسکی توثیق خود خداوندِ قدوس اپنے کلام میں یوں فرماتا ہے۔

سورۂ اعلیٰ ۱ تا ۳۔ ''سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ...... الخ''۔

ترجمہ:۔ ''(اے رسولؐ!) تو اپنے رب کے اس اسم کی تسبیح کرتا رہ جو اعلیٰ ہے''۔

۲۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۳۹۵۔ ''ایک مرتبہ حضرت امیرؑ المومنین ایک راستے سے گزر رہے تھے اور ایک خیبری (یہودی) آپؑ کے ہمراہ تھا۔ پس دونوں کا گزر ایک وادی سے ہوا جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ خیبری نے اپنی سواری پر سوار ہو کر کچھ پڑھا اور پانی پر سے گزر گیا اور پلٹ کر حضرتؑ کو آواز دی ''اے شخص اگر تو بھی جانتا ہے جو میں جانتا ہوں تو تو بھی پانی پر سے گزر جا جیسا کہ میں گزر گیا۔ حضرتؑ نے پانی کی طرف اشارہ

فرمایا اور وہ جم گیا اور آپؑ اس پر سے گزر گئے۔ جب خیبری نے دیکھا تو اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''اے جوان! تو نے کیا کہا کہ پانی جم کر پتھر بن گیا؟''۔ آپؑ نے اس سے پوچھا۔ ''تو نے کیا کہا تھا کہ پانی پر سے گزر سکا؟''۔ اس نے جواب دیا کہ ''میں نے اللہ کو اسکے اسم اعظم کے ساتھ پکارا تھا''۔ آپؑ نے پوچھا۔ ''وہ اسمِ اعظم کیا تھا؟''۔ اس نے جواب دیا کہ ''میں نے محمدؐ اعظم کے وصی کے نام کے ساتھ خدا سے سوال کیا تھا''۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''محمدؐ کا وہ وصی میں ہی ہوں''۔

آپ کے جذبۂ محبت کی تقویت کے لئے ہم من لا یحضرہ الفقیہ (اردو) جلد۲ صفحہ۱۳۰ سے اس دعا کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جو حج کے موقعے پر طوافِ کعبہ کرتے ہوئے پڑھی جاتی ہے۔ معصومؑ فرماتے ہیں کہ حالتِ طواف میں یہ کہو:۔

''اے اللہ میں تیرے اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جس سے سطحِ آب پر بھی اسی طرح چلا جا سکتا ہے جسطرح سطحِ زمین پر چلا جاتا ہے اور میں تیرے اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جو تیرے پاس تیرے خزانے میں پوشیدہ ہے اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے واسطے سے جو اعظم۔ اعظم الاعظم۔ اعظم الاعظم الاعظم ہے''۔

آپ نے پہچان لیا کہ اللہ کا اسمِ اعظم کون ہے۔ اور اب ہم مفاتیح الجنان سے چند دعاؤں کے کلمات نقل کرتے ہیں:۔

ا۔ صفحہ۱۰۷۔ ''اے معبود! بیشک میں تیرے عرش کے مقامات بلند۔ تیری کتاب کی

انتہائے رحمت اور تیرے اسم اعظم اور تیرے کامل کلمات جو صدق و عدل میں پورے ہیں انکے واسطے سے سوال کرتا ہوں"۔

۲۔صفحہ ۱۴۵۔"پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تیرے حق۔اور تیری صفات و اسماء میں جو اعظم ہے اسکے واسطے سے"۔

۳۔صفحہ ۱۵۴۔"اے معبود! میں سوال کرتا ہوں تیرے اسم کے ذریعے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی۔کہ جب آسمان کے بند دروازے کھولنے کے لئے تجھے اس اسم سے پکاریں تو وہ کھل جائیں اور جب زمین کے تنگ راستے کھولنے کیلئے تجھے اس اسم سے پکارا جائے تو وہ کشادہ ہوجائیں اور جب سختی کے وقت آسانی کے لئے اس اسم سے پکاریں تو آسانی ہوجائے اور جب مردوں کو اٹھانے کے لئے تجھے اس اسم سے پکاریں تو وہ اٹھ کھڑے ہوں۔اور سوال کرتا ہوں تیرے چہرے کے جلال کے ذریعے جو کریم بھی ہے اور اکرم بھی۔سب سے معزز ذات کہ جسکے آگے چہرے جھکتے ہیں اور اسکے سامنے گردنیں خم ہوتی ہیں اسکے حضور آوازیں کانپتی ہیں اور دل خوفزدہ ہوجاتے ہیں۔اے اللہ! تیری عظمت کے واسطے سے جس کے ذریعے سے تو نے اپنے بندے اور رسول حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا"۔

۴۔صفحہ ۱۵۶۔"پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے واسطے سے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی۔بلند و برتر۔عزت والا۔اجل و اکرم۔اور تیری شان کے

واسطے سے جس کے ذریعے تو نے تجلی فرمائی اپنے کلیم موسیٰ کے لئے طورِ سینا میں اور اس سے پہلے اپنے خلیل ابراہیم کے لئے مسجدِ خیف میں اور اپنے برگزیدہ اسحاقؑ کے لئے چاہِ شعیر میں اور اپنے نبی یعقوبؑ کے لئے بیت ایل میں۔ اور تیری اس شان کے واسطے سے جو قبہ رمان پر حضرت موسیٰ کے لئے ظاہر ہوئی۔ تیری شان وعزت اور غلبے میں عزت والی نشانیوں سے اور غالب سلطان سے۔ قدرت کی بلندی اور تیرے کلمۂ تامہ کی شان سے اور تیرے ان کلمات سے جنکے ذریعے تو نے آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں اور اہلِ دنیا اور اہلِ آخرت پر احسان کیا۔ میں سوال کرتا ہوں تیرے نور کے واسطے سے جسکے خوف سے طورِ سینا چکنا چور ہوا۔ اور تیرے علم و جلالت۔ تیری بڑائی اور عزت اور تیرے جبروت کے واسطے سے جسکو زمین برداشت نہ کرسکی اور آسمان عاجز ہوگیا اور اس سے زمین کی گہرائیاں کپکپا گئیں۔ جسکے آگے سمندر اور نہریں رک گئے۔ پہاڑ اسکے لئے جھک پڑے اور زمین اسکے لئے اپنے قدموں پر رک گئی۔ اسکے سامنے ساری ہی مخلوق سرنگوں ہوگئی۔ اپنے راستوں پر چلتی ہوئی ہوائیں اسکے سامنے پریشان ہوگئیں۔ میں سوال کرتا ہوں تیرے سلطان کے واسطے سے جسکے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ تیرے غلبے کی پہچان ہوتی ہے اور آسمانوں اور زمین میں اس سے تیری حمد ہوتی ہے"۔

۵۔ صفحہ ۶۴۷۔ "اے معبود! میں سوال کرتا ہوں تیرے تمام اسماء کے واسطے سے جن کا

ہمیں علم ہے اور جنکا ہمیں علم نہیں۔اور سوال کرتا ہوں تجھ سے تیرے اس اسم کے واسطے سے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی۔کبیر بھی ہے اور اکبر بھی''۔

جس شخص میں تھوڑا سا بھی ایمان ہے اور جسکے سینے میں علیؑ کی ذرا سی بھی محبت ہے وہ یقیناً ان دعاؤں کو پڑھ کر عرش کی سیر کر رہا ہوگا اور اسکی روح نجف کا طواف کر رہی ہوگی۔اسکی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہونگے اور اسکو ایسا محسوس ہو رہا ہوگا جیسے اسکا دل خوشی کے مارے اچھل کر سینے سے باہر آجائے گا۔علیؑ کے ذکر کی خاصیت ہی یہی ہے اور اسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے۔''الا بِذکر اللہ تطمئنّ القلوب''۔

مندرجہ بالا دعاؤں میں حضرت امیرؑ المومنین کی چند خصوصیات بیان کی گئی ہیں جن پر نظر کرنا ضروری ہے۔

۱۔عرش کے مقاماتِ بلند۔۲۔کتاب اللہ کی انتہاءِ رحمت۔۳۔اللہ کا اسم عظیم الاعظم۔۴۔کلمۂ تامہ۔۵۔اللہ کا حق۔۶۔اللہ کی پاکیزگی۔۷۔جسکے ذریعے مردوں کو زندہ کیا جائے۔۸۔اللہ کا وہ چہرہ جو اجل واکرم ہے۔۹۔جسکے آگے پیشانیاں سجدے گزارتی ہیں۔۱۰۔جسکے سامنے گردنیں خم ہوتی ہیں (اور یہ حالتِ رکوع ہے)۔

۱۱۔جسکے حضور آوازیں کانپتی ہیں۔۱۲۔بلند و برتر (یہ لفظِ علیؑ کا ترجمہ ہے)۔۱۳۔اللہ کی شان۔۱۴۔اللہ کا نور۔۱۵۔اللہ کا جبروت جسکی تاب مخلوق نہیں لاسکتی اور قہر اُسکے آگے سرنگوں ہے۔۱۶۔اللہ کا سلطان (اسکی وضاحت آئندہ اوراق میں آئے گی)۔

۱۷۔ وسیلہ حمد ۔

عرش کے مقاماتِ بلند

اللہ کی تمام مخلوق زمان ومکان کی قیدی ہے اور ان سے باہر نکلنا اسکے لئے محالِ ابدی ہے۔ نفسِ انسانی کے پاس جو طاقتیں موجود ہیں ان میں قوی ترین قوتِ واہمہ ہے جو نفسِ ناطقہ کا موثر ترین ہتھیار ہے جسکی مدد سے وہ ذرے ذرے کے سینے میں اتر جاتا ہے اور اسکے خواص کو تلاش کر کے محیر العقول نتائج بر آمد کرتا ہے اور ان نتائج کی بنیاد پر عجیب وغریب اشیاء ایجاد کرتا ہے۔ لیکن یہ قوتِ واہمہ بذاتِ خود زمان ومکان کی اسیر ہے اور انسان کسی ایسی شے کو اپنے وہم میں لا ہی نہیں سکتا جو ان دوحدود سے باہر ہو اور نہ اسکی سمجھ میں کوئی ایسی بات آسکتی ہے جو زمان ومکان سے ماوراء ہو۔ اس لئے اللہ نے قرآن میں اور معصومین نے اپنے ارشادات میں لوگوں کو جو کچھ سمجھایا ہے وہ انہی دوحدود کے حوالے سے کیونکہ یہ انسان کی خلقی وفطری کمزوری ہے۔ لہٰذا جب اللہ کو اپنی بلندی اور عظمت کا اظہار مقصود ہوا تو اس نے عرش کی مثال کے ذریعے اسکو بیان کیا تاکہ لوگ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق سمجھ لیں۔ مراد ہماری یہ ہے کہ ان مثالوں سے اللہ یا اسکے اسم کے مقام کا تعین کرنا مقصود نہیں ہے۔ نہ ہی ان مثالوں کی وجہ سے اللہ اور اسم اللہ کو محدود کیا یا سمجھا جا سکتا ہے بلکہ یہ محض افہام وتفہیم کے لئے ہے اور یہ بات ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

عرش مکان میں داخل ہے اور مکان کے بلندترین مقام کا نام ہے۔عرش کے سلسلے میں مختلف مفسرین مختلف مفاہیم کیطرف گئے ہیں۔کچھ نے اسے ایک چوکور اور مربع شکل کا ایک ہیولا سمجھا ہے۔کچھ نے اس سے مراد تخت لیا ہے جو اسکے لغوی معنی بھی ہیں اور یہ بیان کیا ہے کہ اللہ بذاتِ خود اس تخت پر بیٹھتا ہے۔لیکن ائمۂ معصومین کے ارشادات سے جو کچھ ماخوذ ہوتا ہے اسکے مطابق عرش سے مراد ہے اللہ کا علم۔اللہ کی قدرت۔اللہ کی حکومت۔اللہ کی بلندی۔اللہ کی عظمت۔اللہ کا غلبہ۔اللہ کا اکرام اور اللہ کا جلال۔معنوی اعتبار سے عرش ان تمام صفات کے بلندترین مقام کا نام ہے اور اس بلندترین مقام کی انتہائی بلندی کا نام علیؑ ہے۔علیؑ کہتے ہی اس بلندی کو ہیں جسکو کوئی بلندی چھوتک نہ سکے اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ علیؑ کا یہ تعارف بھی انسانی عقول کی حدود کے لحاظ سے ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علیؑ انہی معنوں میں علی ہے جن معنوں میں اللہ علی ہے کیونکہ علیؑ اللہ کا وہی اسمِ مجسم ہے جسکے ذریعے اللہ کو علی کہکر پکارا جاتا ہے۔

بہرحال جس مقام پر ہم گفتگو کررہے ہیں وہاں حضرت امیرؑ المومنین کو "عرش کے مقاماتِ بلند" کہکر یاد کیا گیا ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے بھی اپنی ولایت و عظمت و بلندی کا تعارف عرش ہی کے ذریعے کرایا ہے جسکی توثیق مندرجہ ذیل آیات سے ہوتی ہے:۔

۱۔ نمل ۲۶۔ ''اللہ وہ ہے کہ اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عرشِ عظیم کا رب ہے''۔
یہاں عرش کو ''عظیم'' کہا گیا ہے اور اسی کا آئینہ دار ہے دعا کا وہ جملہ کہ ''پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے واسطے سے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی''۔
عرش ہماری قوتِ واہمہ کی حدِ آخر ہے اور اسکو اللہ نے عظیم کہا ہے۔ اعظم نہیں کہا۔ لہٰذا لفظِ ''عظیم'' کا تو ہم کسی حد تک ادراک کر سکتے ہیں لیکن لفظِ ''اعظم'' ہماری رسائی سے باہر ہے اور اسے محض اسکی لفظی ساخت یعنی صیغۂ تفضیل ہونے کی بنا پر نہیں سمجھا جا سکتا اور یہی علیؑ کی شان ہے جسکے ذریعے وہ اسم اللہ ہونے کے ناتے اپنے مسمّٰی کا تعارف کراتا ہے کہ اسکا ایک پہلو یعنی ''عظیم'' مخلوق سے ملا ہوا ہے اور دوسرا پہلو یعنی ''اعظم'' اللہ سے ملا ہوا ہے۔ اسکا ایک پہلو جسے اللہ نے قرآن مجید میں ''علیِ کبیر'' کہا ہے مخلوق سے ملا ہوا ہے اور اسکا دوسرا پہلو ''اکبر'' اللہ سے ملا ہوا ہے۔
۲۔ مومنون ۱۱۶۔ ''پس برتر ہے بادشاہِ برحق اللہ تعالیٰ۔ اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ رب ہے عرشِ کریم کا''۔
یہاں اللہ نے عرش کو کریم کہا ہے اور ہم آپکو یاد دلاتے ہیں دعا کا وہ جملہ کہ ''پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے واسطے سے جو کریم بھی ہے اور اکرم بھی''۔
عظیم اور اعظم اور کبیر اور اکبر کے تناظر میں کریم اور اکرم کو بھی دیکھا جا سکتا ہے اور وہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جسکا ذکر اوپر ہو چکا۔

۳۔حدید۴۔۵۔''وہ (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں بنایا۔پھر وہ عرش پر مستولی ہوا۔وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اور جو تمھارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے۔آسمانوں اور زمین کی حکومت اسی کے لئے ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں''۔

ان آیات میں عرش کے حوالے سے اللہ نے اپنی چند صفات کا ذکر فرمایا ہے جن میں سب سے پہلی صفت اسکا علم ہے۔پھر قدرت۔پھر حکومت۔پھر حاضر و ناظر ہونے کا ذکر۔اور پھر اسکی صفتِ بصیر کا تذکرہ۔یہ تمام ولایت کے اجزاء اور اسکے متعلقات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا عرش کے حوالے سے اپنا تعارف کرانا درحقیقت ولایت امیرؑ المومنین کا تعارف کرانا ہے۔

۴۔اعراف ۵۴۔''یقیناً تمھارا رب اللہ تعالٰی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔پھر عرش پر مستولی ہوا۔وہ رات کو دن سے ڈھانپتا ہے جو جلدی (جلدی) اسکی تلاش میں (پیچھے چلا) آتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اسکے حکم کے تابع ہیں۔آگاہ رہو کہ خلق و امر اسی کے لئے ہیں''۔

اس آیت میں قدرت وحکومت کے ساتھ خلق و امر کی بات کی گئی ہے۔یہ آپ سب جانتے ہیں کہ خلق اسے کہتے ہیں جو تدریجی ہو اور امر اسے کہتے ہیں جو بلا تدریج خلق

ہواور ارادۂ خدا سے براہ راست وجود میں آئے اور ان دونوں چیزوں یعنی خلق وامر کا تعلق ولایت سے ہے۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ جہاں اللہ نے عرش کا ذکر کیا وہیں کائنات کی خلقت کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ پوری کائنات کو اس نے چھ دنوں یا چھ وقتوں میں خلق کیا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ ہے ورنہ اس سے مراد یہ ہے کہ چھ مراحل میں ہر شے کو خلق کیا گیا ہے۔ اسکو بھی سمجھ لیا جائے تو اچھا ہے۔ معصومؑ فرماتے ہیں کہ" کوئی شے وجود میں نہیں آسکتی جب تک چھ مراحل سے نہ گزرے۔ مشیت۔ ارادہ۔ امر۔ قضاء۔ قدر اور اجل"۔ مشیت کے معنی ہیں چاہنا۔ یعنی ہر مخلوق پہلے مشیت خدا میں آتی ہے۔ پھر ارادے میں اور پھر امر میں۔ جب امر ہوتا ہے تو قضاء مقرر ہوتی ہے۔ قضاء کے معنی ہیں وہ تمام امور جو اس مخلوق کو سرانجام دینا ہوتے ہیں یا اسے درپیش ہونے والے ہوتے ہیں۔ اسکے بعد قدر کی منزل آتی ہے۔ قدر کے معنی ہیں مخلوق کو وہ تمام ذرائع۔ صلاحیتیں اور قوتیں عطا کرنا جو اسکے فرائض کی ادائیگی کے لئے ضروری ہوں۔ آخر میں اجل معین ہوتی ہے۔ اجل کے معنی ہیں وہ مدتِ معینہ جسکے دوران اسکو وہ تمام امور مکمل کرنا ہوتے ہیں جن کے لئے اسے خلق کیا گیا ہے۔

یہ چھ کا عدد بھی عجیب عدد ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ زندگی کیلئے کاربن کا وجود ضروری ہے اور کاربن کا ایٹمی عدد چھ ہے۔ اسی طرح انسان کی پیدائش بھی چھ مرحلوں میں ہوتی ہے۔ اگر شریعتوں کو بھی دیکھا جائے تو وہ بھی چھ مرحلوں میں نازل کی گئیں۔ اور

اگر ذرا سا بھی تدبر کیا جائے تو آپ فوراً محسوس کرلیں گے کہ پوری کربلا کا خلاصہ بھی ایک چھ مہینے کا بچہ تھا۔

آپ محسوس فرمائیں گے کہ عملِ تخلیق امر سے جاری ہوتا ہے اور امر میرا مولا ہے۔ وہ امر بھی ہے اور صاحبِ امر بھی۔ امر پیدا ہوتا ہے ارادے سے۔ اور ارادۂ اللہ بھی میرا مولا ہے۔ ارادہ پیدا ہوتا ہے مشیت سے۔ اور مشیت بھی میرا مولا ہے۔ مشیت کا سرچشمہ ہے علمِ خدا اور آپ میرے مولا کا فرمان پڑھ چکے ہیں کہ "میں ہوں اللہ کا علم"۔ پس سلسلۂ خلق اوّل تا آخر علیؑ مرتضیٰ کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ اللہ کا ہاتھ ہے اور خلق کا تعلق ہاتھ ہی سے ہوتا ہے۔

۵۔ رعد ۲۔ "اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے بلند کیا جنکو تم دیکھتے ہو۔ پھر وہ عرش پر مستولی ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا۔ ہر ایک مقررہ مدت کے لئے چل رہا ہے۔ وہی تمام امور کی تدبیر کرتا ہے اور آیتوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے تا کہ تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین کرلو"۔

اس آیت میں تین باتیں فکر کی متقاضی ہیں۔ تدبیر امور۔ آیات کی تفصیل اور رب سے ملاقات۔

تدبیر امور

امور جمع ہے امر کی اور امر کے معنی جب حضرت امیرؑ المومنین سے پوچھے گئے تو آپ

نے فرمایا۔ ''اسکے معنی ہیں خلق ۔رزق ۔اجل ۔عمر ۔حیات وموت ۔علمِ غیب ۔ارض و سماءاوروہ معجزات جوحضراتِ سفراءوحجج اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں''۔(اصولِ کافی اورحقائق الوسائط)۔اس لئے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ جو صاحبِ امر ہوگا وہی خالق ومربیِ کائنات ہوگا۔

حقائق الوسائط جلد اصفحہ ۱۱۵ پر بحوالہ احتجاجِ طبرسی جنابِ امیرؑ المومنین کا یہ ارشاد درج ہے۔ ''اس (اللہ) نے اپنے امور کے لئے اپنے امین پیدا کئے ہیں اورانکی تخلیق میں ایک ایسی قدرت پیدا کردی ہے جسکوانکی ترکیبِ تخلیقی کا جزو قرار دے دیا ہے جسکے ذریعے وہ تمام کائنات پر غالب ہے اوریقیناً خدا کا فعل انکا فعل ہے''۔

حقائق الوسائط جلد اصفحہ ۲۳۶ بحوالہ اصولِ کافی ۔امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''تمھیں معلوم نہیں کہ دنیاوآخرت امام کے لئے ہیں۔امام کواختیار ہے کہ انھیں جس طرح چاہے استعمال کرے اورجسطرح چاہے عطا کرے۔یہ اختیار خدا نے انکو عطا کیا ہے''۔

غررالحکم ودررالکلام میں جنابِ امیرؑ المومنین کا یہ فرمان محفوظ ہے۔ ''ہم ہی اسکے پہلو اورہاتھ۔اسکی زبان اوراسکا امر ہیں۔اورہم ہی اسکا علم اوراسکا حق ہیں۔جب ہم چاہتے ہیں تو خدا بھی چاہتا ہے اورہم جوارادہ کرتے ہیں تو خدا بھی وہی ارادہ کرتا ہے۔پس ہم ہی وہ وجہہ اللہ ہیں جوزمین پرتمھارے درمیان اپنی مرضی

سے تصرف کرتے ہیں۔ بہ تحقیق کہ اسکی مخلوق کی بازگشت ہماری ہی طرف ہے اور ہم ہی انکا حساب لینے والے ہیں''۔

ان احادیث سے وہ تمام امور ثابت ہوتے ہیں جو اللہ نے عرش کے حوالے سے اپنے بارے میں ارشاد فرمائے اور یہ بات عقلی وحتمی ہے کہ صفاتِ خدا کا ظہور اسم اللہ سے ہی ہونا ہے۔

آیات کی تفصیل

یونس ۳۷۔ ''اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے جھوٹ موٹ بنالیا جائے بلکہ وہ تصدیق ہے اسکی جو انکے پاس ہے اور تفصیل ہے تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے آئی ہوئی کتاب کی جس میں کوئی ریب نہیں''۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن دراصل ایک ایسی کتاب کی تفصیل ہے جس میں کوئی ریب نہیں اور میرے مولاؑ فرماتے ہیں کہ ''انا ذالك الكتاب لا ريب فيه''۔ ''میں ہوں وہ کتاب جس میں کوئی ریب نہیں''۔ اسکا واضح مطلب یہ ہوا کہ قرآن درحقیقت حضرت امیرؑ المومنین ہی کی تفصیل بیان کررہا ہے اور یہی مراد ہے آیات کی تفصیل سے۔

''رب سے ملاقات'' کے بارے میں ہم گذشتہ اوراق میں تفصیل سے لکھ

چکے ہیں اس لئے اسکو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے۔

۶۔سجدہ ۴۔ ''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ دونوں کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر مستولی ہوا۔ تمھارے لئے اسکے سوا نہ کوئی ولی ہے اور نہ شفیع (سفارشی)''۔

اس آیت میں اللہ نے عرش کے حوالے سے کھل کر اپنی ولایت کا اعلان کر دیا ہے لہٰذا اسکی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں۔

۷۔مومن ۱۵۔ ''بلند کرنے والا درجوں کو۔عرش والا۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے امر سے روح ڈال دیتا ہے تا کہ ملاقات کے دن سے ڈرائے''۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جس کسی کے بھی درجات کو بلند کرتا ہے تو وہ تحت امر و روح ہوتا ہے اور امر و روح ہی بلندیٔ درجات کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ''فضّلنا بعضہم علیٰ بعض '' کے یہی معنی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آدمؑ کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ بھی اسی امر و روح کی وجہ سے تھا۔ اس سلسلے میں ہم سورہ شوریٰ کی آیت ۵۲ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تا کہ آپکو اس امر و روح کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

''اور اسطرح ہم نے تیری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر سے تھی۔ تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔ لیکن ہم نے اس (روح) کو نور قرار دیا جس

سے ہم جس کی چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ بیشک تو صراطِ مستقیم پر ہے''۔

تفسیرِ نور الثقلین میں امام محمد باقرؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔''یہ آیت حضرت امیرؑ المومنین کی شان میں ہے۔ اللہ جس کسی کی بھی ہدایت کرتا ہے علیؑ ہی کے ذریعے کرتا ہے''۔ اور خطبۃ البیان میں حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔''میں ہوں اللہ کا امر اور اسکی روح''۔

عرش کے حوالے سے ہم نے سات آیات پیش کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں بھی اللہ نے خود کو''ذوالعرش''یعنی عرش والا کہا ہے وہاں اپنے ولی ہی کا تعارف کرایا ہے اور اسی کا قصیدہ پڑھا ہے۔ لہٰذا''ذوالعرش''کے حقیقی معنی ہیں''علیؑ والا''۔ ہم اس علیؑ کو مانتے ہیں جو اللہ والا ہے اور اس اللہ کو مانتے ہیں جو علیؑ والا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ عرش کے بلند مقامات کا مفہوم آپ کے ذہن تک پہنچ گیا ہوگا۔

وسیلہ حمد

''الحمد'' پر ہم آئندہ ایک مقام پر جداگانہ گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اتنا عرض کریں گے کہ کسی بھی شے کی تعریف اسکی کسی نہ کسی خصوصیت کو دیکھ کر ہی کی جاتی ہے اور جو تعریف کی جاتی ہے وہ حقیقتاً اس خصوصیت ہی کی ہوتی ہے جسکی نسبت صاحبِ خصوصیت کیطرف مجازاً جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم کسی باغ کی تعریف کرتے ہیں تو

اسکے پھولوں ۔پھلوں اور اسکی تزئین و آرائش دیکھ کر۔آپ یقیناً اس بات کی تائید کریں گے کہ اگر چہ ہم تعریف باغ کی کرتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ تعریف ان پھولوں اور پھلوں کی ہوتی ہے جنکو ہم دیکھتے ہیں۔فرض کریں کہ ایک باغ میں ایک نادر قسم کا پھول لگا ہوا ہے جو انتہائی خوش رنگ ہے اور جسکی خوشبو سے سارا باغ مہکتا ہے اور دور دور سے لوگ اس پھول کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں اور باغ کی تعریف کرتے ہیں ۔اب اگر کوئی اس پھول کو توڑ کر باغ سے لے جائے تو کوئی بھی نہ تو باغ میں آئے گا اور نہ اسکی تعریف کرے گا۔پس ثابت ہوا کہ علیؑ کو اللہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو حمدِ خدا منقطع ہو جائے گی جو محالِ ابدی ہے۔اسی طرح اگر ہم کسی شخص کے بارے میں کہیں کہ ''وہ بہت حسین وجمیل ہے'' تو یہ بات ہم اسکے چہرے کو دیکھ کر کہیں گے اور تعریف اگر چہ ہم اس شخص کی کر رہے ہیں لیکن دراصل اسکے چہرے کی تعریف ہو رہی ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ جو وسیلۂ تعریف ہوتا ہے اسی کی تعریف کی جاتی ہے جو منسوب ہوتی ہے اسکی طرف جسکا یہ وسیلہ ہے۔پس جو وسیلۂ حمد ہوگا حقیقتاً محمود بھی وہی ہوگا اور اسی سے مقامِ محمود کو سمجھنا چاہئے۔

ہم نے بڑی روا روی میں یہ بات لکھ دی ہے لیکن اس خیال سے کہ آپ اس سے کسی الجھن میں نہ پڑیں ہم اسکی تھوڑی سے وضاحت کئے دیتے ہیں۔

۱۔ بحارالانوار (اردو) ج ۱۱۔ صفحہ ۵۳۰ پر حضرت صاحب الزمانؑ کی ایک توقیع مبارکہ درج ہے جس میں آپ نے رسولؐ اللہ پر درود بھیجنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ اسکا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

''وَاعطه الفضل والفضيلة و الدرجة والوسيلة الرفيعة وابعثه مقاماً محموداً يغبطه به الاوّلون والآخرون''۔

ترجمہ:۔ ''(اے اللہ) انکو (رسولؐ اللہ کو) عطا فرما فضل اور فضیلت اور درجہ اور بلند وسیلہ اور انکو مقامِ محمود پر مبعوث کردے جس پر اوّلین و آخرین رشک کریں''۔

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۲ ا پر بھی یہی دعا درج ہے۔

''خدایا! ان (رسولؐ اللہ) کو فضل و فضیلت اور وسیلہ عطا فرما اور درجۂ بلند عطا فرما اور انھیں اس مقامِ محمود پر فائز کر کہ جسکے لئے اوّلین و آخرین ان پر رشک کریں''۔

۳۔ صحیفۂ زہراؑ صفحہ ۶۳۔ ''پروردگار! محمدؐ کو قیامت میں عظیم وسیلہ عطا فرما''۔

امام زمانہؑ کے فرمان۔ مفاتیح کی عبارت اور سیدۃ الکونینؑ کی دعا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسولؐ اللہ کو فضل و فضیلت۔ درجۂ بلند اور مقامِ محمود ایک وسیلے کے ذریعے سے ملنا ہے۔ اور وہ وسیلہ کون ہے یہ معراج میں ظاہر ہو گیا۔

جب ہم خاص طور پر حمدِ خدا کی بات کرتے ہیں تو اسکی ناقص حمد کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یقیناً اسکی حمد کو کامل بلکہ اکمل ہونا چاہئے اور اسکے لئے ضروری ہے کہ وسیلۂ حمد یعنی وہ شے جسے دیکھ کر اللہ کی تعریف کی جا رہی ہے وہ جامعِ کمالاتِ الٰہیہ ہو۔ کیونکہ

اگر اس میں ذرہ برابر بھی نقص رہ گیا تو وسیلہ ناقص ہو جائے گا۔وسیلہ ناقص ہوا تو حمد ناقص ہو جائے گی اور اگر حمد ناقص ہوئی تو (معاذ اللہ) وہ ناقص ٹھہرے گا جسکی حمد کی جارہی ہے۔لہذا دیکھنا پڑے گا کہ اللہ کی اکمل ترین آیت کون ہے جو وسیلۂ حمد ہے۔سورۂ نجم میں اسکا تعارف ''آیت اللہ الکبریٰ'' کہہ کر کرایا گیا ہے اور اصولِ کافی میں حضرت امیرؑ المومنین خود ارشاد فرماتے ہیں۔''اللہ کے نزدیک مجھ سے بڑی کوئی آیت ہے ہی نہیں نہ مجھ سے بڑی کوئی خبر ہے''۔

اسم کون ہے؟

پہلے ہم اس اسمِ اعظم کی خصوصیات معلوم کریں گے اور پھر تلاش کریں گے کہ وہ اسم کون ہے۔

۱۔صحیفۂ زہراؑ صفحہ ۸۳۔''پروردگار! میں تیرے اس اسمِ مخزون کے ذریعے سے سوال کرتا ہوں کہ جس کے سبب سے آسمان و زمین قائم ہیں۔تاریکیوں میں روشنی ہے۔ملائکہ اسی کے ذکر اور تسبیح میں مشغول ہیں۔دلوں میں اسی کا خوف اور دبدبہ ہے۔گردنیں اسی کے سامنے سرنگوں ہیں اور تو مردوں کو اسی کے ذریعے زندہ کرتا ہے''۔

۲۔مفاتیح الجنان صفحہ ۲۱۸۔''پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے ذریعے سے جسے تو نے آسمانوں پر رکھا تو وہ مستقل ہو گئے اور زمین پر رکھا تو وہ قائم ہو گئی اور

پہاڑوں پر رکھا تو وہ اپنی جگہ جم گئے اور رات پر رکھا تو وہ کالی ہوگئی اور دن پر رکھا تو وہ چمک گئے''۔

۳۔کوکب دری صفحہ ۴۹۔رسول اللہ نے فرمایا۔

''اے اللہ! میں تجھ سے تیرے اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کہ جب اسکا ذکر کیا جائے تو اسکی عظمت و ہیبت سے آسمان کانپنے لگیں۔زمین شق ہوجائے۔بادل ٹکڑے ہوجائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائے۔ہوائیں چل نکلیں۔سمندر خشک ہوجائیں۔موجیں مضطرب ہوں۔دل کانپنے لگیں۔قدم ڈگمگا جائیں۔کان بہرے ہوجائیں۔آنکھیں پتھرا جائیں۔آوازیں پست ہوجائیں۔گردنیں جھک جائیں۔روحیں قبروں سے اٹھ کھڑی ہوں۔فرشتے سجدے میں گر پڑیں اور تسبیح کرنے لگیں۔انکے جوڑ بند کانپنے لگیں۔عرشِ اعظم متزلزل ہوجائے اور تمام خلائق سر اطاعت جھکا دے۔اور تیرے اس اسم سے سوال کرتا ہوں کہ جب اسے جنت پر رکھا گیا تو وہ سج گئی۔دوزخ پر رکھا تو وہ بھڑک گئی۔آسمانوں پر رکھا تو وہ مستقل ہوگئے۔ستاروں پر رکھا تو وہ مزیّن ہوگئے۔آفتاب پر رکھا تو وہ چمک اٹھا۔چاند نورانی ہوگیا۔زمین نے قرار پکڑا۔اور تیرے اس اسم سے جس سے تو نے اپنے نفس کو موسوم کیا ہے اور جس سے فرشِ قدرت پر مستولی ہوا ہے اور کرسیٔ علم پر متمکن ہوا ہے اور جس سے

فرشتوں۔زمین۔آسمان۔جنت ونار۔سب کچھ پیدا کیا ہے''۔

پہلے ہم اللہ کے اسمِ اعظم کی مندرجہ بالا خصوصیات کی روشنی میں اسے تلاش کرتے ہیں۔لیکن چونکہ دعائے رسولؐ کا ایک جملہ یہ بھی ہے کہ''فرشتے سجدے میں گر پڑیں اور تسبیح کرنے لگیں''تو اس حوالے سے بھی ہم مختصر سی گفتگو کریں گے۔

۴۔نہج الاسرار جلد اصفحہ ۹۲۔حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔

''میں وہ ہوں جسکا نام عرش پر لکھا ہوا ہے اس لئے وہ قرار پایا اور آسمانوں پر لکھا ہوا ہے جس سے وہ قائم ہو گیا اور زمین پر لکھا گیا تو اس نے قرار پکڑا اور پہاڑوں پر لکھا گیا تو وہ بلند ہوئے اور ہوا پر لکھا گیا تو وہ اڑنے لگی اور برق پر لکھا گیا تو وہ چمکی اور بارش کے قطروں پر لکھا گیا تو وہ جاری ہوئے۔نور پر لکھا گیا تو وہ روشن ہوا۔بادلوں پر لکھا گیا تو وہ برسنے لگے اور رعد پر لکھا گیا تو اس سے خشوع کی صدا بلند ہوئی۔رات پر لکھا گیا تو وہ تاریک ہوئی اور دن پر لکھا گیا تو وہ چمک اٹھا اور تبسم کیا''۔

بلا شک وشبہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہ اسمِ اعظم ذاتِ امیرؑ المومنین ہے

اور ہم اسی اسمِ اعظم کے وسیلے سے دعا کرتے ہیں کہ پروردگارِ عالم ہمیں زندگی میں بھی اسکی محبت میں سرشار رکھے۔موت بھی اسی کی محبت پر دے اور آخرت میں بھی اسی کے محبوں کے ساتھ محشور فرمائے۔آمین ثم آمین۔

اب ہم حضرت ختمی مرتبتؐ کے مذکورہ جملے کی طرف توجہ دیتے ہیں اور چند شواہد آپکی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔مدینۃ المعاجز (اردو) جلد ۱۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ (معراج کے موقعے پر) اللہ نے اپنے نبیؐ کو سات آسمانوں کی سیر کرائی۔پہلے آسمان پر اللہ نے نور کا ایک محمل اتارا جس میں چالیس قسم کے وہ نور تھے جو اللہ کے عرش کو گھیرے ہوئے تھے۔اسکو دیکھ کر فرشتے سجدے میں گر گئے اور انھوں نے سبوح'' قدوس'' کی تسبیح پڑھی اور کہنے لگے۔''یہ نور ہمارے رب کے نور سے کتنا مشابہ ہے!''۔دوسرے آسمان اور باقی آسمانوں پر بھی یہی ہوا کہ اس نور کو دیکھ کر فرشتے سجدے میں گر گئے اور سبوح'' قدوس'' کی تسبیح پڑھی اور کہنے لگے کہ یہ نور ہمارے رب کے نور سے کتنا مشابہ ہے!۔(یہ روایت فروع کافی اور من لا یحضرہ الفقیہ میں بھی منقول ہے)۔

یہاں فرشتوں کے اس جملے پر غور کرنا انتہائی ضروری ہے جس میں انھوں نے کہا۔''یہ نور ہمارے رب کے نور سے کتنا مشابہ ہے''۔کیونکہ فرشتے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کے لئے تشبیہ جائز نہیں۔پس ''رب'' سے انکی کیا مراد ہے اس پر دھیان دینا ضروری ہے۔

۲۔مدینۃ المعاجز (اردو) جلد ا صفحہ ۶۷۔ابلیس کا بیان:۔

''ایک مرتبہ ہم اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مصروف تھے کہ ہمارے پاس سے ایک نور کا گزر ہوا۔اس نور کو دیکھ کر فرشتے سجدے میں گر پڑے اور انھوں نے سبوح'' قدوس'' کی تسبیح پڑھی اور حیرت سے پوچھا۔''خدایا! یہ نور کسی ملکِ مقرب کا تھا یا نبی

مرسل کا تھا؟''۔اس وقت اللہ کیطرف سے ندا آئی۔''یہ نور نہ تو کسی ملکِ مقرب کا تھا اور نہ ہی کسی نبی مرسل کا تھا۔یہ نور علیؑ ابن ابی طالبؑ کی طینت کا تھا''۔

یہ واضح رہے کہ طینت اس مٹی کا نام ہے جس سے آنجنابؑ کے جسدِ بشری کی تشکیل ہوئی۔جب اس طینت کے نور کا یہ عالم ہے تو اگر علیؑ اپنی حقیقتِ نورانیہ کے ساتھ آجائے تو فرشتے کیا کریں گے؟۔اور جب اللہ کے معصوم فرشتوں کا یہ عالم ہے تو ہم جیسے کمزور لوگ کیا کریں گے؟۔سورۂ قیامت میں صاف لکھا ہے کہ تمام مومنین سجدے میں گر پڑیں گے۔

اب بھی آپ کے دل کو اطمینان ہوا یا نہیں؟۔یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں نام لیکر بتاؤں؟۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۱۸۹۔''اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں تیرے اسم ''یا علیؑ'' کے واسطے سے''۔

اسم اللہ

قرآن مجید کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''بہت سے لوگ اس سے ہدایت پاتے ہیں اور بہت سے لوگ اسی قرآن سے گمراہ ہو جاتے ہیں''۔

علیؑ بھی قرآن ناطق ہے لہذا قرآنِ ناطق کی بھی خاصیت یہی ہے کہ بہت سے لوگ اس سے ہدایت پاتے ہیں اور بہت سے لوگ اسکی وجہ سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

گمراہ ہونے والے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو انکار کر کے گمراہ بلکہ کافر ہو جاتے ہیں اور کچھ وہ جو علیؑ کی محبت میں چھلک کر اسکو خدا کہنے لگتے ہیں۔ ایسے محبوں کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو محبت میں بے خود ہو کر ایسا کرتے ہیں اور اسکا سبب انکی جہالت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جو بطورِ فیشن اور اپنی انفرادیت کے اظہار کے طور پر ایسا کرتے ہیں اور ''بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا'' کا اصول انکے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ میں بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہوں جو ہاتھوں میں کڑے پہنے گلیوں میں بازاروں میں۔ چوراہوں پر اور رفٹ پاتھوں پر ''علیؑ اللہ! علیؑ اللہ!'' کی آوازیں لگاتے ہیں جو ''کلمۃ الحق یراد بہ الباطل'' کا مصداق ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو جنکی غیر ذمہ دارانہ حرکات سے مومنین مخلصین بھی خواہ مخواہ طعنۂ اغیار کی زد میں آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا حساس اور نازک مسئلہ ہے جس میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اور بغیر علم زبان سے نکلنے والا ایک لفظ بھی انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا

دیتا ہے۔اسم و معنی پر قلم اٹھانے سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ قارئین اس نازک فرق کو پہچانیں اور اللہ اور علیؑ کے لفظی اتحاد کو معنوی اتحاد میں تبدیل نہ کریں۔حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اسم و معنی کو ایک ہی نام سے پکارا جاتا ہے پھر بھی چونکہ لوگوں میں علم و معرفت سے بے رغبتی عام ہے اس لئے اس معاملے میں احتیاط کی جائے تو بہتر ہے۔حالانکہ عارفین کاملین اور خود ائمہ معصومینؑ نے یہ لفظ اسم و معنی دونوں کے لئے استعمال فرمایا ہے جیسا کہ ثابت کیا جائے گا۔لیکن یہ بات ان ہی کی زبان پر سجتی تھی۔ہر کس و ناکس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس معاملے میں اپنی زبان کھولے۔

جو حقیقت حال تھی وہ ہم نے پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دی لیکن لوگوں کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ ایسے نادانوں کو برا بھلا کہنے اور ان پر فتوے لگانے کے بجائے اس طرزِ عمل کے اصل اسباب پر غور کریں۔اور خلوص کے ساتھ غور کریں۔اور ٹھنڈے دل سے غور کریں۔اور سمجھنے کے لئے غور کریں۔اور مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے غور کریں اور معلوم کریں کہ یہ اشتباہ پیدا کیوں ہوتا ہے؟۔

حضرت ختمی مرتبتؐ کے جن معجزات کو محدثین و مورخین نے نقل کیا ہے انکی تعداد کم و بیش دس ہزار تک پہنچتی ہے۔اسکے مقابلے میں حضرت امیرؑ المومنین کے بہت کم معجزات نقل کئے گئے ہیں۔لیکن آج تک کوئی ایک بھی ایسا انسان نہیں گزرا جس نے حضرت ختمی مرتبتؐ کو اللہ کہا ہو۔اسکے برخلاف ہر دور میں ایک طبقہ ایسا ضرور موجود رہا ہے اور آج بھی موجود ہے جو علیؑ کو اللہ کہتا اور مانتا ہے۔ایسا بے سبب تو ہو نہیں

سکتا۔ عقل حکم لگاتی ہے کہ علیؑ میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جسکی وجہ سے لوگوں کو اس پر اللہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ مقام غصہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا ہے کیونکہ اسی ایک بات پر انسان کے مکمل عقیدے کا دارومدار ہے اور ذراسی لغزش بھی انسان کو ایک کونے سے اٹھا کر دوسرے کونے میں پھینک سکتی ہے۔ اس کتاب کا مرکز ''اسم و معنی'' کا تصور ہے اور یہ کتاب لکھی ہی اس لئے گئی ہے کہ تا کہ ان نافہموں کو باز رکھا جا سکے جو اسم کو معنی سمجھ لیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو بھی سمجھایا جا سکے جو معنی کو اسم سمجھتے ہیں اور اسم حقیقی کا انکار کرتے ہیں اور جنکا کام فقط لفظوں کی پرستش کرنا۔ لفظوں کی گرفت کرنا اور فتوے لگانا ہوتا ہے۔

لفظِ ''اللہ'' کا مفہوم

لفظِ ''اللہ'' بظاہر پانچ حروف سے مرکب ایک لفظ ہے اور ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ الفاظ مخلوق ہیں لہٰذا یہ اللہ بھی مخلوق ہے۔ دنیا میں ایک آدمی بھی ایسا نہ ملے گا جو کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ ''اللہ'' کی پرستش کرتا ہو لیکن اسکے باوجود وہ اس لفظ کو ''اللہ'' کہہ کر ہی پکارتا ہے۔ یہیں سے سمجھئے کہ جب ہم زبان سے لفظِ ''اللہ'' ادا کرتے ہیں تو اسکے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک اللہ وہ ہے جو تعارف کرانے والا ہے۔ اسے اسم کہتے ہیں اور اسم کے لئے لفظ ''اللہ'' استعمال کرنا ناگزیر ہے کیونکہ اسکے بغیر نہ تو آپ اس معبودِ حقیقی پر ایمان لا سکتے ہیں اور نہ اسکی عبادت کر سکتے ہیں۔ دوسرا اللہ وہ

ہے جسکا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اسے معنی کہتے ہیں اور یہ دونوں ''اللہ'' ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسا کہ التوحید صفحہ ۲۲۰ حدیث ۴ میں حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''اسکا اسم ''اللہ''۔ اللہ کا غیر ہے''۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اسم کا سہارا لئے بغیر اور اسم کو وسیلہ بنائے بغیر معنی کو پکارنا یا اسے مخاطب کرنا یا اس سے دعا مانگنا ممکن ہی نہیں ہے۔ نماز میں ہم اللہ سے بات کرتے ہیں اور اسے مخاطب کرتے ہیں۔ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں''۔ یہ وہ جملہ ہے جسکے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں۔ اس میں لفظ ''تیری'' کسی کی طرف اشارہ کررہا ہے اور ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ اللہ قابلِ اشارہ نہیں ہے۔ اگر قابلِ اشارہ ہوگا تو مجسم ہوگا۔ مجسم ہوگا تو محدود ہوگا۔ محدود ہوگا تو حادث ہوگا۔ اور حادث ہوگا تو اللہ نہ رہے گا۔ پھر آپ نماز میں یہ جملہ ادا کرتے وقت کس سے مخاطب ہوتے ہیں؟۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں سورہ شوریٰ کی آیت ۵۱ نقل کی تھی جس میں اللہ نے حتمی طور پر فیصلہ فرمادیا کہ کوئی بھی بشر خواہ وہ نبی ہو یا ایک عام انسان۔ اللہ سے بغیر حجاب کا سہارا لئے ہوئے کلام نہیں کرسکتا۔ پس جب آپ اپنی زبان سے لفظِ ''ایا ک'' ادا کرتے ہیں تو لازم ہے کہ آپ کا مخاطب وہ حجاب ہو جسکے بغیر اللہ سے کلام نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ''اہدنا'' جسکا ترجمہ یہ ہے کہ ''تو ہماری ہدایت فرما'' یا ''تو ہمیں ثابت قدم رکھ'' تو یہاں بھی لفظِ '' تو '' کسی کی طرف اشارہ کررہا ہے اور یہ اشارہ جارہا ہے حجاب کیطرف۔ اسی طرح جب آپ کوئی

بھی دعا مانگتے وقت کہتے ہیں ''اے اللہ'' تو یہ لفظ ''اے'' بھی حرفِ نداء ہے جو منتہی ہوتا ہے حجاب پر۔ آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ کتنا نازک معاملہ ہے۔ اسے نازک سمجھ کر اس سے پہلو تہی کرنا اور یہ کہنا کہ ''ارے چھوڑو۔ کون ان باریکیوں میں پڑے'' درحقیقت اپنے ایمان اور اپنی آخرت کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہے کیونکہ عبادت کرنے سے پہلے یہ تعین کرنا ضروری ہے کہ آپ کس کی عبادت کر رہے ہیں۔ اگر یہ تعین غلط ہو گئی تو اسکا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ کی عبادت نہ ہوئی بلکہ کسی اور کی عبادت ہو گئی۔ اور اسی کو اللہ نے ''عبادتِ شیطان'' سے تعبیر کیا ہے۔ عبادتِ خدا اور عبادتِ شیطان میں بڑا نازک سا فرق ہے۔ اگر کوئی اس نزاکت سے چشم پوشی کرے گا تو خود اسے بھی علم نہیں ہو گا کہ وہ کس کی عبادت کر رہا ہے اگر چہ اپنے زعم میں وہ اللہ ہی کی عبادت کیوں نہ کر رہا ہو۔ لہٰذا اس بات کو دل پر نقش کرلیں کہ جب بھی آپ عبادت کرتے ہیں یا دعا مانگتے ہیں تو اگر چہ آپ کا مقصود و مراد ''معنیٰ'' ہوتا ہے لیکن آپ کا خطاب ''اسم'' سے ہوتا ہے کیونکہ وہی اللہ کا کان (اُذن اللہ) ہے اور اسی کی نسبت سے اللہ نے خود کو ''سمیع'' کہا ہے۔ اب یہ کام اسم کا ہوتا ہے کہ وہ ان کلمات کو اللہ تک پہنچائے۔ اور یہ بات بھی افہام و تفہیم کے لئے ہے ورنہ یہی اسم مشیت اللہ بھی ہے اور ید اللہ بھی۔ ردّ و قبول اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور مخلوق کو جو کچھ بھی ملتا ہے اسی سے ملتا ہے۔

یہ بات بہر حال طے ہوگئی کہ ہمیں جس شے سے واسطہ پڑتا ہے اور جس تک ہماری رسائی ہے اور جسکا ہم تصور کر سکتے ہیں اور جس سے ہم بات کر سکتے ہیں وہ اللہ ہے مگر وہ اللہ جو اسم ہے نہ کہ معنی۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''(اے رسولؐ) کہدو کہ اللہ کہکر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔ جس نام سے بھی پکارو پس سب اچھے نام اسی کے ہیں''۔ اس آیت سے ثابت ہوگیا کہ جب کوئی ''یا اللہ'' کہتا ہے تو اسکا مخاطب اللہ کا اسمِ حقیقی ہوتا ہے اور لفظِ اللہ اسکے دیگر اسماء کی طرح ایک اسم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تمام اسماء کا جامع ہو۔ جیسا کہ التوحید صفحہ ۲۲۰ حدیث ۴ میں حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''تمھارا اللہ کہنا اسماءِ الٰہی میں عظیم ترین نام ہے''۔

یہاں یہ بے جا نہ ہوگا اگر ہم مفاتیح الجنان صفحہ ۶۹۶ سے زیارتِ امیرؑ المومنین کا ایک جملہ آپکی خدمت میں ہدیہ کریں۔ ''سلام ہو اللہ کے پسندیدہ نام پر۔ اسکے چہرے پر جو علیؑ ہے اور اسکا صراطِ مستقیم ہے۔ سلام ہو اس پر جسکے پاس ام الکتاب ہے۔ سلام ہو اس پر جسے جبریلؑ نے کسی شبہ کے بغیر امیرؑ المومنین کہکر مخاطب کیا''۔

اللہ کی معرفت

اس تمام گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کو جانا۔ پہچانا اور مانا جا سکتا ہے فقط اور فقط اسکے اسم کے ذریعے سے۔ اسکے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم اسکی معرفت

حاصل کرسکیں اور در حقیقت اسکے اسم کی معرفت حاصل کرلینا ہی اسکی معرفت کہلاتا ہے۔اس موقعہ پر ہم ایک انتہائی اہم حدیث پیش کررہے ہیں جوتوحید کی کلید ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں شیاطین کلبلاتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اپنے لشکروں کوحرکت میں لاتے ہیں۔

التوحید صفحہ ۱۴۲ حدیث ۷۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔" دراصل اللہ کو اسی نے پہچانا جس نے اسکو اللہ کے ذریعے پہچانا۔جس نے اسکو اسکے ذریعے نہیں پہچانا تو وہ اسکونہیں پہچانتا ہے بلکہ وہ اسکے غیر کو جانتا ہے۔وہ اپنے اسماء سے پکارا جاتا ہے حالانکہ وہ اپنے اسماء کا غیر ہے اور اسماء اسکا غیر ہیں"۔

یہ حدیث اس قدر واضح ہے کہ اسکی تشریح کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی لیکن ایک مقصر اور بدنام مولوی نے اس سے یہ مطلب نکالا ہے کہ اللہ کو کسی اور کے ذریعے نہیں بلکہ خود اسی کے ذریعے پہچانا جانا چاہئے یعنی اللہ کی معرفت براہ راست اسی سے حاصل کرنا چاہئے۔اس مولوی کا اصل مقصد یہ ہے کہ وسیلے کو درمیان سے ہٹا دیا جائے اور اس بات کو اس نے قطعی طور پر نظر انداز کردیا کہ اگر وسیلہ درمیان سے ہٹ گیا تو اللہ کا کوئی وجود ہی ثابت نہیں ہوگا کیونکہ نہ تو اسکا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ وہم وگمان میں آسکتا ہے۔یہ بات عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی اور سراسر تکذیب قرآن ہے جہاں اللہ نے وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔اس بات کا ذکر ہم

نے اس لئے کردیا تا کہ مومنین شیطان کے جال سے محفوظ رہ سکیں ورنہ جو گفتگو ہم کر چکے ہیں اسکی روشنی میں اس حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہے۔یعنی اس اللہ کو جو معنیٰ ہےصرف اس اللہ کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے جواسم ہے اور اگر اس اللہ کو جو اسم ہے نظر انداز کیا گیا تو جس شے کی معرفت حاصل ہوگی وہ اللہ نہیں بلکہ کوئی اور چیز ہوگی۔

ممسوس فی ذات اللہ

ہم نے کشف العقائد میں جن امور کا ذکر کیا تھا ان میں سے بعض کے بارے میں دنیا بھر سے مومنین کے لاتعداد سوالات ہم تک پہنچے۔اسوقت ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ہم ان امور کی تفصیل میں جاتے۔کچھ تو خوفِ فسادِ خلق کی وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ کوئی بات مومنین کے لئے پریشانی کا باعث نہ بنے۔لیکن جن مراحل کو ہم اس کتاب میں طے کر آئے ہیں انکے بعد ہمارے لئے یہ قدرے آسان ہوگیا ہے کہ ہم اجمالی طور پر ان سوالات کا جائزہ لیں جو ہمارے احباب کے ذہنوں میں کھٹک رہے ہیں۔یہاں ہم صرف دو سوالات پر گفتگو کریں گے جو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور انکی وجہ سے باقی سوالات بھی انشاءاللہ حل ہو جائیں گے۔اس مقام پر ہم ایک سوال کے بارے میں عرض کر رہے ہیں۔دوسرے سوال کے جواب میں ایک الگ مقام پر گفتگو کی جائے گی۔

ہم نے ایک حدیث رسولؐ نقل کی تھی جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ ''علیؑ کو برا مت کہو کیوں کہ وہ ذاتِ خدا میں مس کیا ہوا ہے''۔اور اس بات پر خاص طور پر زور دیا تھا کہ '' سے'' اور '' میں'' میں فرق روا رکھا جائے کیونکہ آنحضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ علیؑ ذاتِ خدا '' سے'' مس کیا ہوا ہے بلکہ فرمایا کہ علیؑ ذاتِ خدا ''میں'' مس کیا ہوا ہے۔اس بارے میں بہت سے مومنین ہم سے سوال کرتے رہے ہیں کہ ذاتِ خدا میں ممسوس ہونے سے کیا مراد ہے؟۔

اللہ کے جتنے بھی اسماء کا قرآن میں ذکر آیا ہے وہ سب اسماءِ صفات ہیں مثلاً خالق صفتِ خلق کی نسبت سے ۔رازق صفتِ رزاقیت کی نسبت سے اور رحمٰن صفتِ رحم کی نسبت سے۔لیکن اسکے اسم ''اللہ'' کے بارے میں اکثر مفسرین کا موقف یہ ہے کہ اللہ اسم صفت نہیں بلکہ اسمِ ذات ہے اسی لئے اسکے تمام اسماءِ صفات کو اسکے اسمِ ذات سے منسوب کیا جاتا ہے۔مثلاً اللہ خالق ہے۔اللہ رازق ہے۔ اللہ رحمٰن ہے وغیرہ۔جب ایسا ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسمِ ذات ۔ذات ہی کا تعارف کرائے گا۔اب ترتیب یوں بنی کہ اسماءِ صفات اسمِ ذات کا تعارف کرائیں گے اور اسمِ ذات ذات کا تعارف کرائے گا۔حقیقت یہ ہے کہ تعارف ہمیشہ ذات ہی کا کرایا جاتا ہے اور اسکے لئے وسیلہ اسمِ ذات ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے ابھی پڑھا ہے کہ اللہ کی معرفت اللہ سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اسمِ

ذات خود ذات کی معرفت رکھتا ہو ورنہ اگر وہ خود ہی ذات سے واقف نہیں تو دوسروں سے اسکا تعارف کیونکر کرا سکتا ہے؟۔

یہاں جس بات پر غور و تدبر کرنا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے لئے تو ذات کی معرفت کے لئے اسمِ ذات موجود ہے لیکن اسمِ ذات کے لئے ذات کی معرفت کا وسیلہ کون ہوگا؟۔ یہ ظاہر ہے کہ اسمِ ذات اور ذات کے درمیان کوئی شے ہے ہی نہیں جو وسیلہ بن سکے اس لئے لازم ہے کہ ان دونوں کا باہمی ارتباط بلا واسطہ ہو اور وہ ذات کو ذات سے پہچانے۔ میرا دعویٰ ہے کہ پوری کائنات میں ایک وجود بھی ایسا نہیں جس نے ذات کو ذات سے پہچاننے کا دعویٰ کیا ہو۔ یہ شرف صرف میرے مولا امیرؑ المومنین کو حاصل ہے جنھوں نے دعویٰ کیا کہ ''یا من دلّ علیٰ ذاتہٖ بذاتہٖ''۔ ''اے وہ جس نے اپنی ذات پر اپنی ذات کو دلیل بنایا''۔ (مفاتیح الجنان صفحہ ۱۳۳)۔

یہ جملہ سوائے اس مقدس ہستی کے کسی اور کی زبان سے ادا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ وسیلۂ آخر ہے اور اسکے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب موجود نہیں ہے۔

یہ بات ہم نے صاحبانِ علم و معرفت کے لئے عرض کی تھی اور اب ہم دو مثالوں کے ذریعے ''ممسوس فی ذات اللہ'' کا مفہوم بیان کرتے ہیں۔

آگ معنیٰ ہوتی ہے اور حرارت اسکا اسم۔ آگ کا تعارف اسکی حرارت سے ہوتا ہے۔ اگر حرارت نہ ہو تو آگ کا ادراک کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حرارت آتی کہاں سے ہے؟۔ آگ کی بالائی سطح سے یا آگ کے اندر

ہے؟۔اسطرح حرارت ''ممسوس فی النار'' ہوئی یانہیں؟۔

سورج معنی ہوتا ہے اور کرنیں اسکا اسم ۔سورج کا تعارف اسکی کرنوں سے ہوتا ہے۔اگر کرنیں نہ ہوں تو سورج کا ادراک کیا ہی نہیں جاسکتا۔یہ کرنیں کہاں سے آتی ہیں؟۔سورج کی بالائی سطح سے یا سورج کے اندر سے؟۔اور یہ کرنیں رہتی کہاں ہیں؟۔سورج کے باہر یا سورج کے اندر؟۔تو اسطرح یہ کرنیں ''ممسوس فی الشمس'' ہوئیں یانہیں؟۔

پس اسطرح جو مُظہر ذات ہوگا اسکا ''ممسوس فی ذات'' ہونا لازمی ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے عرض کیا جارہا ہے تا کہ یہ واضح ہوجائے کہ دین لفظوں میں الجھنے۔لفظوں سے کھیلنے یا لفظوں کی گرفت کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اسکا مقصد اصلِ حقیقت تک پہنچنا ہے لہٰذا کسی لفظ سے بوکھلا جانا اور سٹپٹا جانا مومن کی شان نہیں ہوسکتی۔ بہت سی باتیں آپکی نظر سے گزر چکیں اور بہت سی باتیں ابھی آئیں گی جنکے الفاظ چونکا دینے والے ہونگے تو ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔مثلاً مفاتیح الجنان صفحہ ۸۵۳ پر زیارتِ امام حسینؑ کا ایک جملہ یہ ہے۔

''السلام علیک یا آل اللہ''۔(سلام ہو آپ پر اے اللہ کی آل)۔اب اگر کوئی لفظِ ''آل'' دیکھ کر ڈکشنری کھول کر بیٹھ جائے اور یہ سوچنے لگے کہ بھلا اللہ تعالیٰ کی آل

اولاد کیسے ہو سکتی ہے تو ایسے شخص سے ہم سوال کریں گے کہ پھر ''اللہ کا گھر'' کہاں سے آ گیا؟۔ کیونکہ اللہ تو لامکان ہے۔ پس جب علیؑ کا گھر اللہ کا گھر کہلایا جا سکتا ہے تو اولادِ علیؑ آل اللہ کیوں نہیں کہلائی جا سکتی؟۔ ایسے شخص کو سوائے دردِ سر کے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا لیکن جو مومن ہو گا وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ اس سے مراد دنیاوی رشتہ داری نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سے اللہ کی یعنی اسم کی معنی سے انتہائے قربت کا استعارہ ہے۔ یہ وہ آل ہے جو ذاتِ خداوندی سے اسطرح پھوٹ کر نکلتی ہے جیسے سورج کی شعاع سورج سے۔

ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں ایک اللہ اور دوسرے اللہ میں تمیز قائم ہو چکی اور اب صرف لفظ ''اللہ'' سن کر یا پڑھ کر شور مچانے کا حق کسی کو نہیں رہا اور یہی ہمارا مقصود ہے کہ لوگ یہ جان لیں کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ اللہ استعمال ہوا ہے وہاں بیشتر مقامات پر اس سے مراد وہ اللہ ہے جو اسم ہے اور انشاء اللہ اسکی بہت سی مثالیں پیش کی جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا کہ مذہب شیعہ جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ کن کن ادوار اور کون کون سے مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے اسی لئے یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ بعینہٖ وہی مذہب ہے جو ائمۂ اطہارؑ نے ہمارے سپرد کیا تھا۔ حالانکہ اگر عمیق نظر سے مطالعہ کیا جائے اور زمانہ ائمۂ کے شیعوں کے

عقائد پر نظر ڈالی جائے تو ایک شخص بھی ہم سے اختلاف نہ کرے۔ہم نے ایک بات عرض کی تھی کہ جب ہم علیؑ کو پکارتے ہیں تو ہمارا مقصود اللہ ہوتا ہے اور جب ہم اللہ کو پکارتے ہیں تو ہمارا مقصود علیؑ ہوتا ہے۔یہاں ہم مدینۃ المعاجز جلد اصفحہ ۶۵ سے ایک واقعہ نقل کررہے ہیں مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ اگر معصومؑ کے سامنے کوئی بات کہی جائے یا کوئی کام کیا جائے اور معصومؑ خاموش رہے اور منع نہ کرے تو اسے ''تقریر معصومؑ'' کہتے ہیں اور یہ حجت ہوتی ہے اور مقامِ استدلال پر اسکا انکار نہیں کیا جاسکتا۔یہ روایت عمدۃ المطالب میں بھی موجود ہے۔

''(بحذفِ اسناد) خالدِ ربعی راوی ہیں کہ جناب امیرؑ المومنین اپنے کسی کام کے سلسلے میں مکہ آئے۔آپؑ نے ایک اعرابی کو دیکھا جو غلافِ کعبہ سے چمٹا ہوا تھا اور گڑگڑا کر کہہ رہا تھا۔''اے گھر کے مالک! یہ گھر تیرا گھر ہے اور مہمان تیرا مہمان ہے اور ہر میزبان اپنے مہمان کو مہمانی دیتا ہے۔آج رات مجھے مغفرت کی مہمانی عطا فرما''۔امیرؑ المومنین نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔''کیا تم اعرابی کی گفتگو سن رہے ہو؟''۔آپؑ کے ساتھیوں نے کہا کہ جی ہاں ہم سن رہے ہیں۔اس پر آپؑ نے فرمایا۔''اللہ کی شان اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ وہ اپنے مہمان کو خالی ہاتھ لوٹائے''۔دوسری رات آپؑ حرم میں تشریف لائے تو آپؑ نے دیکھا کہ وہ اعرابی اسی رکن کے ساتھ چمٹ کر کہہ رہا تھا۔''اے وہ ذات جو اپنی عزت میں عزیز ہے اور

عزت کے اعتبار سے تجھ سے زیادہ صاحبِ عزت کوئی نہیں۔اپنی عزت کے صدقے میں مجھے بھی ایسی عزت عطافرما جسکی ماہیت کے متعلق کسی کوعلم نہ ہو۔میں تیرے حضور محمدؐ وآلِ محمدؑ کے حق کاوسیلہ دیکر تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے وہ کچھ عطافرما جو تیرے علاوہ اورکوئی کسی کونہیں دے سکتااور مجھ سے وہ مصائب دورفرما جو تیرے علاوہ کوئی دورنہیں کرسکتا''۔حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔''خدا کی قسم یہ سریانی میں اسمِ اعظم ہے۔اس نے اللہ سے جنت طلب کی ہے اور اللہ نے اسے دے دی ہے اوراس نے اللہ سے دوزخ سے محفوظ رہنے کی دعا کی ہے اور اللہ نے اسے دوزخ سے بچالیا ہے''۔تیسری رات آپ حرم میں تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ وہ اعرابی اسی رکنِ کعبہ سے چمٹ کر یہ مناجات کررہا تھا۔''اے وہ ذات جسے مکان اپنے اندر سمانے سے قاصر ہے اور اے وہ ذات جس سے کوئی بھی مکان خالی نہیں ہے اور جو بغیر کسی کیفیت کے ہر مقام پر موجود ہے۔اعرابی کو چار ہزار درہم عطافرما''۔اسکی یہ التجاء سن کر حضرت امیرؑ المومنین آگے بڑھے اور فرمایا۔''اے اعرابی! تو نے اپنے رب سے مغفرت کی مہمانی طلب کی۔اللہ نے تجھے عطا فرمائی۔تو نے اللہ سے جنت مانگی۔اللہ نے تجھے عنایت کی اور تو نے اللہ سے دوزخ سے بچنے کا سوال کیا۔اللہ نے تجھے دوزخ سے بچالیا۔اورآج رات تو اللہ سے چار ہزار درہم مانگ رہا ہے؟''۔

اس مقام پر ہم چند لمحوں کے لئے رکتے ہیں۔آپ پوری ایمانداری اور دیانت داری سے بتایئے کہ وہ اعرابی کس سے سوال کر رہا تھا؟۔کوئی فردِ واحد بھی ایسا نہ ہوگا جو یہ کہے کہ وہ اللہ سے نہیں مانگ رہا تھا۔اور وہ یقیناً اللہ ہی سے مانگ رہا تھا۔لیکن آیئے ہم اسی اعرابی سے یہ سوال پوچھتے ہیں۔یہ یاد رہے کہ حضرت امیرؑ المومنین اسکے سامنے کھڑے تھے اور انھوں نے اعرابی کی بات سن کر نہ صرف یہ کہ خاموشی اختیار کی بلکہ اسکی حاجت کو بھی روا کیا۔

اعرابی نے کہا۔'' آپؑ کون ہیں؟''۔آپؑ نے فرمایا۔'' میں علیؑ ابن ابی طالبؑ ہوں''۔اعرابی نے جیسے ہی آپؑ کا نام سنا تو اس نے کہا۔''خدا کی قسم! آپؑ ہی میرا مقصود ہیں اور میری حاجت کا تعلق آپؑ ہی سے ہے''۔

یہی وہ عقیدہ ہے جسے معصومؑ کی سند حاصل ہے۔اس پر اعتراض کرنا یا ناک بھوں چڑھانا یا فتوے صادر کرنا درحقیقت معصومؑ کی تکذیب کرنا ہے۔

ہم مدینۃ المعاجز جلد ا صفحہ ۲۶۷ سے اسی قسم کا ایک اور واقعہ نقل کر رہے ہیں اور یہ واقعہ بھی حضرت امیرؑ المومنین کی موجودگی میں پیش آیا۔

''سید مرتضٰی علم الھدیٰ نے اپنی اسناد سے حضرت عمار یاسرؓ سے نقل کیا۔انھوں نے کہا۔''۱۷ صفر کے دن میں کوفے میں حضرت امیرؑ المومنین کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ باہر سے شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں۔اس وقت آپؑ دکۃ القضاء پر بیٹھے لوگوں کے فیصلے کر رہے تھے۔آپؑ نے مجھ سے فرمایا۔''عمارؓ! ذوالفقار لاؤ''۔میں نے

ذوالفقار پیش کی۔آپؑ نے اسکو نیام سے نکال کر اپنے پاس رکھا اور فرمایا۔''عمارؓ! آج میں اہلِ کوفہ کی سامنے ایک عقدہ حل کروں گا جس سے اہلِ ایمان کی اطاعت اور مخالفین کے نفاق میں اضافہ ہوگا۔جاؤ جو لوگ دروازے پر کھڑے ہیں انھیں میرے پاس لاؤ''۔عمارؓ کہتے ہیں کہ میں باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک عورت ایک محمل میں بیٹھی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔''اے پناہ طلب کرنے والوں کو پناہ دینے والے! اے عشاق کی منزلِ آخر! اے زبردست قوت کے مالک! (شدید القوی)۔اے یتامیٰ کو طعام دینے والے! ۔اے مفلس کو رزق فراہم کرنے والے! (رازق)۔اے بالیدہ ہڈیوں کو زندہ کرنے والے! (محی)۔اے وہ قدیم جس سے پہلے کوئی نہ تھا! ۔اے بے یارو مددگار کے یاورو ناصر! ۔اے تہی دستوں کا خزانہ! ۔میں نے تیری ہی طرف اپنے رخ کو متوجہ کیا اور میں نے تجھے ہی اپنا وسیلہ بنایا ہے۔آج میرے چہرے کو آبرومند بنانا اور میری مصیبت کو مجھ سے دور کرنا''۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ وہ کن الفاظ سے اپنے مطلوب کو یاد کررہی ہے۔جب وہ عورت حضرت امیرؑ المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس نے عرض کیا:۔

''مولاؑ! میں آپؑ کا قصد کرکے آئی ہوں''۔

آپ نے محسوس کرلیا ہوگا اور بخوبی محسوس کرلیا ہوگا کہ زمانہ ائمہؑ کے مخلص شیعوں کے عقائد کیا تھے۔یہ عقائد ملیا میٹ کیسے ہوئے؟۔اسکے دو اسباب تھے۔ایک تو مخالفین

اور صاحبانِ اقتدار کا خوف۔ اور یہ حقیقی سبب ہے اور جواز رکھتا ہے اس لئے اس پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی لیکن دوسرا سبب منافقین کی کارستانیاں تھیں جنھوں نے شیعوں کی صفوں میں گھس کرلباسِ علم پہن لیا اور مذہب شیعہ کو تہس نہس کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ لکھنؤ میں ایک عیسائی مشنری کے سربراہ سے ایک مرتبہ ایک اخباری نمائندے نے پوچھا کہ ''آپ اتنے عرصے سے کام کررہے ہیں۔ اب تک آپ نے کتنے مسلمانوں کو عیسائی بنایا؟''۔ اس نے جواب دیا کہ ''آپ کا سوال ہی غلط ہے۔ آپ مجھ سے یہ پوچھئے کہ ہم نے کتنوں کو مسلمان چھوڑا؟''۔ منافقین کا مقصد بھی یہ ہرگز نہیں تھا کہ شیعہ دنیا سے ختم ہوجائیں اور نہ وہ ایسا کرسکتے تھے بلکہ انکا مشن ہی یہ تھا کہ لوگ شیعہ کہلاتے رہیں مگر شیعہ نہ رہیں۔ یعنی بوتل میں زہر بھرا ہوا ہو لیکن اس پر لیبل ''تریاق'' کا لگا ہوا ہو۔ اسی لئے ہم بھی انتہائی محتاط طریقے سے عقائدِ شیعہ کو بیان کرتے ہیں کیونکہ اسوۂ ائمۂ طاہرین ہمارے سامنے ہے۔ میرے مولا امام محمد تقی نے فرمایا تھا۔ ''خدا کی قسم! اگر اس بات کا خطرہ نہ ہوتا کہ اہلِ باطل اور گمراہ نسلِ کفر ہم پر حملہ آور ہو جائے گی اور اہلِ شرک و شک و نفاق ہم پر ٹوٹ پڑیں گے تو میں ایسی ایسی باتیں بتاتا جسے سن کر اوّلین و آخرین حیرت میں پڑ جاتے''۔ اسکے بعد خود آپ نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ دیا اور فرمایا۔ ''اے محمدؐ تم بھی خاموش رہو جسطرح تمھارے آباءِ کرام خاموش رہے''۔ ہمارا مقصد بھی لوگوں کو شیعہ بنانا نہیں ہے بلکہ جتنے شیعہ باقی رہ گئے ہیں ان کو بچانا ہے کیونکہ انھیں خطرہ غیروں سے نہیں بلکہ ان

سے ہے جنھوں نے انکے مذہب کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظِ ''اللہ'' استعمال ہوا ہے وہاں بیشتر مقامات پر اس سے مراد وہ اللہ ہے جو اسم ہے۔ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ پورا قرآن یہاں نقل کر کے رکھ دیں اور نہ ہی ہمارا یہ مقصد ہے۔ جسکو ماننا ہو گا وہ ایک آیت سے بھی مان لے گا اور جسکا مقصد ماننا ہے ہی نہیں اسکو اگر پورا قرآن بھی پڑھ کر سنا دو تو وہ جہاں ہے وہیں رہے گا اور ایسے لوگوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔

خبیر

۱۔ بقرہ ۲۳۴۔ ''اب جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب خبردار (خبیر) ہے''۔

۲۔ بقرہ ۲۷۱۔ ''اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف (خبیر) ہے''۔

۳۔ آلِ عمران ۱۸۰۔ ''اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی میراث ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پورا پورا خبردار (خبیر) ہے''۔

اس مطلب پر قرآن مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں جن میں سے ہم نے صرف تین یہاں نقل کی ہیں۔ ان تینوں آیات میں کہا گیا ہے کہ ''خبیر'' اللہ ہے اور ایک موقعے پر یہ تاکید بھی موجود ہے کہ خبیر صرف اللہ ہے اور اسکے سوا کسی اور سے خبر نہ لو۔

۴۔ فاطر ۱۴۔ ''اور تمھیں خبیر کیطرح کوئی دوسرا خبر دینے والا نہ ہو''۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "اللہ" جو خبیر ہے اور جسکی طرح کوئی دوسرا خبر دے ہی نہیں سکتا کون ہے؟۔ یہ وہ اللہ ہے جو معنی ہے؟۔ یا وہ اللہ ہے جو اسم ہے؟۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اوّلین و آخرین میں ایک بھی ہستی ایسی نہیں ہے جس نے خبیر ہونے کا دعویٰ کیا ہو سوائے میرے مولا امیرؑ المومنین کے۔ اور کسی کا نام لینے سے پیشتر ہماری وہ بات ذہن میں رکھئے کہ جس طرح دعویٰ بغیر دلیل کے بیکار ہوتا ہے اسی طرح دلیل بھی بغیر دعوے کے بے معنی ہوتی ہے لہٰذا ہماری بات کو رد کرنے کے لئے پہلے آپ کو دعویٰ تلاش کرنا پڑے گا۔

حکمتِ بوتراب (ترجمہ غرر الحکم و درر الکلم) جلد۲ صفحہ ۵۰ اقول ۲۶۰۵۔

حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ "یچ یچ اے سننے والے! اور کوشش کر کوشش کر اے عقل والے! اور تجھے اس خبیر (یعنی خود حضرت امیرؑ المومنین) کیطرح سے کون خبر دے گا"۔

پس معلوم ہو گیا کہ یہ خبیر کون ہے اور مولاؑ کے اس فرمان کی توثیق خود قرآن نے کر دی جہاں اللہ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ وہ خبیر سے سوال کریں۔

فرقان ۵۹۔ "جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر مستولی ہوا۔ وہ رحمٰن ہے پس (اے رسولؐ) تو اسکے متعلق کسی خبیر سے پوچھ"۔

پس ثابت ہو گیا کہ ''اللہ جو خبیر ہے'' سے مراد وہ اللہ ہے جو اسم ہے۔ایسا ماننا ہی قرآن کا منشاء و مراد ہے اور ایسا نہ ماننا قرآن کی مخالفت اور اپنے خواہشِ نفس کی پرستش کرنا ہے اور حقیقتاً یہ وہ وہابیت ہے جو بعض لوگوں کے خون میں سرائیت کر گئی ہے۔

علی العظیم

یہاں ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اسکا مقصد صرف اور صرف دعوتِ فکر و تدبر دینا اور قوتِ عقلیہ کو انگیخت کرنا ہے۔لہٰذا اس مقام پر بحث و مناظرہ کا باب نہ کھولا جائے۔جسکے دل کو بات لگتی ہے وہ مان لے اور جسکی عقل انکار کرتی ہو وہ اپنے مقام پر رہے۔

بقرہ ۲۵۵۔ یہ آیت '' آیت الکرسی'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔یہ دو جملوں میں گھری ہوئی ہے۔''اللّٰہ لاالٰہ الّا ھو ……و ھو العلیّ العظیم''۔

اب اسکا مکمل ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:۔

''اللہ وہ ہے کہ اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ زندہ ہے اور ہمیشہ قائم ہے۔اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسکی ملکیت ہے۔کون شخص ایسا ہے جو بغیر اسکی اجازت کے اسکے حضور میں سفارش کرے۔جو کچھ انکے سامنے ہے اور جو کچھ انکے پیچھے ہے وہ سب کو جانتا ہے اور اسکے علم میں سے کسی بھی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اسکے جسے وہ چاہے۔اسکی کرسی سب آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور ان دونوں کی حفاظت اسے تھکاتی نہیں اور وہ علی العظیم

ہے''۔

یہ آیت ''اللہ'' سے شروع ہوتی ہے۔پھر اسی اللہ کی کچھ صفات بیان کی گئی ہیں اور آخر میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ جسکی صفات بیان کی گئی ہیں وہ ''علی العظیم'' ہے۔یعنی اللہ جب اپنی صفتِ وحدانیت والوہیت ومعبودیت کے ساتھ منزلِ ظہور وشہود پر آتا ہے تو علی العظیم کہلاتا ہے۔

پہلی صفت اسکی یہ ہے کہ وہ زندہ وقائم ہے اور وہ کبھی سوتا نہیں ہے۔ہم یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کون ہے جو کبھی نہیں سوتا۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۷۵۴۔زیارت امیر المومنین کا ایک جملہ:۔

''آپ وہ زندہ آنکھیں ہیں جو سوتی نہیں۔آپ ہی حکماء الٰہی ہیں کہ خدا آپ کے ذریعے فیصلے کرتا ہے''۔

پس یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ زندہ و قیوم جو کبھی نہیں سوتا وہ علی العظیم ہے۔نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ فیصلہ بھی علی العظیم ہی کرتا ہے کہ کس کو شفاعت کی اجازت دی جائے اور کس کو نہ دی جائے کیونکہ وہ حکماءِ الٰہی ہے جسکے ذریعے سے اللہ فیصلے کرتا ہے۔جہاں تک زمین و آسمان کی ملکیت کا سوال ہے تو سورۂ جاثیہ کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے۔''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس نے سب کو تمھارے لئے مسخر کردیا''۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ بہت سے لوگ جن میں علماء بھی شامل ہیں اس آیت کو عام لوگوں کیطرف موڑتے ہیں حالانکہ یہ بات سراسر خلافِ عقل ہے۔ ''تسخیر'' کہتے ہیں مکمل قبضے کو۔اور مکمل قبضے کا مطلب ہوتا ہے مکمل اختیار۔اگر یہاں عام لوگ مراد لئے جائیں تو پھر لوگوں کے پاس یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ کائنات میں جو چاہیں تبدیلی کر دیں۔سورج اور چاند کے راستے بدل دیں۔سمندروں کو ساکن کر دیں۔ہواؤں کا رخ موڑ دیں۔ماضی کو مستقبل اور مستقبل کو ماضی بنا دیں۔بے موسم کے پھل لگا دیں۔مگر لوگ تو بے چارے اتنی ترقی کر لینے کے باوجود مظاہرِ فطرت کے سامنے عاجز و مجبور ہیں۔اور اگر تسخیر سے یہ مراد لیا جائے کہ انسان چاند پر پہنچ گیا اور دوسرے سیاروں پر کمند پھینک رہا ہے تو کسی جگہ پہنچ جانے سے وہ جگہ تسخیر نہیں ہو جاتی۔میں اگر آپ کے گھر پہنچ جاؤں تو اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ میں نے آپ کے گھر کو تسخیر کر لیا۔پس یہ اسماء اللہ ہی ہیں جنکے ہاتھ میں کائنات کا ہیولیٰ مسخر ہے۔وہ جب چاہیں کائنات میں جو چاہیں تبدیلی کر دیں۔وقت کی لگام ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ذرے ذرے پر ان ہی کی اطاعت واجب ہے۔لہٰذا اس آیت کا تعلق صرف ان ہی سے ہو سکتا ہے۔انکے علاوہ کسی اور پر اسکا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔نہ مشاہدہ اسکی تائید کرتا ہے اور نہ عقل۔

جہاں تک علم کا تعلق ہے تو حضرت امیرؑ المومنین کا یہ فرمان آپکی نظر سے گزر چکا کہ ''میں ہوں اللہ کا علم''۔اب رہی کرسی کی بات تو اسکا تعلق خلق سے ہے۔ہماری

زمین ایک نظامِ شمسی کا حصہ ہے جسکی وسعت کا ادراک آج تک نہیں کیا جا سکا۔ اس نظام میں موجود تمام سیارے ہمارے سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں اور کروڑہا ستارے اسکی کشش کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ایسے کروڑں سورج ایک کہکشاں میں ہیں اور ہر سورج کا اپنا اپنا نظامِ شمسی ہے۔ ان میں سے کچھ سورج ہمارے سورج سے کروڑں گنا بڑے ہیں۔ اور جس کہکشاں میں یہ تمام سورج ہیں اس جیسی لاتعداد کہکشائیں موجود ہیں اور یہ تمام کہکشائیں اور تمام خلائیں کرسی میں ہیں۔ کرسی کی اسی وسعت کا ذکر اللہ نے اس آیت میں کیا ہے۔ ''وسِعَ کرسیّہ السمٰوٰتِ والارض''۔ (اس نے اپنے آسمانوں اور زمین کی کرسی کو وسعت دی ہے)۔

اس وسعت کا تعلق خلق سے ہے۔ ''کُلَّ یومٍ ھو فی شان'' سے ثابت ہے کہ اللہ ہر روز ایک نئ تخلیق کرتا ہے اور اپنی کرسی کی وسعت کو مسلسل بڑھاتا رہتا ہے۔ خلق کا تعلق ہاتھ سے ہے اور حفاظت کرنے کا تعلق آنکھ سے۔ پس یہ وہی یداللہ ہے جس نے کرسی کو وسعت دی ہے اور یہ وہی عین اللہ ہے جو اسکی حفاظت کرتی ہے اور یہ وہی قدرت وقوتِ خدا ہے جو اسے تھکنے نہیں دیتی اور وہ یقیناً علی العظیم ہے۔

دورِ حاضر کے منفرد شاعر جناب احمد نوید نے خطبۂ افتخاریہ کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے حضرت امیرٔ المومنین کے ایک قول کو کیا خوب نظم کیا ہے۔

خدا گواہ میں خود کو خدا نہیں کہتا

خدا ہی خود کو علی العظیم کہتا ہے

جو کچھ ہم نے بیان کیا اسکی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر چہ آیت الکرسی ''وھو العلی العظیم'' پر ختم ہو جاتی ہے لیکن ہمیں حکم ہے کہ اسے ''ھم فیہا خلدون'' تک پڑھیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اگلی آیات میں ولایت کا ذکر ہے جس سے آیت الکرسی کا مفہوم کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

اب اگر کوئی ''لا الہ الا ھو'' کی وجہ سے الجھن میں پڑا ہوا ہو تو اسکی الجھن بھی ہم دور کیے دیتے ہیں۔

لا الہ الا اللہ

یہاں ہم پانچ احادیث کے ذریعے لا الہ الا اللہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ا۔ التوحید صفحہ ۱۹۔ حدیث ۵ تا ۷۔ ان تینوں احادیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جو شخص مر جائے اور اللہ کا کسی کو شریک نہ کرے۔ اسکے اعمال اچھے ہوں یا برے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال کی قسم کھاتا ہے کہ وہ اپنی توحید والوں کو تا بہ ابد آتشِ جہنم کا عذاب نہ دے گا۔

۲۔ التوحید صفحہ ۲۲۔ حدیث ۲۲۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ اللہ نے فرمایا۔ ''لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے۔ جو اس قلعے میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ رہا''۔

ان احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرطِ نجات لا الہ الا اللہ ہے اور جو بھی اس قلعے میں داخل ہوگیا وہ اللہ کے عذاب سے مامون ہوگیا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قلعہ جسے اللہ نے لا الہ الا اللہ کہا ہے کیا چیز ہے۔

۳۔ امالی صدوق صفحہ ۲۴۵۔ حدیث ۹۔

''رسولؐ خدا نے جبرئیلؑ سے۔ انھوں نے میکائیلؑ سے۔ انھوں نے اسرافیلؑ سے۔ انھوں نے لوح سے اور اس نے قلم سے روایت کی کہ اس نے کہا کہ اللہ نے فرمایا۔ ''ولایتِ علیؑ ابن ابی طالبؑ میرا قلعہ ہے اور جو کوئی میرے قلعے میں داخل ہوگا اسے میری دوزخ سے امان ہے''۔

پس معلوم ہوگیا کہ حقیقت لا الہ الا اللہ ولایتِ علیؑ ہے اور اسی کا ذکر آیت الکرسی میں کیا گیا ہے۔ یعنی ''لا الہ الا اللہ'' باطنِ ولایت ہے اور ''علی'' ''ولی اللہ'' ظاہرِ ولایت ہے اور اسطرح علیؑ اوّل بھی ہے اور آخر بھی۔

اب ہم مزید اٹھارہ شواہد پیش کرتے ہیں جن سے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہوجائے گی کہ قرآنِ مجید میں بیشتر مقامات پر لفظِ ''اللہ'' اسم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن ہم نے ان شواہد کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ انکے ذریعے اس سوال کا جواب بھی دے دیا جائے جو ہمارے احباب کی ایک کثیر تعداد نے ہم سے پوچھا ہے۔ یہ سوال اس حدیث سے متعلق ہے جو ہم نے کشف العقائد میں نقل کی تھی۔ اس حدیث میں معصومؑ فرماتے ہیں۔ ''لنا مع اللہ حالات'' فیہا نحن ھو و ھو

نحن و مع ذالك هو هو و نحن نحن "۔یعنی اللہ کے ساتھ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ کبھی ہم وہ بن جاتے ہیں اور کبھی وہ ہم بن جاتا ہے لیکن اسکے باوجود وہ وہ رہتا ہے اور ہم ہم رہتے ہیں۔

ان شواہد سے ظاہر ہو جائے گا کہ وہ ہم کیسے بنتا ہے اور ہم وہ کیسے بنتے ہیں۔

ہم وہ ہو جاتے ہیں

ا۔نساء ۱۷۵۔"پس وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لا چکے اور انھوں نے اس سے تمسک کیا تو وہ انھیں عنقریب اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا"۔

اس آیت میں ان مومنین کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ سے تمسک کرتے ہیں۔اعتصام یا تمسک کے معنی چمٹ جانا۔مضبوطی سے تھام لینا۔اطاعت و اتباعِ غیر مشروط کرنا اور محبت کرنا ہے۔اس اعتبار سے اللہ سے تمسک کرنا بعید از عقل ہے اور اسکا اتباع کرنا محالِ ابدی۔کیونکہ اتباع کے لئے کسی عمل کرنے والے کی ضرورت ہے۔پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل کرنے والا مشاہدے میں بھی آئے کیونکہ اتباع مشاہدہ کرکے ہی کیا جاسکتا ہے۔لہٰذا تلاش کرنا چاہئے کہ یہ "اللہ" کون ہے جس سے تمسک رکھنا ضروری ہے؟۔

ہم دو مقامات دکھاتے ہیں جہاں اعتصام بھی ہے اور تمسک بھی جن سے معلوم ہوگا کہ ان دو الفاظ سے منشاءِ خداوندی کیا ہے۔اسکے بعد ہم انشاءاللہ مذکورہ بالا آیات کی تفسیر

بھی پیش کریں گے۔

(الف)۔بقرہ ۲۵۶۔ ''پس جس نے کفر کیا طاغوت سے اور ایمان لایا اللہ پر تو یقیناً اس نے ایسی مضبوط رسی کو تھام لیا ہے جسکے لئے ٹوٹنا ہے ہی نہیں''۔

تفسیر صافی صفحہ ۷۱ پر رسولؐ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ''جو کوئی یہ چاہے کہ وہ ایسی رسی کو پکڑے (تمسک کرے) جو کبھی نہ ٹوٹے تو اسے چاہئے کہ میرے بھائی اور میرے وصی حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولایت سے تمسک کرے۔ اسلئے کہ جو شخص اس سے محبت اور تولا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ہلاک ہونے نہیں دے گا اور جو اس سے بغض رکھے گا اسے نجات نہ دے گا''۔

یہاں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے اور لا الہ الا اللہ سے کیا مراد ہے۔

(ب)۔آلِ عمران ۱۰۳۔ ''اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو (اعتصام کرو) اور فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ''۔

تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ حبل اللہ آلِ محمدؐ ہیں جن کے ساتھ اعتصام کرنے کا حکم خداوند عالم نے دیا ہے۔ اور اسی تفسیر میں امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں کہ حبل اللہ سے مراد حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں۔

سورۂ نساء کی جو آیت آپکی خدمت میں پیش کی گئی تھی اسکی تفسیر میں تفسیر فرات صفحہ ۵۸ پر امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''اللہ سے تمسک کیا سے مراد یہ ہے کہ علیؑ ابن ابی

طالبؑ کی ولایت سے تمسک کیا"۔ پس یہاں "اللہ" سے مراد معنی نہیں بلکہ اسم ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں "ہم"۔ "وہ" ہو جاتے ہیں۔

۲۔ یہ اور اس سے اگلی آیت بھی تمسک ہی کے بارے میں ہے۔

نساء ۱۴۶۔ "سوائے انکے جنھوں نے توبہ کی اور نیکی اختیار کی اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کر دیا پس وہ مومنین کے ساتھ ہونگے"۔

۳۔ حج ۷۸۔ "پس تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو مضبوطی سے تھامے رہو۔ وہی تمھارا مولا ہے۔ پس وہ کیسا ہی اچھا مولا اور کیسا ہی اچھا مددگار ہے"۔

۴۔ حٰم سجدہ ۳۰۔۳۱۔ "یقیناً وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس قول پر قائم ہو گئے ان پر فرشتے نازل ہونگے اور کہیں گے کہ تم خوف نہ کرو اور نہ حزن کرو اور تمھیں اس جنت کی خوشخبری ہو جسکا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی تمھارے دوست ہیں"۔

یہ آیت بالکل واضح ہے اور کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ خوش خبری ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جنھوں نے کہا کہ "ہمارا رب اللہ ہے"۔ (ربنا اللہ) پھر وہ اپنے اسی قول یعنی ربنا اللہ پر جم گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کس چیز پر جم گئے۔ پس جس چیز پر وہ قائم ہوئے ہونگے وہی "ربنا اللہ" ہے۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ امام رضاؑ سے پوچھا گیا کہ استقامت سے کیا مراد

ہے؟۔آپؑ نے فرمایا۔’’خدا کی قسم وہی جس پر تم قائم ہو‘‘۔تفسیر قمی میں ہے کہ’’اسکا مطلب ولایت جناب امیرؑ المومنین پر قائم رہنا ہے‘‘۔اورتفسیر فرات میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔’’ربنا اللہ سے مراد ولایت علیؑ ہے‘‘۔

ان تفاسیر سے ثابت ہوگیا کہ قائم رہا جائے گا ولایت علیؑ پر اور کہا جائے گا’’اللہ‘‘ پر قائم رہنا۔اوراسی کا مطلب ہے کہ’’ہم‘‘۔’’وہ‘‘ہو جاتے ہیں۔

۵۔نور ۳۵۔’’ اللہ نور السمٰوٰتِ والا رض ‘‘۔(اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے)۔

التوحید صفحہ ۱۲۳۔حدیث ا۔امام رضاؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا۔’’یہ نور آسمان والوں کے لئے ہادی ہے اور زمین والوں کے لئے رہبر ہے۔یہ نور اللہ کا غیر ہے‘‘۔

ہادی کا مطلب ہے’’ہدایت کرنے والا‘‘اور رہبر کا مطلب ہے’’امام‘‘۔ہم قرآن سے ہی پوچھتے ہیں کہ ان دونوں سے کون مراد ہے۔

رعد ۷۔’’سوائے اسکے نہیں کہ (اے رسولؐ) تو ایک ڈرانے والا ہے اور ہر قوم (یعنی تمام اقوام) کے لئے ایک ہادی ہے‘‘۔یعنی قومیں بہت سی ہیں مگر انکی ہدایت کرنے والا ایک ہی ہے۔شیعہ سنی تفاسیر متفق ہیں کہ’’منذر‘‘ سے مراد رسولؐ اللہ ہیں اور ’’ہادی‘‘ سے مراد جناب امیرؑ المومنین ہیں۔

تفسیر صافی صفحہ ۲۵۸ پر بحوالہ تفسیر مجمع البیان لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو

آنحضرت نے فرمایا۔ ’’میں تو ڈرانے والا ہوں اور علیؑ میرے بعد ہادی ہیں‘‘۔ پھر حضرت علیؑ سے فرمایا۔ ’’یا علیؑ میرے بعد ہدایت پانے والے تمھارے ہی ذریعے سے ہدایت پائیں گے‘‘۔ اسی طرح تفسیر عیاشی میں شوریٰ ۵۲ کی تفسیر میں معصومؑ فرماتے ہیں۔ ’’اللہ جس کسی کی بھی ہدایت کرتا ہے وہ علیؑ ہی کے ذریعے کرتا ہے‘‘۔ اب رہا رہبر یعنی امام کا سوال تو سورۂ یٰسین ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ’’ہم نے ہر شے کو امام مبین میں جمع کر رکھا ہے‘‘۔

تفسیر صافی صفحہ ۴۲۱ پر بحوالہ تفسیر قمی جناب امیرؑ المومنین سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ ’’خدا کی قسم وہ امام مبین میں ہوں‘‘۔ تفسیر برہان صفحہ ۸۸۶ پر امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ رسولؐ اللہ حضرت امیرؑ المومنین کیطرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ ’’امام مبین یہ ہیں۔ خداوندِ عالم نے جنکی ذات میں کُل شے کا علم احاطہ کیا ہوا ہے‘‘۔

پس نور یہ ہیں جسے قرآن نے اللہ کہا ہے۔

۶۔ احزاب ۲۵۔ ’’قتال میں اللہ ہی مومنین کے لئے کافی ہوا‘‘۔

قتال کے معنی ہیں جسمانی اور عملی طور پر جنگ کرنا۔ یہ آیت جنگِ خندق سے متعلق ہے۔۔ کیا جنگ خندق میں اللہ خود آ کر لڑا تھا؟۔ اور کیا تلوار اللہ نے چلائی تھی؟۔ اور کیا عمرو ابن عبدود کو اللہ نے قتل کیا تھا؟۔ پھر اللہ اپنے لئے لفظِ قتال کا استعمال کیوں کر رہا ہے؟۔ پس معلوم ہوا کہ وہ اللہ جو مومنین کے لئے قتال میں کافی

ہوا معنیٰ نہیں بلکہ اسم ہے اور اس آیت میں حضرت امیرؑ المومنین کو ہی اللہ کہا گیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ''ہم وہ ہو جاتے ہیں''۔

۷۔انفال ۱۷'' وما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمی ''۔(اور تو نے کنکریاں نہیں پھینکی تھیں جبکہ تو نے ہی پھینکی تھیں بلکہ یہ اللہ نے پھینکی تھیں)۔

اس آیت میں ایک فعل کو دو طرف منسوب کیا گیا ہے۔یعنی فعل ایک ہے اور فاعل دو۔رسولؐ کو تو کنکریاں پھینکتے ہوئے ساری دنیا نے دیکھا مگر اللہ کو کنکریاں پھینکتے ہوئے کس نے دیکھا؟۔آیئے ہم آپکو بتاتے ہیں کہ وہ اللہ جو کنکریاں پھینکنے کے عمل میں شریک تھا وہ کون تھا؟۔

علیؑ فی القرآن صفحہ ۱۵۳۔ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔''مجھے کنکریوں کی ایک مٹھی اٹھا دو''۔حضرت علیؑ نے اٹھا کر دی۔آپؐ نے وہ کنکریاں کفار کے منہ پر پھینکیں۔کوئی کافر ایسا نہ بچا جسکی آنکھیں کنکریوں سے بھر نہ گئی ہوں۔

معلوم ہو گیا کہ کنکریاں اللہ کے ہاتھ نے اٹھا کر دیں اور رسولؐ کے کنکریاں پھینکنے کے عمل میں پہل کی لہٰذا شریک ہوا اور یہاں اسی کے لئے لفظ اللہ استعمال کیا گیا ہے۔

۸۔یہاں ہم تین آیات پیش کریں گے تا کہ صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

(الف)۔ رعد۴۳۔ ''اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے کہتے ہیں کہ تو (اللہ کا) رسولؐ نہیں ہے۔(اے رسولؐ) تم کہدو کہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ جسکے پاس کلِ کتاب کا علم ہے(یعنی علیؑ)''۔

(ب)۔نساء ۷۹۔ ''اور (اے محمدؐ) ہم نے تجھے لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا اور گواہی کے لئے اللہ ہی کافی ہے''۔

(ج)۔بنی اسرائیل ۹۶۔ ''(اے رسولؐ) کہدو کہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لئے اللہ کافی ہے''۔

پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کی رسالت کے دو گواہ ہیں۔ایک اللہ اور دوسرا وہ جسکے پاس کلِ کتاب کا علم ہے اور یہ دو گواہ کافی ہیں۔اللہ نے یہاں نصابِ شہادت کو لازمی گردانا ہے اور دو گواہ قرار دیئے ہیں لیکن دوسری اور تیسری آیت میں صرف ایک گواہ کو کافی قرار دیا ہے۔اگر ظاہر بیں نگاہوں سے دیکھا جائے تو اس طرح (معاذ اللہ) قرآن میں تضاد ثابت ہوتا ہے۔علماء کا فرض ہے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس تضاد کی توجیہ کریں اور قرآن مجید کی ان آیات میں مطابقت ثابت کریں۔جب تک وہ یہ کام نہ کرلیں اسوقت تک انھیں ہماری کسی بات پر اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

یہاں سب سے پہلے ''اللہ کی گواہی'' کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ نے اپنی گواہی کا ذکر کیا ہے۔یہ بات آپ اور ہم تو عقیدتاً مان لیں گے لیکن دنیا بھر کو یہ بات سمجھانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ اللہ کی گواہی

انسانی مشاہدے میں نہیں آتی اور جو شے مشاہدے میں نہ آتی ہو اسے ثابت کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اللہ نے گواہی دی کہ بیشک اسکے سوا کوئی معبود نہیں''۔

اللہ کی گواہی میں کوئی شک نہیں ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اپنی توحید کی گواہی ہو یا اپنے رسول ؐ کی رسالت کی گواہی۔یہ دونوں گواہیاں اللہ نے اپنے لئے نہیں بلکہ لوگوں کے لئے دی ہیں تا کہ لوگوں کو توحید ورسالت پر یقین آجائے اور وہ ایمان لے آئیں۔لیکن جب اللہ کی گواہی لوگوں کے فہم وادراک سے بالاتر ہو تو انکی سمجھ میں کیسے آئے گی؟۔اور جب سمجھ میں نہیں آئے گی تو وہ قبول کیسے کریں گے؟۔اور جب قبول ہی نہیں کریں گے تو گواہی دینے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔دوسری اور حتمی بات یہ کہ کسی بھی اصول کے تحت مدعی خود اپنا گواہ کبھی نہیں بن سکتا۔جبکہ یہ ظاہر ہے کہ حکیم کا کوئی فعل عبث نہیں ہوا کرتا۔لہٰذا غور کرنا پڑے گا کہ جب اللہ خود گواہی دینے کا ذکر کرتا ہے تو اسکا مطلب کیا ہے؟۔بصورتِ دیگر اللہ کی گواہی سے توحید و رسالت کو بظاہر کوئی فائدہ پہنچتا نظر نہیں آتا۔لہٰذا ہمارے پاس کوئی چارۂ کار رہے ہی نہیں سوائے اسکے کہ جہاں جہاں اللہ کی گواہی کا ذکر ہے وہاں اللہ سے مراد معنیٰ نہیں بلکہ اسم لیں کیونکہ اسم جو گواہی دیتا ہے وہ دیکھی اور سنی جاتی ہے اور درحقیقت اسی کی گواہی پر توحید ورسالت کا دارومدار ہے۔

اب رہ گئی رعد ۴۳ اور نساء ۷۹ میں تضاد کی بات تو ہم اسکا بھی مختصراً جائزہ لئے لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رعد ۴۳ میں جہاں بظاہر دو گواہیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی ایک ہی شہادت ہے البتہ اس میں شہادت دینے والے کے دو روپ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ علیؑ اسم اللہ تو ہے ہی لیکن خود اپنی ذات میں ایک معنی بھی ہے جیسا کہ آنجنابؑ خود ارشاد فرماتے ہیں۔ ''میں وہ معنی ہوں جس پر اسم واقعہ نہیں ہوسکتا''۔ علیؑ ''عالمِ کلِ کتاب'' ہے اپنے معنی کے طور پر اور اللہ ہے اسم اللہ کے طور پر۔ پس اس آیت میں شہادت دینے والے کی حیثیات دو ہیں لیکن شہادت ایک ہی ہے اور مراد یہ ہے کہ علیؑ رسالتِ رسولؐ کی گواہی اللہ کی طرف سے بھی دیتا ہے اور اپنی طرف سے بھی۔ اللہ کی گواہی سے مراد وہ معجزات وبیّنات ہیں جو رسولؐ سے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ بات نا قابلِ تردید ہے کہ معجزات وبیّنات کا تعلق ولایت سے ہوتا ہے کیونکہ معجزے کا مطلب ہی اشیاءِ عالم پر اپنا تصرف ثابت کرنا ہوتا ہے اور اللہ کی ولایت کا مُظہرِ تامہ ذاتِ علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ''ولایت باطنِ نبوت ہے''۔ اور علیؑ کے اپنی ذات کے طور پر گواہی دینے کا مطلب نبیؐ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر اسکی نصرت کرنا ہے۔ یہ عملی شہادت ہے جس سے بڑی کوئی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لئے اللہ کی راہ میں قتل ہو جانے والے کو شہید کہا جاتا ہے۔ پس علیؑ نے دونوں حیثیات میں توحیدِ خدا اور

رسالت رسولؐ کی گواہی اسطرح دی کہ وہ لوگوں کے مشاہدے میں آ گئی اور ان پر حجت بن گئی۔

۹۔ یوسف ۲۱۔ ''اور اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

اس بارے میں ہمیں کسی تصریح کی ضرورت نہیں ہے۔ جو امر پر غالب ہو وہ صاحب الامر کہلاتا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ صاحب الامر کون ہے۔ پس اسی کو اس آیت میں ''اللہ'' کہا گیا ہے۔

۱۰۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۴۸۔ ''اس (اللہ) نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور اسکے لشکر کو غالب کیا اور اکیلے ہی جتھوں کو مار بھگایا''۔

کیا دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا شخص ہے جس نے اللہ کو میدان میں اترتے اور اکیلے ہی پورے لشکر کو مار بھگاتے ہوئے دیکھا ہو؟۔ پھر یہاں ''اللہ'' سے کون مراد ہے؟۔ اس کا جواب بھی ہم مفاتیح الجنان صفحہ ۶۹۴ پر درج زیارت امیرؑ المومنین سے ہی پیش کرتے ہیں۔

''انھوں نے (علیؑ) مشرکین کے لشکر تیرے حکم سے پچھاڑ دیئے۔ کفار کی فوجوں کو تیرے حکم سے نابود کر دیا''۔

۱۱۔ التوحید صفحہ ۸۰۔ حدیث ۱۸۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر خلق کیا''۔

علیؑ کو درمیان سے ہٹا کر اگر کوئی اس حدیث کا مطلب بتا دے تو ہم اسے مردِ میدان سمجھیں گے جبکہ تواریخ و روایات شاہد ہیں کہ حضرت آدمؑ حضرت امیرؑ المومنین سے مشابہ تھے۔پس یہاں ''اللہ'' کون ہے؟۔یہ واضح رہے کہ شیخ صدوق کی کتاب التوحید کا موضوع ہی توحید ہے اور انھوں نے یہ حدیث بھی توحید کے ضمن میں درج کی ہے۔

یہ وہ مواقع تھے جن سے ''ہم وہ ہو جاتے ہیں'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ہم نے انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف چند مثالیں دی ہیں ورنہ اگر تفصیل میں جایا جائے تو پورا قرآن اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔لیکن زیادہ تفصیل سے اصل مقصد نظروں سے اجھل ہو جاتا ہے اس لئے ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں جو سمجھنے والوں کے لئے بہت ہے۔

وہ ہم ہو جاتا ہے

۱۔زخرف ۵۵۔''پس جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لے لیا''۔

غصہ ایک کیفیت کا نام ہے اور اللہ کیفیات سے منزہ ہے لہٰذا اس بات پر تدبر کرنا لازم ہے کہ اللہ کو غصہ دلانے کا کیا مطلب ہے؟۔اور یہاں لفظ ''اللہ'' کس کے لئے استعمال کیا گیا ہے؟۔

التوحید صفحہ ۱۸۹ حدیث ۷ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''اللہ ہماری طرح غصہ نہیں کرتا مگر اس نے اپنے اولیاء کو خلق کیا ہے جو غصہ کرتے ہیں اور راضی ہوتے ہیں۔ پھر انکی رضا کو اپنی رضامندی اور انکی ناراضگی کو اپنی ناراضگی قرار دیا ہے''۔

ثابت ہوا کہ لوگوں نے غصہ دلایا آلِ محمدؐ کو اور اللہ نے فرمایا کہ انھوں نے مجھ کو غصہ دلایا۔ اس اعتبار سے اس آیت میں لفظِ اللہ آلِ محمدؐ کے لئے استعمال ہوا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ''وہ ہم بن گیا''۔

قرآن مجید میں بیشتر مقامات پر اللہ نے اپنے لئے غضب اور رضا کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں ایسی تمام آیات کا مطلب سمجھا جاسکتا ہے اور ''وہ ہم ہو جاتا ہے'' کا مفہوم جانا جاسکتا ہے۔

۲۔ بقرہ ۵۷۔ ''ان لوگوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ تو اپنے ہی پر ظلم کرتے ہیں''۔

اللہ پر ظلم کون کرسکتا ہے؟ اور کیسے کرسکتا ہے؟ ظلم کہتے ہیں کسی شے کو اسکے مقام سے ہٹا دینا۔ اسطرح اللہ پر ظلم کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ظلم کرنے والا اللہ کے مقام سے واقف ہو۔ یہ بحث بعد میں آئے گی کہ اللہ کا مقام کون ہے لیکن یہاں صرف یہ مقصد ہے کہ اللہ پر ظلم کرنا محالات سے ہے۔ پھر یہ ''اللہ'' کون ہے جس پر ظلم کیا گیا ہے؟۔

علیؑ فی القرآن صفحہ ۲۹۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''ذاتِ احدیت اس بات سے کہیں

عظیم تر۔اجل اور ارفع ہے کہ اس پر ظلم کیا جائے۔ خلاقِ عالم نے اپنی ذات کو ہم اہلِ بیت میں شمار کر کے اپنی طرف ظلم کی نسبت دی ہے۔گویا خداوندِ عالم نے ہمارے اوپر ظلم کو اپنی ذات پر ظلم سے تعبیر کیا ہے''۔

پس یہ وہ مقام ہے جہاں ''وہ ہم ہو جاتا ہے''۔

۳۔آلِ عمران ۱۸۱۔''بیشک اللہ نے ان لوگوں کا قول سن لیا جنھوں نے یہ کہا کہ یقیناً اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں''۔

کسی کی مالداری یا فقر کا اندازہ اسکو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔مثلاً اگر ہم دیکھیں کہ کوئی شخص محلوں میں رہتا ہے۔نوکر چاکر اسکی خدمت کے لئے حاضر رہتے ہیں۔پیسے کی ریل پیل ہے تو ہم کہیں گے کہ فلاں شخص مالدار ہے۔اور اگر ہم کسی شخص کو جھونپڑی میں رہتے۔فاقے کرتے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے دیکھیں تو ہم کہیں گے کہ فلاں شخص فقیر ہے۔اللہ کو کس نے اس حالت میں دیکھ لیا کہ اسے فقیر کہہ دیا؟۔معلوم ہوا کہ کوئی تھا جسے لوگوں نے فاقے کرتے دیکھا تھا۔اسکے بچوں کو بھوک سے بلکتے دیکھا تھا۔اسکے کپڑوں میں جابجا لگے ہوئے پیوندوں کو دیکھا تھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر اسے فقیر کہا تھا۔اسی کے فقر کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا۔

پس یہی وہ مقام ہے جہاں ''وہ ہم ہو جاتا ہے''۔

۴۔احزاب ۵۷۔''جو لوگ اللہ اور اسکے رسول کو ایذا دیتے ہیں اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی اور انکے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہوا ہے''۔

رسولؐ کو اذیت دینا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اللہ کو اذیت دینا کیا معنی رکھتا ہے؟۔ پھر عرض ہے کہ اذیت ایک کیفیت ہے جو اللہ کے لئے جائز نہیں۔ پھر یہ کس کو اذیت دی جا رہی ہے جسکو اللہ خود کو اذیت دینے سے تعبیر کر رہا ہے؟۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ''وہ ہم ہو جاتا ہے''۔

۵۔ صف ۱۴۔ ''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو اللہ کے مددگار ہو جاؤ''۔

یہ ظاہر ہے کہ اللہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں لیکن اسکی طلبِ نصرت بتا رہی ہے کہ منصور کوئی اور ہے جسکی مدد کرنے کو اللہ خود کی مدد کرنا کہتا ہے۔

۶۔ حجرات ۱۔ ''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے اللہ اور اسکے رسولؐ کے سامنے آگے نہ بڑھو''۔

اس آیت میں اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور اسکے رسولؐ سے آگے نہ بڑھیں۔ تقدم آگے بڑھنے اور فوقیت حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ تقدم کے بعد ''بین یدی اللہ و رسولہ'' آیا ہے۔ ''بین یدی'' کا مقصد کسی کے آگے چلنا ہی ہوتا ہے اور کسی کے آگے چلنے کا عمل جسمانیت اور رویت پر منحصر ہے یعنی کسی صاحبِ جسم وجود کو دیکھ کر اسکے آگے نہ چلا جائے اور جو وجود صاحبِ جسم نہ ہو اور دیکھا نہ جا سکے اسکے آگے یا پیچھے چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ کی ذات جسم و جسمانیت سے پاک اور اس بات سے منزہ و مبرا ہے کہ اسکو دیکھا جا سکے اسلئے اسکے آگے اور پیچھے چلنے کا عمل ناممکن و محال ہے اور نہ ہی اللہ سے چلنے اور کھڑے ہونے کا فعل صادر ہو سکتا

ہے لہذا ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ اس بات پر غور کریں کہ اللہ سے آگے بڑھنے کا کیا مطلب ہے کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے جس پر بہر حال ہمیں عمل کرنا ہے۔ اللہ نے اس آیت میں اپنے رسولؐ کو الگ بیان کر کے خود کو کسی اور سے ملحق کر لیا ہے اور اس سے آگے بڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہم اشارہ کر دیں کہ امام کہتے ہی اسے ہیں جو سب سے آگے ہو اور اس سے آگے بڑھنا جائز نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ عام آدمی جو نماز کی امامت کر رہا ہو اس تک سے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ مولوی یہاں بہت سی تاویلیں کرلے گا مگر ان سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ یہ ثابت ہے کہ جب امامؑ ظہور فرمائیں گے اور حضرت عیسیٰ سے کہیں گے کہ ''اے عیسیٰ آگے بڑھیے اور نماز پڑھائیے'' تو وہ فرمائیں گے کہ ''اے فرزندِ رسولؐ! میں کس طرح آپؑ سے آگے بڑھ سکتا ہوں؟''۔ اسکے بعد حضرت عیسیٰ اسی آیت کی تلاوت فرمائیں گے جس سے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ یہاں آگے بڑھنے سے مراد جسمانی طور پر آگے بڑھنا ہے۔ لہذا آپ بخوبی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ ''اللہ'' کون ہے جو ''ہم'' بن گیا اور جس سے آگے بڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے؟۔

۷۔ (الف)۔ انفال ۱۔ ''(اے رسولؐ) لوگ تجھ سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہدو کہ انفال اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے لئے ہے''۔

(ب)۔ انفال ۴۱۔ ''اور تم جان لو کہ ماسوا اسکے نہیں ہے کہ جو کچھ بھی تم کو کسی چیز سے غنیمت ملے پس اسکا خمس (پانچواں حصہ) اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور رسولؐ کے لئے

اور رسولؐ کے قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے‘‘۔

(ج) حشر ۷۔ ’’اور جو کچھ اللہ تعالی نے اپنے رسولؐ کو بستیوں والوں سے دیا پس وہ اللہ تعالی کے لئے اور رسولؐ کے لئے اور اسکے قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے‘‘۔

ان تینوں آیات میں اللہ نے انفال اور خمس میں اپنا حصہ قرار دیا ہے۔ ہر سوچنے والا یہ ضرور سوچے گا کہ دنیائے فانی کے مالِ فانی میں اللہ کو اپنا حصہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟۔ ہر اعتبار سے غنیٔ مطلق اور صمدِ بے احتیاج ہونے کے باوجود اپنی خلق کی ہوئی خلق کے ساتھ اپنا مساوی حصہ کس غرض و علت کی بنا پر مقرر فرمایا؟۔ اور اگر یہاں اپنا حصہ مقرر فرمایا تھا تو پھر صدقات میں اپنا حصہ کیوں قرار نہ دیا؟۔ ہر عقل اس بات کو فوراً سمجھ لے گی کہ وہ ’’اللہ‘‘ جسکے لئے انفال وخمس میں حصہ قرار دیا گیا ہے وہ ایسا ہے جس سے لوگوں کے ہاتھوں کے میل کچیل کو دور رکھنا مقصود ہے۔ حصہ اسکا ہے لیکن اسکے بدلے اللہ خود اسکے حصے کا دعوے دار بن رہا ہے۔ پس یہ وہ مقام ہے جہاں ’’وہ ہم بن جاتا ہے‘‘۔

ہم نے اختصار کے ساتھ اس سوال کا بھی جواب دے دیا جو ہم سے کیا گیا تھا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ قرآن مجید میں لفظ اللہ بیشتر مقامات پر اسم کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس لئے صرف لفظِ ’’اللہ‘‘ سن کر یا پڑھ کر بوکھلانا نہیں چاہئے بلکہ حقیقت کو

سمجھنا چاہئے۔ اسی لئے مردِ عارف حضرت میر تقی میرؔ نے فرمایا تھا۔

کیا مدح ہے یہ ہم جو اسے شاہ کہیں ہیں

سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

حرفِ آخر

اپنی گفتگو کو اختتام تک پہنچانے سے قبل ہم آپکی خدمت میں معصومؑ کا وہ قولِ فیصل پیش کرتے ہیں جسکے بعد کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہ جائے گا اور جو شخص واقعی سمجھنا چاہتا ہے اسکے دل سے مولویوں کا پیدا کیا ہوا فرضی خوف انشاء اللہ کافور ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بھی پہلے ہم شیخ صدوق کی کتاب معانی الاخبار (اردو) صفحہ ۴۳ کی حدیث ۲ نقل کرتے ہیں جس سے لفظِ ''اللہ'' کے معنی واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔

''راوی نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ ''اللہ سے کیا مراد ہے؟''۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''اللہ کے لفظ میں ''الف'' سے مراد آلاء یعنی نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات پر ہماری ولایت کے ذریعے سے نازل فرمائی ہیں۔ اللہ کے لفظ میں ''لام'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنی مخلوق پر ہماری ولایت کا لازم کردینا ہے۔ اللہ کے لفظ میں ''ہا'' سے مراد ھوان یعنی پستی و رسوائی ہے ان لوگوں کے لئے جنھوں نے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مخالفت کی''۔

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ لفظِ اللہ استعارہ ہے ولایتِ علیؑ کا اور اسی تناظر میں

اس لفظ کو دیکھنا چاہئے۔اور اب ہم وہ حدیث پیش کرتے ہیں جسکا ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔

التوحید صفحہ ۹۰۔حدیث ۲۰۔ابو بصیرؒ نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا۔ ''آپؑ مجھے بتائیے کہ کیا مومنین اللہ کو روزِ قیامت دیکھیں گے؟''۔آپؑ نے فرمایا۔''ہاں! اور انھوں نے اس (اللہ) کو قیامت سے قبل بھی دیکھا ہے''۔ابو بصیرؒ نے پوچھا۔''کب؟''۔آپؑ نے فرمایا۔''جب اللہ نے ان سے فرمایا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟۔سب نے کہا کہ ہاں''۔پھر آپؑ چند لمحے خاموش رہے۔پھر فرمایا۔'' بیشک مومنین اس (اللہ) کو دنیا میں قیامت کے دن سے پہلے دیکھیں گے۔کیا تم نے اس کو اس وقت نہیں دیکھا؟''۔ابو بصیرؒ کہنے لگے کہ میں آپؑ پر فدا ہو جاؤں۔کیا میں آپؑ سے (آپؑ کے حوالے سے) یہ حدیث بیان کر سکتا ہوں؟''۔آپؑ نے فرمایا۔''نہیں۔کیونکہ جب تم اس کے متعلق بیان کرو گے تو منکر اسکا انکار کرے گا جو جاہل ہوگا اس معنی سے جو تم کہو گے''۔

ہم نے کھول کھول کر حقیقت آپ تک پہنچادی۔اب جو شخص بھی انکار کرنے کا ارادہ کرے وہ پہلے سوچ لے کہ معصومؑ نے اسکے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔

مندرجہ بالا مباحث کے بعد یہ بات دل میں بٹھا لینا چاہئے اور اس پر یقین رکھنا چاہئے کہ:۔

علیؑ عابد ہے بطور معنی کے اور معبود ہے بطور اسم کے

علیؑ ساجد ہے بطور معنی کے اور مسجود ہے بطور اسم کے

علیؑ علیم ہے بطور معنی کے اور علم ہے بطور اسم کے

علیؑ رب ہے بطور معنی کے اور ربّ الارباب ہے بطور اسم کے

علیؑ خالق ہے بطور معنی کے اور احسن الخالقین ہے بطور اسم کے

علیؑ رازق ہے بطور معنی کے اور خیر الرازقین ہے بطور اسم کے

علیؑ علی ہے بطور معنی کے اور اللہ ہے بطور اسم کے

واللہ مستعان

المعارف

مذاہب کے بننے یا بگڑنے کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ انکے ماننے والے عقل سے کتنے قریب ہیں یا کتنے دور۔ کیونکہ مذاہب کا تعلق دنیاوی امور سے جزوی ہوتا ہے جبکہ اسکا اصل موضوع حیات بعدِ ممات ہوتا ہے اور یہ موضوع ایسا ہے کہ اس میں مشاہدہ کم اور تعقل زیادہ درکار ہوتا ہے۔ موت کے وقت کیا کیفیت گزرتی ہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔ قبر میں کیا ہونا ہے یہ کسی کو خبر نہیں۔ برزخ کے حالات سے ہر شخص لاعلم ہے۔ قیامت کے بارے میں محسوساتی شواہد کسی کے پاس بھی نہیں۔ یہ تمام چیزیں خبریں ہیں جو لوگوں تک کسی نہ کسی ذریعہ سے پہنچتی ہیں۔ لہٰذا اس ذریعہ کی جانچ پڑتال انتہائی ضروری ہے۔ ذریعہ مشکوک ہوگیا تو مذہب کی پوری عمارت پل بھر میں منہدم ہو جائے گی اور صرف قصے کہانیوں اور روایات کا ایک جال باقی رہ جائے گا جس میں الجھ الجھ کر لوگ ٹھوکریں کھاتے رہیں گے اور منہ کے بل گرتے رہیں گے۔ اسی ذریعے کو مذہبی اصطلاح میں ''وسیلہ'' کہتے ہیں اور اس وسیلے کا منجانب اللہ ہونا عقلاً واجب ہے کیونکہ حیات بعدِ ممات کے بارے میں کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کر لینا انسان کے لئے عقلی اور عملی دونوں اعتبارات سے محال ہے اور ان چیزوں کے بارے میں صرف وہی جان سکتا ہے جسے خود اللہ نے علم عطا فرمایا ہو۔ ہماری تکلیف صرف اتنی ہے کہ پہلے صحیح وسیلہ تلاش کریں اور جب وسیلہ مل جائے تو اسکی دی ہوئی خبر کو دل و جان

سے تسلیم کرلیں نہ کہ اس خبر میں اشتباہات پیدا کریں اور اسی ذہنی تعیش کو اپنا مقصدِ حیات بنالیں۔ جو لوگ روایات کی چھان بین میں لگے رہتے ہیں وہ اپنی پوری زندگی شک اور حیرت کے عالم میں گزارتے ہیں کیونکہ راویوں کا حال یہ ہے کہ ایک محدث کسی راوی کو انتہائی ثقہ اور قابلِ اعتماد سمجھتا ہے جبکہ دوسرا محدث اسی راوی کو جھوٹا اور غیر معتبر قرار دیتا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ راویوں کو چھوڑ کر پہلے ان لوگوں کی چھان بین کی جائے جو راویوں کو جھوٹا یا سچا قرار دے رہے ہیں اور یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اسطرح کسی بھی روایت پر اعتبار کرنا عقلی اعتبار سے ممکن نہیں رہتا اور اسطرح پورا مذہب مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ احادیث کو پرکھنے کا یہ طریقہ اغیار نے ایجاد کیا ہے اور شیعوں نے اس معاملے میں انکی تقلید کی ہے حالانکہ روایات کی جس چھان بین کو لوگوں نے اساسِ مذہب سمجھ رکھا ہے وہ سراسر خلافِ منشاءِ خداوندی ہے۔ اللہ نے مذہب کو آسان بنایا ہے جبکہ نام نہاد علماء نے اسے ایک چیستان میں تبدیل کر دیا ہے جسے نہ وہ خود سمجھ سکتے ہیں اور نہ لوگوں کو سمجھا سکتے ہیں۔ ہاں اتنا فائدہ انکو ضرور مل جاتا ہے کہ جس حدیث کو انکا دل قبول نہ کرے تو اسکے راوی میں کسی نہ کسی قسم کا سقم نکال کر وہ آسانی سے اس حدیث کا انکار کر دیتے ہیں۔

نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۳۴۴ پر حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''جب تم کوئی حدیث نقل کرو تو اسکے راوی کا بھی ذکر کرو جس سے تم نے حدیث سنی ہے۔ پس اگر وہ سچا

ہے تو اسکا فائدہ تمھیں پہنچے گا اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اسکا نقصان اس جھوٹے راوی کو پہنچے گا''۔

فرمانِ معصومؑ نے مذہب کو کتنا آسان بنا دیا ہے بشرطیکہ عقل سے کام لیا جائے اور متنِ حدیث پر غور کیا جائے جیسا کہ خود حضرت امیرؑ المومنین ارشاد فرماتے ہیں۔''جب کوئی حدیث سنو تو اسے عقل کے معیار پر پرکھ لو۔صرف نقلِ الفاظ پر بس نہ کرو کیونکہ علم کے نقل کرنے والے تو بہت ہیں اور اس (متنِ حدیث) میں غور و فکر کرنے والے کم ہیں''۔(نہج البلاغہ صفحہ ۸۳۲ قول ۹۸)۔جبکہ راویوں کے پیچھے بھاگنے والوں نے مذہب کو ذہنی تعیش اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے کا ذریعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔اس مشغلے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگ مقصدِ مذہب سے بالکل بے تعلق ہو کر رہ گئے ہیں اور ہر کوئی کسی نہ کسی مذہب سے صرف اس لئے وابستہ رہتا ہے کہ جب وہ پیدا ہو تو اسکے کان میں اذان کونسی دی جائے اور جب وہ مرے تو اسکے آخری رسوم کس طرح ادا کیے جائیں اور انکی درمیانی مدت کے دوران وہ ایک امیدِ موہوم کا سہارا لئے ہوئے پوجا پاٹ کرتا رہتا ہے۔

چھچھورے اور کوتاہ نظر لوگوں نے عمل کے معاملے کو بہت اچھال رکھا ہے کیونکہ یہ لوگوں کو گمراہ کرنے کا آسان ترین طریقہ ہے۔میری گزارش ہے کہ میری عرض داشت کو انتہائی ٹھنڈے دماغ اور انصاف پسندی کے ساتھ سماعت فرمایا جائے

کیونکہ جب تک آپ کسی کی بات کو اسطرح نہیں سنیں گے اسوقت تک آپ یہ فیصلہ کر ہی نہیں سکتے کہ اسکی بات صحیح ہے یا غلط۔ اور کسی کی بات کو سنے اور سمجھے بغیر جھٹ سے اسے غلط کہہ دینا احمقوں کا ہی کام ہوتا ہے اور ایسے لوگ ہمیشہ حقائق سے محروم اور کنویں کے مینڈک بنے رہتے ہیں۔

اگر تمام عالمِ انسانیت کے سامنے یہ سوال قائم کیا جائے کہ کیا عمل کرنا ہی مقصدِ حیات ہے؟ چاہے مقصدِ عمل معلوم ہو یا نہ ہو؟ چاہے طریقۂ عمل کا علم ہو یا نہ ہو؟ تو بلا استثناء ہر شخص یہی جواب دے گا کہ نہیں! عمل صرف اسی صورت میں مفید ہوسکتا ہے جبکہ:۔

۱۔ مقصدِ عمل معلوم ہو۔

۲۔ طریقۂ عمل صحیح ہو۔

۳۔ یہ یقین ہو کہ جو عمل کیا جارہا ہے وہ ضرور قبول ہوگا۔

کوئی بے وقوف ہی ہوگا جسے معلوم نہ ہو کہ اسکا عمل قبول ہوگا یا نہیں لیکن اسکے باوجود وہ عمل میں مشغول رہے۔ اسے اندھیرے میں تیر چلانا کہتے ہیں۔ مجھے اگر کہیں جانا ہو تو پہلے میں صحیح سمت معلوم کروں گا پھر اپنا سفر شروع کروں گا۔ اگر تیز چلا تو جلدی منزل پر پہنچ جاؤں گا اور اگر آہستہ یا ٹھہر ٹھہر کر چلا تو دیر سے پہنچوں گا مگر پہنچوں گا ضرور۔ لیکن اگر میں بغیر سمت معلوم کئے چل پڑا تو ساری زندگی بھٹکتا ہی پھروں گا اور کبھی بھی منزل

مقصود پر نہیں پہنچ سکوں گا۔ عمل کا انکار دنیا کا ایک شخص بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ عمل جسکے قبول ہونے کا انسان کو یقین ہو نہ کہ وہ عمل جسکے عامل کو شرطِ قبولیت کا علم سرے سے ہو ہی نہیں جیسا کہ اس سے پہلے ایک علامہ صاحب کا قول گزرا کہ ''نماز نہ پڑھنے سے نماز پڑھنا بہتر ہے''۔ یہ احمقوں کا قول ہے جسکی تائید عقل کبھی نہیں کرے گی۔ یہاں ہم صرف شرطِ قبولیت بیان کر رہے ہیں۔ تفصیلات ان علماء سے معلوم کی جائیں جنکے کہنے پر لوگ عمل کرتے ہیں۔

ا۔ بقرہ۔ ''وہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی ریب نہیں۔ وہ ہدایت کرتی ہے متقین کی''۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ ہدایت پا کر انسان متقی نہیں بنتا بلکہ ہدایت پانے سے پہلے اسکا متقی ہونا شرطِ لازمی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ متقی بننے سے پہلے آدمی گمراہ ہوتا ہے۔ کیا گمراہوں کا عمل قبول ہو سکتا ہے؟۔ اگر نہیں ہو سکتا تو کیا عمل کرنے والے کو یہ یقین حاصل ہے کہ وہ متقی ہے؟۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو جو عمل وہ کر رہا ہے وہ کس کھاتے میں جائے گا؟۔

۲۔ مائدہ ۲۷۔ ''بس اور بس (انما) اللہ صرف متقین سے ہی قبول کرتا ہے''۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کر کے متقی نہیں بنا جا سکتا بلکہ عمل کرنے سے پہلے اسکا متقی ہونا ضروری ہے۔ صرف اسی صورت میں خداوندِ عالم اسکے عمل کو شرفِ

قبولیت بخشے گا۔یعنی تقویٰ شرطِ عمل ہے نہ کہ نتیجۂ عمل ۔اس لئے کسی بھی عمل کرنے والے کوعمل کے لئے کمر بستہ ہونے سے پیشتر یہ یقین حاصل کرنا ضروری ہے کہ وہ متقی ہے ورنہ وہ اس یقین کے ساتھ عمل کرے کہ اسکا عمل ہرگز ہرگز قبول نہیں ہوگا۔میں ان تمام لوگوں سے جنھوں نے عمل کوایک پھلجھڑی بنا رکھا ہے سوال کرتا ہوں کہ کیا وہ سب کے سب متقی ہیں؟۔اگر ہیں تو ہمیں بھی وہ طریقہ بتادیں جس سے بغیر عمل کئے متقی بنا جاسکتا ہو۔مگر قرآن سے اور حدیث سے۔نہ کہ اپنی یا کسی اور کی ذاتی رائے سے۔کیونکہ کسی کی ذاتی رائے (فتویٰ) کا اللہ نے ہمیں پابندنہیں بنایا اور ہم پہلے ہی مرحلے میں کسی کی ذاتی رائے کے صاف صاف منکر ہیں۔

یہ معاملہ ایسانہیں جس سے سرسری طور پر گزرا جائے۔لوگوں کواس پرغور کرنا چاہئے بجائے اسکے کہ وہ مومنین کوطنز وتشنیع کانشانہ بنائیں۔

یہ واضح ہوگیا کہ وہ حالت جس میں انسان ہدایت کامستحق بنتا ہےتقویٰ کہلاتی ہے اور جوشخص اس حالت میں ہوتا ہے اسے متقی کہتے ہیں اور یہ یادرکھیئے کہ ہدایت کا مطلب معرفت ہوتا ہے۔اسی لئے وہ لوگ جنکا تقویٰ سے دور کا بھی تعلق نہیں معرفت کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کئے رہتے ہیں اور وہی لوگ ہیں جنھوں نے لفظِ معرفت کوتضحیک کانشانہ بنایا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ گمراہی اور ہدایت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مراد

کسی بھی شے کو ماننے یا نہ ماننے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس شے سے مراد کیا لیا جا رہا ہے۔ اگر مراد صحیح ہے تو ہر چیز صحیح ہے اور اگر مراد غلط ہے تو ہر چیز غلط ہے۔ اس بات کو یوں سمجھے کہ اگر کوئی شخص ایک بت بنالے یا اپنے ذہن میں کسی شے کا ایک تصور تشکیل دے لے اور یہ سمجھے کہ وہ شے اللہ ہے اور پھر کہے کہ لا الٰہ الا اللہ تو اگر چہ یہ کلمہ ردِ شرک کے لئے ہے لیکن یہی کلمہ پڑھ کر وہ شخص مشرک ہو جائے گا۔ صرف اس لئے کہ اسکا مراد غلط ہے۔ اسی طرح کلمہ محمدؐ الرسول اللہ کا مقصد کفر سے پاک کرنا ہے لیکن اگر کوئی شخص مقامِ نبوت سے نا آشنا ہے یا پھر یہ سمجھتا ہے کہ اسکے محلّے میں جو محمد خان رہتا ہے وہ رسول اللہ ہے تو یہی کلمہ پڑھ کر وہ کافر ہو جائے گا محض اس لئے کہ اسکی مراد غلط ہے۔ یہی صورت کلمۂ علیؑ ' ولی اللہ کی ہے کہ اگر چہ اس کلمے کا مقصد انسدادِ نفاق ہے لیکن اگر کوئی شخص مراتبِ ولایت سے جاہل ہے اور علیؑ کے بارے میں اسکا تصور انتہائی ناقص ہے اور وہ آنجنابؑ کو ایک عبادت گزار۔ مسائلِ شرعیہ سے واقفیت رکھنے والے اور ایک بڑے پہلوان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تو ایسا شخص یہی کلمہ پڑھ کر منافق ہو جائے گا فقط اس لئے کہ اسکی مراد غلط ہے۔ اسی ''مراد'' کا نام معرفت ہے اور اسی لئے بغیر معرفت کے نہ عقیدہ صحیح ہو سکتا ہے اور نہ عمل۔

ہماری بات شروع ہوئی تھی وسیلے سے۔ اور وسیلے کا ادراک ایک عقلی شے

ہے۔چنانچہ عقل کی جوتعریف معصومؑ نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ ''عقل وہ ہے جو انسان کو ہادی کی معرفت کرادے''۔اوراصولِ کافی کتاب عقل میں معصومؑ فرماتے ہیں۔''انسان کے لئے اتنی عقل کافی ہے جس سے وہ ہادی کو پہچان لے''۔عقل ہی ہادی کی مختلف خصوصیات کی نشاندہی کرتی ہے جنکی تفصیل وتشریح روایات کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔پس جو روایت ہادی کی شان بیان کرے وہ صحیح اور قابلِ قبول ہے چاہے اسکا راوی کوئی بھی ہو اور جس روایت سے ہادی کی شان میں کمی ہوتی ہو وہ نا قابلِ قبول ہے چاہے اسکا راوی کوئی بھی ہو۔

ہم نے آپ کو ایک ایسا معیار بتا دیا ہے جنکی مدد سے آپ زندگی بھر علمِ رجال کے جھنجٹوں سے محفوظ رہیں گے۔انشاءاللہ

وسیلۂ معرفت

دین کا مرکز ومحور عقیدۂ توحید ہے اور توحید کے لئے سب سے پہلی شے جو ضروری ہے وہ اللہ کی معرفت ہے جیسا کہ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔''اوّل الدین معرفته''۔یعنی دین کی ابتداء یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل کی جائے۔حقیقت یہ ہے کہ معرفت ہمیشہ ذات کی ہی ہوتی ہے اور اس معرفت کا ذریعہ و وسیلہ صفات ہوا کرتی ہیں۔جیسا کہ آپ اس سے قبل قولِ معصومؑ ملاحظہ فرما چکے کہ ''اللہ کی معرفت اللہ سے ہی حاصل کی جاتی ہے''۔یعنی اس اللہ کی معرفت جو معنی ہے اس اللہ سے

حاصل کی جاتی ہے جو اسم ہے اور یہی اسم اسکی صفتِ تامہ ہے اور اسکی تمام صفات کا جامع ہے۔ یہ اسم مَظہر ذات ہے یعنی ذات کا پَرتَو ہے اور مُظہر صفات ہے یعنی صفات کا ظاہر کرنے والا ہے اور چونکہ یہ خود تمام صفات کا جامع ہے اس لئے یہ خود ہی کو ظاہر کرتا ہے اور اسی کی شان دیکھ کر اللہ کو جانا اور مانا جاتا ہے اور یہی توحیدِ خالص ہے۔ اسی لئے التوحید صفحہ ۱۸۹۔حدیث ۷ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''توحید کے بارے میں صحیح رائے مذہب وہ ہے جو قرآن میں اللہ کی صفات کے بارے میں نازل ہوا''۔ مطلب یہی ہے کہ صفاتِ خدا کو وسیلہ بنائے بغیر نہ اسے جانا جاسکتا ہے نہ پہچانا جاسکتا ہے اور نہ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ حقیقتاً معرفت اسکی صفات ہی کی حاصل کرنا ممکن ہے اور اسکی صفات کی معرفت ہی اسکی معرفت کہلاتی ہے۔ وسیلۂ معرفت کو درمیان سے ہٹا کر اللہ کو گوشۂ تنہائی میں۔ جنگلوں میں اور بیابانوں میں ڈھونڈتے پھرنا ایسا ہے جیسے ہوا میں تلوار چلانا۔ التوحید صفحہ ۲۴۲۔حدیث ۷ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''تمھاری دعا اس لئے قبول نہیں کی جاتی کہ تم اسکو پکارتے ہو جسکو پہچانتے نہیں ہو''۔ یعنی لوگ بظاہر اللہ کو پکار رہے ہوتے ہیں لیکن چونکہ اسکی صفتِ تامہ سے بے خبر ہوتے ہیں اس لئے کسی اور خیالی خدا کو پکار رہے ہوتے ہیں۔ اسکو پکارا جائے گا اسکے اسم کے ذریعے ورنہ ہر پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔

مَثَلِ اعلیٰ

لہٰذا نہ صرف یہ کہ وسیلہ اختیار کرنا پڑے گا بلکہ اس بات کو یقینی بنانا پڑے گا کہ وسیلہ اللہ کے شایانِ شان بھی ہو۔ بے عقل لوگ اسے غلو کہتے ہیں حالانکہ یہ بات عقلی ہے کہ تعارف کرانے والے کی شان اور اسکی شان جسکا تعارف کرایا جارہا ہے اگر جدا جدا ہوئی تو کبھی بھی صحیح تعارف نہ ہوسکے گا۔ معنیٰ اور اسم کے فرق کو چھوڑ کر اصل خصوصیات میں دونوں کا متحد ہونا عقلاً واجب ہے کیونکہ ناقص کے ذریعے کامل کا تعارف ہرگز نہیں کرایا جاسکتا۔

مَثَل اسی کو کہتے ہیں یعنی صفات میں ایک جیسا ہونا اور علیؑ تو مَثَل بھی نہیں بلکہ مَثَلِ اعلیٰ ہیں۔ اب آپ بلندیوں کا تصور کرتے جایئے اور جہاں یہ تصور رک جائے اور اس سے آگے بڑھنا اسکے لئے ممکن نہ رہے تو اسے اپنی حد سمجھ کر تصور کر لیجئے کہ اللہ اپنا تعارف اپنی ہی سطح پر کرانا چاہتا ہے۔ اس سے پست سطح پر نہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک فرمان میں اسی بات کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ التوحید صفحہ ۷۱ حدیث ۱۱ میں آنجنابؑ فرماتے ہیں۔ ''وہ (اللہ) مَثَلِ اعلیٰ کا رب ہے اور اللہ کے لئے ایسی مَثَلِ اعلیٰ ہے کہ کوئی چیز اسکی مشابہ نہیں اور نہ اسکی تعریف کی جاسکتی ہے اور نہ وہم و خیال میں آسکتا ہے۔ پس یہی مَثَلِ اعلیٰ ہے۔ لوگوں نے اپنے رب کا وصف معمولی امثال سے بیان کیا اور اسکو مشابہ سے تشبیہ اپنے جہل کی بنا پر دی''۔

معصومؑ کے اس فرمانِ ذیشان سے معلوم ہوگیا کہ جب ہم اللہ کو "رب" کہکر پکارتے ہیں تو اسکا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اسکا اسم جو مَثَلِ اعلیٰ ہے وہ ساری کائنات کا رب ہے اور اللہ وہ ہے جو اس مَثَلِ اعلیٰ کا رب ہے۔ اور اسکا رب ہونے پر ہی وہ فخر کرتا ہے ورنہ موجوداتِ ارضی وسماوی کی ربوبیت کرنا اسکے لئے کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ وہ تو فخر کرتا ہے اس بات پر کہ جو وجود عالمِ وجود کا رب ہے اللہ اسکا بھی رب ہے۔ اسی وجود کو اس نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے مثلاً الحمد۔ ملک۔ سلطان اور پھر اسکا مالک ہونے پر فخر کیا ہے کیونکہ یہی وہ مَثَلِ اعلیٰ ہے جسکے ذریعے اللہ کی عظمت وجبروت اپنی اصل صورت میں نمودار ہوتی ہے اور یہی وہ وجہ اللہ ہے جسے دیکھ کر لا الہ الا اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو کلمۂ لا الہ الا اللہ کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

اس حدیث پر غور فرمایئے اور ہمارے مندرجہ بالا بیان کی صداقت کا اندازہ لگایئے جہاں ہم نے عرض کیا تھا کہ اللہ اپنا تعارف اپنی ہی سطح پر کرانا چاہتا ہے۔ اگر اللہ کو کسی شے سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی تو اسکے اسم کو بھی کسی سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ عالمِ امکان میں کوئی شے اسکے مشابہ ہے ہی نہیں۔ اللہ وہ ہے جسکی تعریف کی ہی نہیں جاسکتی جیسا کہ خود امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ "الحمد للہ الذی لا یبلغ مدحتہ القائلون"۔ (الحمد ہے اس اللہ کی کہ مدح کرنے والے

جسکی مدح کر ہی نہیں سکتے)۔پس یہی صورت اسم اللہ کی بھی ہے کہ اسکی مدح کا حق ادا کرنا محالات سے ہے۔ جو کوئی بھی علیؑ کی مدح کرتا ہے وہ اپنی حد بیان کرتا ہے نہ کہ علیؑ کی ۔جسطرح اللہ کا وہم وخیال میں آنا ممکن نہیں ہے اسی طرح اسکے اسم کا وہم و خیال و گمان میں آجانا ممکن نہیں ہے۔ہمیں تو جو کچھ خود اسی نے بتلایا ہے وہی ہم دوہراتے رہتے ہیں ورنہ ہمارا اپنا قول تو بس یہ ہے کہ'' لا علم لنا الا ما علمتنا ''۔(اے ہمارے رب ہم تو کچھ جانتے ہی نہیں سوائے اسکے کہ جو تو نے خود ہمیں سکھلایا ہے)۔

کب تر ادبدبہ و جاہ و حشم جانتے ہیں
ہم نہیں جانتے بس اتنا ہی ہم جانتے ہیں

مشیت اللہ

التوحید صفحہ ۳۵۶ ۔حدیث ۱۔امام علی رضاؑ سے پوچھا گیا کہ'' ہم اللہ کو کس چیز سے پہچانیں گے؟''۔آپ نے جواب دیا۔'' اسکے غیر سے''۔پوچھا گیا کہ کونسی چیز اسکی غیر ہے؟''۔آپ نے فرمایا۔''اسکی مشیت ۔اسکا اسم اور اسکی صفت''۔

آپ کے ذہن میں یقیناً یہ بات محفوظ ہو گی کہ ہم وسیلہ معرفت پر گفتگو کر رہے ہیں اور اس حدیث میں بھی وسیلہ معرفت ہی کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سب سے پہلی چیز اسکی مشیت ہے ۔بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنکو کھل کر بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر

ایک عمومی انداز میں ہم مشیت پر غور کریں تو خالق ومخلوق کی مشیت میں واضح فرق نظر آئے گا۔ ہماری مشیت ہمارے بس میں نہیں ہوتی بلکہ اچانک پیدا ہوتی ہے یعنی بیٹھے بیٹھے کسی چیز کو دل چاہنے لگتا ہے۔ یہ حدوث ہے جو ذاتِ باری تعالٰی کے لئے جائز نہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اسکی مشیت قدیم ہوتی ہے اور ہمیشہ اسکے ساتھ رہتی ہے۔ وہ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ظاہر ہوتی ہے۔ پس اب اس مشہور حدیث کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے جس میں کسی نے کہا تھا کہ ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا......الخ''۔ کیونکہ یہ کلام ہے اور کلام تحتِ مشیت ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ مشیت ہی تھی جسے اللہ نے چھپایا ہوا تھا اور یہی مشیت تھی جو ظاہر ہوئی اور یہی مشیت تھی جس نے خلق کیا۔

مخلوق کی مشیت مجبور ہوتی ہے یعنی جس شے کو انسان چاہے ضروری نہیں کہ وہ بروئے عمل آ بھی جائے۔ تو پھر انسان کیا کرتا ہے؟ ۔ وہ دل مار کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اللہ کی مشیت مجبور نہیں بلکہ مختار ہے۔ بہت سے کج فہم ''وما تشائون الّا انّ یشاء اللہ'' سے یہ مراد لیتے ہیں کہ (معاذ اللہ) ائمۂ طاہرین کی مثال ایک بلب کی سی ہے جسے سوئچ آن اور آف کر کے جلایا بجھایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم پھر دہراتے ہیں کہ مشیت خدا مجبور نہیں بلکہ مختار ہے۔ اسی طرح ارادۂ خدا بھی مجبور نہیں بلکہ مختار ہے۔ اسی لئے معصومؑ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ جو چاہتا ہے تو ہم بھی وہی چاہتے ہیں اور

جو ہم چاہتے ہیں تو اللہ بھی وہی چاہتا ہے۔ اللہ جو ارادہ کرتا ہے تو ہم بھی وہی ارادہ کرتے ہیں اور ہم جو ارادہ کرتے ہیں تو اللہ بھی وہی ارادہ کرتا ہے''۔

عقلی اعتبار سے بھی مشیت وارادہ کا مختار ہونا ثابت ہے کیونکہ مدح وذم کا تعلق اختیار سے ہوتا ہے۔ مجبور کی نہ تو تعریف کی جاتی ہے اور نہ برائی۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پورا قرآن اہلِ بیتؑ اطہار کی مدح سے بھرا پڑا ہے اور یہ مدح ثابت کرتی ہے کہ یہ مشیت مختار ہے نہ کہ مجبور۔ سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ اور انکے معلم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اگر اسکا مطالعہ کیا جائے تو مشیت وارادہ بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ اپنے معلم کے پاس پہنچتے ہیں اور ان سے تعلیم دینے کی درخواست کرتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں۔ ''اس نے (معلمِ موسیٰ نے) کہا کہ یقیناً تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکے گا''۔ (آیت ۶۷)۔ اسکے جواب میں حضرت موسیٰ فرماتے ہیں۔

''انشاءاللہ تم مجھے صبر کرنے والا پاؤ گے''۔ (آیت ۶۹)۔ ان دو جملوں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت موسیٰ نے ''انشاءاللہ'' کہا لیکن پھر بھی انکی بات غلط ثابت ہوئی اور وہ صبر نہ کر سکے۔ اسکے مقابلے میں معلمِ موسیٰ نے ''انشاءاللہ'' نہیں کہا لیکن ہوا وہی جو انھوں نے کہا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ مشیت مختار ہے مجبور نہیں۔

جب حضرت موسیٰ مکمل طور پر ناکام ہو گئے تو انکے معلم نے کہا۔ ''بس! اب میرے اور تمھارے درمیان جدائی ہے۔ لو میں تمھیں ان باتوں کی حقیقت بتائے دیتا

ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے‘‘۔(آیت ۷۸)۔’’وہ جو کشتی تھی پس وہ چند مسکین لوگوں کی تھی جو دریا میں (اپنی روزی کے لئے) کام کرتے تھے۔پس میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار کردوں اور (یہ اس وجہ سے کیا کہ) انکے پیچھے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو جبراً چھین لیا کرتا تھا‘‘۔(آیت ۷۹)۔’’اور وہ لڑکا۔سو اس کے ماں باپ دونوں مومن تھے۔پس میں ڈرا (واضح رہے کہ یہاں جس لفظ کا ترجمہ ’’میں ڈرا‘‘ کیا گیا ہے وہ ہے’’ فَخَشِیانا ‘‘۔خشیہ اس ڈر کو کہتے ہیں جو علم ومعرفت کی وجہ سے ہو نہ کہ جہل کی وجہ سے۔جیسا کہ سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا۔’’انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ‘‘یعنی ماسوا اسکے نہیں کہ اللہ سے اسکے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔اور یہ بھی واضح رہے کہ یہاں علماء سے مراد کسبی علماء نہیں بلکہ علمائے ربانی مراد ہیں کیونکہ صرف وہی اللہ کی معرفت رکھتے ہیں) کہ وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔سو ہم نے ارادہ کیا کہ ان دونوں کا رب انھیں پاکیزگی میں اس سے اچھا اور رحمت میں زیادہ (قریب) انھیں بدل دے‘‘۔(آیت ۸۱)۔’’اور رہی وہ دیوار۔پس وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اسکے نیچے ان دونوں کے لئے خزانہ (دبا ہوا) تھا اور ان دونوں کا باپ ایک نیک مرد تھا سو تمھارے رب نے ارادہ کیا کہ وہ دونوں اپنی جوانی اور عقل وتمیز کو پہنچ جائیں اور وہ خود اپنا خزانہ نکال لیں‘‘۔(آیت ۸۲)۔

ان آیات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ایک مقام پر معلم موسیٰ نے فرمایا۔ ''میں نے ارادہ کیا'' اور کشتی کو عیب دار بنانے کے عمل کو اپنی طرف منسوب کیا۔ دوسرے مقام پر فرمایا۔ ''ہم نے ارادہ کیا''۔ اور لڑکا دینے کے عمل کو رب کیطرف منسوب کیا۔ یعنی معلم موسیٰ تنہا نہ تھا بلکہ عباد کی ایک جماعت تھی جسکا یہ ایک فرد تھا اور ان سب کا ارادہ ایک تھا۔ اور تیسرے مقام پر فرمایا۔ ''رب نے ارادہ کیا''۔ پس یہاں سے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ حضرات ارادہ کرنے میں مختار ہیں۔ یہ ارادہ کریں تو اللہ کا ارادہ کہلاتا ہے اور اللہ ارادہ کرے تو انکا ارادہ کہلاتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ مخلوق کی مشیت غیر مرئی ہوتی ہے۔ وہ اس بات پر قدرت نہیں رکھتی کہ جسم وجسمانیت کے ساتھ ظاہر ہوجائے لیکن اللہ کی مشیت ''علی کل شئٍ قدیر'' ہے اور اسی قدرت کے ذریعے عالمِ خلق سے ماوراء ہوتے ہوئے بھی خلق کا روپ اختیار کرکے ظاہر ہوسکتی ہے۔

ایک اچھوتی حقیقت

عالمِ خلق کی ابتداء ایک نور سے ہوئی۔ جملہ مخلوقات خلقی مخلوق ہیں کیونکہ انکی تخلیق تدریجی ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ امری مخلوق ہیں کیونکہ انکی تخلیق تدریجی نہیں بلکہ ''کن'' کے ذریعے ہوئی۔ لیکن یہ نورِ اوّل مشیتی مخلوق ہے کیونکہ یہ مشیت سے ظاہر ہوئی۔ لیکن لوگوں کو حیرت اس وقت ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ اس نورِ مخلوق میں مشیت

خدا خود بھی چھپی بیٹھی ہے۔اس بات کو سمجھانے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں البتہ جناب جعفر الزماں صاحب کی کتاب ''نہج المعرفۃ فی اسماء الحجۃ'' جلد اوّل صفحہ ۴۲۷۔۴۳۴ اور ۴۳۵ سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔شاید اس سے حقیقت تک پہنچنے میں کچھ مدد ملے اور گتھی کسی حد تک سلجھ سکے کیونکہ یہ سائنسی حقائق ہیں جو تجربات کی بھٹی سے گزر کر آئے ہیں اس لئے انکا انکار ممکن نہیں ہے۔

صفحہ ۴۲۷ پر لکھتے ہیں۔''جب سائنس آنکھ کھولتی ہے تو سامنے ایک بند دروازہ نظر آتا ہے۔اب اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ کھلتا ہے تو اسکے پیچھے دس اور بند دروازے نظر آتے ہیں۔پھر جب ان دس میں سے ایک دروازے کو کھولا جاتا ہے تو اسکے پیچھے مزید دس بند دروازے نظر آتے ہیں اور اسطرح یہ سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے''۔

صفحہ ۴۳۴ پر ایٹم پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''پھر ایک بند دروازہ نظر آیا۔قریب جا کر دیکھا تو یہ بند دروازہ ایک نہیں بلکہ بارہ تھے۔اب اس میں سے ایک دروازے کو کھولنے کی کوشش ہوئی تو سائنس نے کہا کہ یہ کیا ہے؟۔جواب ملا کہ ''زیٹا''۔اصل قوت کا سرچشمہ زیٹا ہے۔اصل فعال قوت زیٹا ہے۔ایٹم کی ازلی اکائی زیٹا ہے جو دیگر بارہ عدد ذروں میں خود کو چھپائے بیٹھا ہے''۔

''اس کائنات میں جو قوتِ فعال Active ہے وہ متعدد نہیں بلکہ وہ قوت ایک ہی

ہے۔صرف ایٹم کا ہی نہیں بلکہ کائنات کا ایک ہی مرکز ہے اور وہی فعال قوت ہے اور وہی منزلِ مراد ہے جسے حاصل کرنا انتہائے عقلِ بشر ہے۔یہ بھی خیال رہے کہ مرکز صرف اور صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ کائنات کی وحدتِ تکوینی بتا رہی ہے کہ مرکز ایک ہے۔قوت ایک ہے جو کائنات میں برسرِ عمل ہے۔جہاں مرکز کا تصور پیدا ہو جاتا ہے وہاں دوئی کا تصور معدوم ہو جاتا ہے۔اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ مرکز (نقطے) کو تصور تو کیا جاسکتا ہے مگر اسکا حواس و مدرکات سے ادراک کرنا محال ہے''۔(اقتباس ختم ہوا)۔

ہم نے جو عرض کیا تھا اسکا کچھ نہ کچھ مفہوم آپکے ذہنوں تک ضرور پہنچ گیا ہوگا اور کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا ایک اجمالی خاکہ ضرور سامنے آ گیا ہوگا۔اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ علیؑ کو ایک ازلی اکائی کے طور پر سب سے الگ رکھو اور کثرت کو دیکھ کر وحدت کا انکار نہ کرو۔شیعوں کے درمیان ساری الجھنیں اور تمام تر اختلافات اسی لئے پیدا ہوئے کہ انھوں نے وحدت و کثرت کو خلط ملط کر دیا اور علیؑ کا موازنہ دوسروں سے کرنے لگے۔جب تک اس اکائی کو سب سے الگ کر کے نہیں سوچا جائے گا اس وقت تک غلو اور نصیریت کا کیڑا ذہنوں میں کلبلاتا ہی رہے گا۔توحید سے لیکر قیامت تک کوئی شے بھی سمجھ میں نہیں آئے گی اور پورا دین ایک بھول بھلیاں بنا رہے گا۔

وسیلہ معرفت کے سلسلے میں ہم مزید دو احادیث بیان کر کے اپنے بیان کو سمیٹتے ہیں اور اسکے بعد دیگر موضوعات کی طرف توجہ کریں گے۔

ا۔التوحید صفحہ ۴۵۹۔حدیث ا۔امام علیؑ رضاؑ نے فرمایا۔" اللہ کی معرفت کا اعتراف صفات اور اسماء کے ذریعے ہوتا ہے۔اگر اللہ کی صفات اس پر دلالت نہ کریں اور اسکے اسماء اس کیطرف نہ بلائیں تو مخلوق کی تمام جمع کردہ معلومات اسکے معنی کا ادراک نہیں کر سکتے"۔

ہم نے کشف العقائد میں عرض کیا تھا اور اب پھر اپنی بات کو دہراتے ہیں کہ انسانی عقل کی آخری حد خالق کا ادراک کرنا ہے۔اس سے آگے بڑھنا اسکے لئے ممکن ہی نہیں۔لہذا جو مخلوق کو وسیلہ معرفت بناتے ہیں وہ نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے اور اپنے تصور کی بنا پر وہ جس خدا کی پرستش کرتے ہیں وہ انکی اپنی ذہنی مخلوق ہوتا ہے۔امام نے اسی بات کی نشاندہی کی ہے کہ اللہ کی معرفت کا واحد ذریعہ اسکی صفات اور اسکے اسماء ہیں اور جیسا کہ ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ یہ صفات اور اسماء کوئی ملفوظی یا مکتوبی شے نہیں ہیں بلکہ ایک مستقل وجودِ خارجی رکھتے ہیں اور جب یہ عالمِ خلق میں ظاہر ہوتے ہیں تو جسم و جسمانیت کے ساتھ قابلِ رویت و مشاہدہ ہوتے ہیں اور انکی یہی خصوصیت ہے جسکے ذریعے اللہ کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔اس پر ایمان لایا جاتا ہے اور اسکی عبادت کی جاتی ہے۔

۲۔نہج الاسرار جلد ۱صفحہ۴۴۔حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔"اس (اللہ) کی معرفت اسکی صفات سے کی جاتی ہے۔نقطہ صفت ہے اللہ کی اور صفت دلالت کرتی ہے موصوف پر کیونکہ اس صفت کے ظہور سے اللہ پہچانا جاتا ہے"۔

حضرت امیرؑ المومنین کے اس فرمان سے معلوم ہوا کہ نقطہ اللہ کی صفت ہے۔یہ ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔یہی وحدتِ مطلقہ کا مظہر ہے۔یہی مرکزِ عالمِ وجود ہے اور آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے۔یہ جب چاہتا ہے دائرے کو پھیلا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے سمیٹ دیتا ہے۔اسی نقطے سے "**کلِ یومٍ ھو فی شان**" کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔جناب امیرؑ کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نقطہ جب چاہتا ہے غائب و پوشیدہ رہتا ہے اور جب چاہتا ہے ظہور کرتا ہے۔جب یہ غائب و پوشیدہ ہوتا ہے تو عالمِ ہوئیت کا نمائندہ ہوتا ہے اور جب یہ ظاہر ہوتا ہے تو لوگوں کو اللہ کا جلوہ ظاہر بظاہر دکھاتا ہے۔یہ پوشیدہ ہو تو نقطہ کہلاتا ہے اور ظاہر ہو تو خط کہلاتا ہے۔خط نقاط کے مجموعے کو کہتے ہیں لیکن اگر اسکو اور بھی واضح طریقے پر سمجھنا ہو تو یہ کہا جائے گا کہ "خط نام ہے نقطے کے بار بار ظہور کرنے کا"۔

میں نقطہ ہوں میں خط ہوں

نقطہ جب خط کی شکل میں آتا ہے تو بادی النظر میں ایسا نظر آتا ہے جیسے بہت سے نقاط ہوں لیکن یہ دراصل وہی ایک نقطہ ہوتا ہے جو بار بار ظہور کرتا ہے جیسا کہ یہ نقطہ خود

فرماتا ہے۔ ''جس صورت میں خدا چاہتا ہے میں منقلب ہو جاتا ہوں۔ جس نے ان صورتوں کو دیکھا مجھے دیکھا اور جس نے مجھے دیکھا اس نے انھیں دیکھا۔ ہم درحقیقت اللہ کا وہ نور ہیں جسکو نہ زوال ہے اور نہ تغیر''۔ (نہج الاسرار جلد ا۔ صفحہ ۹۱)۔

خطبۂ رجعیہ کا آغاز آپؑ اسطرح فرماتے ہیں۔ ''یقیناً میرے لئے پلٹ پلٹ کر آنا اور بار بار رجعت کرنا ہے''۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر حضرت امیرؑ المومنین حضرت صاحب الزمانؑ کے ظہور کو خود اپنا ظہور قرار دیتے ہیں اور نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۵۹ پر فرماتے ہیں۔ ''میں ہی وہ ہوں جسکے پیچھے عیسیٰؑ نماز پڑھیں گے۔ میں جسطرح چاہوں صورتیں اختیار کر لیتا ہوں''۔ اس بارے میں چند اور ارشاداتِ معصومینؑ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ا۔ نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۹۲۔ حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''اے سلمانؓ! میں اور وہ ہادی جو میرے اہل بیتؑ سے ہیں خدا کے رازِ مکنون اور اسکے مقرب اولیاء ہیں۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہمارا امر ایک ہے اور ہمارا راز ایک ہے۔ پس ہم میں تفرقہ نہ ڈالو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ ہم ہر زمانے میں حسبِ مشیتِ رحمانی ظاہر ہونگے''۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ بارہ کے بارہ علیؑ ہیں۔

۲۔ تفسیر فرات صفحہ ۲۶۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بارہ مرتبہ پیش ہوا۔ اس نے مجھے اپنی ذات کی معرفت عطا کی اور غیب کی کنجیاں مجھے

دیں"۔

اس فرمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ نور ایک ہی تھا جس نے ذاتِ خداوندی سے بارہ مرتبہ ظہور کیا۔

۳۔ التوحید صفحہ ۱۱۸۔ حدیث ۶۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "ہم ہیں وہ مثانی جنھیں اللہ نے ہمارے نبیؐ کو عطا کیے ہیں اور ہم ہی وہ وجہ اللہ ہیں جو تمھارے درمیان روپ بدل بدل کر آتے ہیں۔ جس نے ہمیں پہچان لیا پہچان لیا اور جو ہم سے ناواقف رہا تو اسکے لئے یقیناً موت ہے"۔

اللہ کا ہاتھ

ہاتھ استعارہ ہے چار چیزوں کا۔ خلق۔ قدرت۔ تصرف اور رزاقیت۔ ہمارے ذاکرین وعلماء اکثر و بیشتر علیؑ کی شان بیان کرتے ہوئے ید اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور سامعین یہ سن کر اپنے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی علیؑ کو خالق و قادر و رازق کہدے تو یہی آسمان سر پر اٹھانے والے فوراً غلو کا فتویٰ صادر فرما دیتے ہیں۔ یہ عنوان ہم نے اسی لئے قائم کیا ہے کہ جو شخص بھی علیؑ کو ید اللہ مانتا ہے تو اسکے لئے لازم ہے کہ ید اللہ کے معنی بھی سمجھے اور پھر علیؑ کو وہی کچھ مانے جو ید اللہ کے معنی ہیں ورنہ اگر دین کو ذریعہ تفریح اور مجالس کو مشاعرہ بنانا مقصود ہو تو اور بات ہے۔

خلق

اس سے قبل آپ یہ جان چکے کہ علیؑ اللہ کا علم ہے تو اب یہ بھی جان لیجئے کہ علم ہی سر چشمۂ تخلیق ہے۔ یہی علمِ خدا تھا جو مشیتِ خدا کے روپ میں ظاہر ہوا اور سمندِ خلق کی لگام پر ہاتھ ڈالا اور اسی سے ابتداءِ خلق ہوئی۔ یہ مشیت خود علمِ خدا سے ظاہر ہوئی اور باقی عالمِ امکان مشیت کے ہاتھوں خلق ہوا۔ اسی فرق کو واضح کرنے کے لئے التوحید صفحہ ۷۰۔ حدیث ۵ میں امام حسنؑ فرماتے ہیں۔ ''وہ اشیاء جو اس نے اپنی مشیت سے فنا کے لئے خلق کی ہیں معدوم ہو جائیں گی اور وہ چیزیں باقی رہیں گی جو اس نے اپنے علم سے بقا کے لئے بنائی ہیں''۔

جب علیؑ کے لئے علمِ خدا اور مشیتِ خدا ہونا ثابت ہے تو اسکے خالقِ کل ہونے کا انکار دراصل اللہ کی خلاقیت کا انکار کرنا ہے کیونکہ خلق ہاتھ ہی سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ روم ۸۔ ''کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ نہیں پیدا کیا اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان دونوں کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ''۔

ہم نے آیت کا یہ ترجمہ قرآن سے نقل کیا ہے جہاں ''بالحق'' کا ترجمہ ''حق کے ساتھ'' کیا گیا ہے۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے یہ ترجمہ کرنے والے ہی بہتر جانتے ہونگے۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ مترجمین و مفسرین ہمیشہ دباؤ میں رہے ہیں۔ خواہ وہ حکومتوں کا دباؤ ہو یا معاشرے کا۔ لغت میں ''ب'' کے معنی ہیں

ہے۔ساتھ۔قَسم ۔مدداور ذریعہ وغیرہ۔اس مقام پر اسکا ترجمہ ''ساتھ'' کرنا نا قابلِ فہم ہے۔اگر اس ترجمے کو صحیح مان لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مخلوق حق کے ساتھ ہے یہاں تک کہ کافرین و منافقین و منکرین و معاندین کے بارے میں بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ حق کے ساتھ ہیں یہاں تک کہ شیطان کو بھی حق کے ساتھ ماننا پڑ جائے گا کیونکہ وہ بھی بہر حال اللہ کی مخلوق ہے جو صریحاً خلافِ عقل و حقیقت ہے۔یہاں ''ب'' کا کوئی ترجمہ ممکن ہی نہیں ہے سوائے ''ذریعہ'' کے اور اب آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ اللہ نے پوری کائنات کو حق کے ذریعے پیدا کیا اور ہم کشف العقائد میں متعدد قرآنی آیات اور احادیث معصومینؑ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حق نام ہے میرے مولا علیؑ ابن ابی طالبؑ کا۔ان تمام شواہد کا اعادہ غیر ضروری ہوگا اور طوالت کا سبب بنے گا اور ذہنوں پر بار ہوگا لہٰذا انھیں کشف العقائد میں ہی ملاحظہ فرمایا جائے۔حضرت امیرؑ المومنین جب خلافتِ ظاہری پر متمکن ہوئے اور پہلی بار منبر خلافت کو شرف بخشا تو پہلا جملہ یہی ارشاد فرمایا کہ ''حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل تو تھا ہی بھاگنے والا''۔لہٰذا مذکورہ آیت کا واحد ترجمہ یہ ہے کہ اللہ نے پوری کائنات کو علیؑ کے ذریعے خلق کیا اور بقولِ امیرؑ المومنین ''کرتا میں ہوں کہلاتا اسکا ہے''۔اسکی توثیق آنے والی روایت سے بخوبی ہوجاتی ہے۔

۲۔نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۴۴۷۔جناب امیرؑ نے فرمایا۔''اے عمارؓ! کائنات اور اشیاء کی تکمیل میرے اسم سے ہوئی۔میرے اسم کے ساتھ تمام انبیاءؑ کو مدعو کیا گیا''۔

اس حدیث کے دوسرے ٹکڑے کی مختصر توضیح کر دینا ضروری ہے کیونکہ اس پر آج تک بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

نبی اور رسول

امتِ مسلمہ میں ''نبی'' اور ''رسول'' کے بارے میں شدید غلط فہمی پائی جاتی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس اختلافِ مفہوم کا جو بعض الفاظ کے لئے قرآن وحدیث میں پایا جاتا ہے۔ اسکی ایک مثال ہم نے کشف المسائل میں پیش کی تھی اور وہ تھا لفظِ ''شہید''۔ قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں بھی استعمال ہوا ہے اپنے لغوی معنی ہی میں ہوا ہے یعنی ''چشم دید گواہ'' اور متعدد مقامات پر اللہ نے خود کو بھی شہید کہا ہے۔ جبکہ حدیث کی زبان میں آکر اس لفظ کا مفہوم بدل گیا اور وہاں اسکے معنی ہو گئے ''مقتول فی سبیل اللہ''۔ یہی حال لفظِ ''رسول'' کا بھی ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ہر اس شخص کے لئے استعمال ہوا ہے جسے اللہ نے کسی گروہ کیطرف کسی خاص مقصد کے لئے بھیجا ہو اور اس میں عام آدمی۔ فرشتے اور انبیاء سب ہی شامل ہیں۔ لیکن ضرورتِ شرعی کے تحت احادیث میں بعض مقامات پر یہ لفظ انبیاء کے لئے خصوصی طور پر استعمال کیا گیا جس سے لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ رسول کے لئے نبی ہونا شرط ہے حالانکہ یہ سراسر تکذیبِ قرآن ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ظاہر ہوگا۔

ا۔ ہود ۷۷۔ ''اور جب ہمارے رسول (فرشتے) لوط کے پاس آئے تو اسے انکی وجہ

سے رنج پہنچا......الخ''۔

۲۔ہود ۸۱۔''وہ (فرشتے) بولے اے لوط ہم تیرے رب کے رسول ہیں''۔

۳۔حجر ۶۱۔''پس جب اللہ کے رسول آلِ لوط کے پاس آئے......الخ''۔

۴۔ حج ۷۵۔'' اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسولوں کو چھانٹ لیتا ہے......الخ''۔

۵۔فاطر ۱۔''الحمد اللہ ہی کے لئے ہے۔(وہ) آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا فرشتوں کو رسول بنانے والا ہے''۔

ان تمام آیات سے ثابت ہوگیا کہ رسول کے لئے نبی ہونا ضروری نہیں ہے۔ اللہ نے بھی قرآن میں حضرت ختمی مرتبت کو خاتم النبیین کہا ہے۔خاتم المرسلین کسی ایک مقام پر بھی نہیں کہا۔ یہ حقیقت ہے کہ عقیدۂ ختمِ نبوت ضروریاتِ دین سے ہے اور اسکا انکار کرنے والا یقیناً کافر ہے لیکن مسلمانوں کی بربادی اس وقت شروع ہوئی۔وہ ٹکڑیوں میں تب تقسیم ہوئے اور ان پر ذلت و مسکنت اس وقت طاری ہوئی جب انھوں نے خود اپنے دل سے فرض کرکے اپنے باطل اور مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ختمِ نبوت کے ساتھ ساتھ ختمِ رسالت کا نظریہ بھی اپنالیا۔ایسا کرکے انھوں نے خود پر ہدایت کے دروازوں کو بند کرلیا اور فیضِ خداوندی کے سلسلے کو منقطع کرلیا اور اس طرح پورے دین کو مشتبہ بنا کر رکھ دیا کہ اب کوئی اس بات کا فیصلہ کرنے والا باقی نہ

رہا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ ختم رسالت کا عقیدہ کسی بھی نہج سے معقول نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر ائمہ معصومین کو رسول نہ مانا گیا تو انکا منجانب اللہ ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا اور اسطرح (معاذاللہ) انکی امامت ہی باطل قرار پاتی ہے۔

اس سلسلے میں ہم چند مزید شواہد پیش کرتے ہیں تا کہ شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

۱۔نساء ۱۵۰۔۱۵۱۔ ''بیشک جو لوگ اللہ اور اسکے رسولوں کا انکار کرنے والے ہیں وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اللہ اور اسکے مرسلین کے درمیان (سلسلہ منقطع کرکے) فرق ڈال دیں وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں (انبیاءِ مرسلین) پر ایمان لاتے ہیں اور بعض (ائمہؑ مرسلین) کا انکار کرتے ہیں اور وہ ارادہ کریں گے کہ درمیانی راستہ (انبیاءِ مرسلین کا اقرار اور ائمہؑ مرسلین کے انکار کا) اختیار کریں وہ لوگ حقیقی کافر ہیں اور ہم نے ان کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

تفسیر قمی جلد ا صفحہ ۱۵۷۔اس آیت کی تفسیر میں معصومؑ فرماتے ہیں۔''یہ وہ لوگ ہیں جو رسولؐ اللہ کا اقرار کرتے ہیں اور حضرت امیرؑ المومنین کا انکار کرنے والے ہیں''۔

(مولو دِ کعبہ صفحہ ۳۵)۔

۲۔کمال الدین وتمام النعمہ صفحہ ۳۲۷ حدیث ۱۰۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔''جب امام قائمؑ قیام کریں گے تو کہیں گے کہ میں تم لوگوں سے بحکمِ خدا تمھارے خوف کی وجہ سے غائب ہو گیا تھا۔اب اللہ کا حکم میرے پاس پہنچ گیا ہے اور اس نے مجھے مرسلین میں

سے قرار دیا ہے''۔

مناقبِ ابن شہر آشوب شیعوں کی مشہور و معروف کتاب ہے اور شیعہ لٹریچر میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ اردو میں اسکا ترجمہ دو بزرگوں نے کیا ہے۔ مولانا ظفر حسن صاحب (مترجم اصولِ کافی) نے اپنے ترجمے کا نام ''مجمع الفضائل'' رکھا ہے۔ دوسرا ترجمہ مولانا ملک محمد شریف صاحب نے کیا ہے اور اسکا نام ''عمدۃ المطالب'' رکھا ہے۔ ہم دونوں کتابوں سے احادیث پیش کررہے ہیں تا کہ یہ گمان نہ کیا جاسکے کہ ترجمے میں کوئی غلطی ہوگئی ہے کیونکہ دونوں علماء نے الگ الگ ترجمہ کیا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ دونوں نے بیک وقت غلط ترجمہ کردیا ہو۔

۳۔ مجمع الفضائل جلد ۲ صفحہ ۱۴۰ اور ۴۰۹۔ عمدۃ المطالب جلد ا صفحہ ۴۴۶۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''شبِ معراج خداوندِ عالم نے مجھے علیؑ کے بارے میں تین باتوں کی وحی کی ہے کہ وہ امام المتقین۔ سید المرسلین اور قائدِ الغر المحجلین ہیں''۔

۴۔ عمدۃ المطالب جلد ا صفحہ ۴۴۶ (یہ پہلی حدیث کے علاوہ ہے)۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''یا علیؑ تم سید المرسلین۔ امام المتقین۔ قائدِ الغر المحجلین اور یعسوب المومنین ہو''۔

یہ تمام وضاحت ہم نے اس لئے کی تا کہ ہم حضرت امیرؑ المومنین کے فرمان کے آخری حصے پر حتی المقدور روشنی ڈال سکیں جس میں آپؑ فرماتے ہیں۔ ''میرے اسم

کے ساتھ تمام انبیاءؑ کو مدعو کیا گیا"۔اور یہ اشارہ ہے دو آیات کیطرف ۔

(الف)۔آلِ عمران ۸۱۔"(اس وقت کو یاد کرو) جب کہ اللہ نے تمام انبیاءؑ سے میثاق لیا تھا کہ یقیناً ہم نے تم کو کتاب وحکمت عطا کی ہے۔پھر تمھاری طرف وہ رسول آئے گا جو تمھاری تصدیق کرے گا لہٰذا تم پر لازم ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اسکی مدد کرو۔اللہ نے کہا کہ کیا تم نے میرا عہد وپیان قبول کیا؟۔انھوں نے کہا کہ ہاں ہم نے اقرار کیا تو فرمایا کہ ایک دوسرے پر گواہ رہو اور میں تم پر گواہ ہوں"۔

(ب)۔احزاب ۷تا ۸۔"اور (اے رسولؐ وہ وقت یاد کرو) جب کہ ہم نے نبیوں سے اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے انکا میثاق لیا اور ہم نے ان سے بڑا پکا عہد لیا تاکہ وہ سچوں سے انکی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور اس نے کافروں کے لئے دردناک عذاب تیار کیا ہوا ہے"۔

پہلی آیت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اللہ نے پکا عہد لیا ہے تمام انبیاء سے۔پس جس جس پر لفظِ نبی کا اطلاق ہوتا ہے وہ اس عہد میں شامل ہے کیونکہ اللہ نے اس آیت میں کسی بھی قسم کا استثنیٰ روا نہیں رکھا۔اور سورۂ احزاب کی آیات سے اس بات کی مزید توثیق ہو جاتی ہے۔اور یہ عہد لیا گیا ایک رسول کے متعلق جو یقیناً نبی نہیں ہے ورنہ وہ بھی عہد لئے جانے والوں میں شامل ہوتا۔

اتنی بات تو بالکل واضح ہے جس میں حیل و حجت کی گنجائش ہے ہی نہیں ۔لیکن وہ مسلمان ہی کیوں کہلائے جو فرمانِ خدا کو جوں کا توں قبول کرلے ۔ چنانچہ اب شروع ہوتی ہے مسلمانوں کے ذہنی داؤ پیچ کی حکایت ۔غیروں کا تو نہ میں نے کبھی ذکر کیا ہے اور نہ اب کروں گا لیکن اس آیت کے سلسلے میں شیعہ علماء وخطباء کا اضطراب قابلِ دید ہے ۔ یہ ایک انوکھی اور دلچسپ کہانی ہے ۔اگر اجازت ہو تو سناؤں؟ ۔

اوّل تو اس اہم ترین آیت کیطرف توجہ ہی نہیں کی جاتی اور اکثر قرآنوں میں اسکو تفسیر کے قابل سمجھا ہی نہیں گیا ۔البتہ ہمارے بڑے بڑے علماء اور خطباء جب کبھی حضرت صاحب الزمانؑ کے بارے میں تقاریر فرماتے ہیں تو یہ توضیح فرماتے ہیں کہ رسول سے مراد حضرت ختمی مرتبتؐ ہیں اور انکے نمائندے ہیں ہمارے امام زمانہؑ ۔اور انبیاءؑ کے نمائندے ہیں جناب عیسیٰؑ ۔پس جب امامؑ ظہور فرمائیں گے تو حضرت عیسیٰؑ بھی نازل ہونگے اور تمام انبیاءؑ کی طرف سے(For & On behalf of) امامؑ کی بیعت بھی کریں گے اور نصرت بھی ۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے ۔میں سید انشاء کا مصرعہ تو نہیں پڑھوں گا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ واقعی بڑی دور کی سوجھی ! ۔حالانکہ اگر آپ آیت پڑھیں تو سارا معاملہ آپکی سمجھ میں آجائے گا ۔یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت ختمی مرتبتؐ کسی ایک نبی کے زمانے میں بھی مبعوث برسالت نہیں ہوئے اور نہ ہی آنحضرتؐ کے زمانے میں انبیاءؑ کو دوبارہ زندہ کیا گیا ۔اس لئے کسی ایک نبی

کیلئے بھی یہ بات ممکن نہ تھی کہ آپ پرایمان لا سکے اور آپ کی نصرت کر سکے۔ اور اللہ کسی کو بھی تکلیفِ مالا یطاق نہیں دیتا جبکہ آیت کا لب ولہجہ اور عہد کی شدت بتا رہی ہے کہ اس رسول پر ایمان لانا اور اسکی نصرت کرنا ہر نبی پر فرداً فرداً واجب تھا کیونکہ وہ ایک دوسرے کے گواہ بنے تھے یعنی ہر ایک کو یہ گواہی دینا تھی کہ دوسروں نے اس عہد کو پورا کیا ہے۔ مگر انسانی ذہن کی جولانی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ لوگوں نے اس ''واجبِ عینی'' کو ''واجبِ کفائی'' میں تبدیل کر دیا۔ اسطرح تمام انبیاء تو مزے میں رہے اور اکیلے حضرت عیسیٰ پھنس گئے کہ وہی لڑیں اور وہی بھڑیں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ ساری جوڑ توڑ کس لئے کی گئی؟۔ اسکا واحد مقصد حضرت امیر المومنین کی فضیلت کو چھپانا اور اللہ کے چہرے پر نقاب ڈالنا ہے۔

انکا فرض تھا کہ کم از کم وارثانِ قرآن کیطرف رجوع کرکے تو دیکھتے۔ یہ کوئی زحمت والا کام تو نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف چند شواہد پیش کر رہے ہیں تاکہ بات سمجھ میں آجائے۔

۱۔ شہادتِ ولایتِ علی صفحہ ۹۶۔ امام محمد باقرؑ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ''اللہ نے انبیاءؑ سے ولایتِ علی کا میثاق لیا تھا''۔

۲۔ حق الیقین جلد ۲۔ صفحہ ۱۸۔ امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ جناب امیر المومنین نے فرمایا۔ ''جب اللہ نے انبیاء کی روحیں پیدا کیں تو ان سے عہد و پیمان لیا کہ ہم پر

ایمان لائیں اور ہماری مدد کریں‘‘۔

۳۔حق الیقین جلد۲ صفحہ ۷۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔’’انبیاءؑ رجعت میں جناب امیرؑ المومنین کی نصرت کریں گے‘‘۔

۴۔اسی کتاب کے صفحہ ۸۱ پر حضرت امیرؑ المومنین ارشاد فرماتے ہیں۔’’بیشک اللہ نے مجھ سے اور محمدؐ سے عہد لیا کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ بیشک میں نے محمدؐ کی مدد کی اور آپؐ کے روبرو جہاد کیا اور میں نے اس عہد و پیان کو آنحضرت کی نصرت میں اللہ کی خوشنودی کے لئے پورا کیا لیکن ابھی انبیاءؑ اور رسولوں میں سے کسی ایک نے بھی میری مدد نہیں کی ہے۔مگر اس کے بعد رجعت میں میری مدد کریں گے۔اس وقت مشرق و مغرب کے مابین تمام زمین میری ہوگی اور یقیناً اللہ آدمؑ سے لیکر خاتمؐ تک سب کو مبعوث کرے گا۔جس قدر انبیاءؑ و رسول ہوئے ہیں میرے روبرو وہ تمام انبیاءؑ۔تمام جن و انس میں سے زندوں اور مردوں کے سروں پر جو اس وقت زندہ ہوئے ہونگے تلواریں ماریں گے‘‘۔

۵۔مفاتیح الجنان صفحہ ۱۰۰۸۔زیارتِ امام زمانہؑ کا ایک جملہ یہ ہے۔’’سلام ہو آپؑ پر اے اللہ کے وہ میثاق جو اس نے باندھا اور پکا کیا‘‘۔

ہم ’’ید اللہ‘‘ کے حوالے سے صفتِ خلق پر گفتگو کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں دو شواہد پہلے گزر چکے اور اب تیسری دلیل پیشِ خدمت ہے۔

۳۔ص ۷۵۔ ''(اللہ نے کہا) اے ابلیس کس چیز نے تجھے اسکو سجدہ کرنے سے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے''۔

پس خلق کا تعلق یقیناً اللہ کے ہاتھ سے ہے اور وہی حقیقی خلاقِ کون ومکاں ہے۔ رہا اللہ کے دو ہاتھوں کا سوال سو اس پر بھی ہم ایک مختصر گفتگو کریں گے۔

قدرت وتصرف

ہاتھ استعارہ ہے قدرت وتصرف کا۔ پس جو بھی اللہ کا ہاتھ ہوگا وہ متصرف علی الا اطلاق ہوگا۔ اس کی قدرت وتصرف میں شک کرنا یا حیرت میں پڑ جانا یا اسکی شان میں تقصیر کرنا اور یہ کہنا کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے اور یہ نہیں حقیقتاً اللہ کو مجبور و عاجز ماننے کے مترادف ہے۔ ان باتوں کو معمولی سمجھنا اور علیؑ کے بارے میں غیر محتاط رویہ اختیار کرنا انکارِ توحید پر جا کر منتج ہوتا ہے لہٰذا انتہائی احتیاط لازم ہے۔ یہاں ہم اللہ کے ہاتھ کی قدرت وتصرف کی ایک جھلک دکھاتے ہیں۔ اسکو سمجھنا اور اسکا تجزیہ کرنا خود آپکا کام ہے۔ لیکن پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک لفظ کی وضاحت کر دیں اور وہ ہے ''ملکوت''۔ عام طور پر اسے مَلک کی جمع سمجھا جاتا ہے حالانکہ مَلک کی جمع ملائکہ ہے نہ کہ ملکوت۔ بلکہ یہ جمع ہے ''مَلکہ'' کی۔ جسکے معنی ہیں قوت۔ پوری کائنات میں جتنی بھی قوتیں کام کر رہی ہیں انکو ملکوت کہتے ہیں۔ سائنس کی زبان میں انھیں زمان۔ مکان اور توانائی (Time-Space-Energy) کہتے ہیں۔ یہ قوتیں نہ

ہوں تو عالمِ وجود چشم زدن کے لئے بھی باقی نہیں رہ سکتا اور ہمارا مقصود یہی واضح کرنا ہے کہ ان تمام قوتوں کا مالک کون ہے۔

۱۔یٰسین۔۸۳۔''پس پاک ہے وہ ذات جسکے ہاتھ میں ہر شے کا ملکوت ہے''۔

۲۔مومنون۔۸۸۔''(اے رسولؐ) تم کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ ہر چیز کی ملکوت کس کے ہاتھ میں ہے''۔

ان دونوں آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ پورا عالمِ کون ومکان علیؑ کی مٹھی میں ہے کیونکہ وہ اللہ کا ہاتھ ہے اور کوئی بھی شے اسی سے طلب کی جاتی ہے جسکے قبضے میں وہ ہو۔لہذا جب بھی کوئی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو جو شے اسے مطلوب ہو وہ علیؑ ہی سے مانگے کیونکہ ''بیدہٖ ملکوت کلِ شی''۔

۳۔زمر۔۶۷۔''اور انھوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ حق ہے اسکی قدر کرنے کا۔اور قیامت کے دن ساری زمین اسی کے قبضے میں ہوگی اور آسمان اسکے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہونگے۔پاک اور بلند و برتر ہے وہ ان چیزوں سے جنکو یہ اسکا شریک ٹھہراتے ہیں''۔

یہ ایک عظیم الشان آیت ہے جس پر اگر تھوڑا سا بھی تدبر کیا جائے تو آنکھوں سے بہت سے حجابات اٹھ جائیں گے۔

سب سے پہلے جس بات پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں

''اللہ'' سے کون مراد ہے؟۔اور اللہ کی قدر کرنے کا کیا مطلب ہے؟۔کیا کبھی اللہ کسی کے گھر مہمان ہوا ہے کہ اسکی قدر نہیں کی گئی؟۔کیا اللہ کبھی ظاہر بظاہر سامنے آیا ہے کہ اسکی قدر نہیں کی گئی؟۔کیا کبھی کسی نے اللہ کو اسکے حق سے محروم کیا ہے کہ اسکی قدر نہیں کی گئی؟۔کیا کبھی کسی نے اللہ کی شان کا انکار کیا ہے کہ اسکی قدر نہیں کی گئی؟۔پس سوچنا چاہئے کہ یہ کون اللہ ہے جسکی ناقدری کی گئی ہے!۔اس اللہ کی وضاحت آیت کا اگلا جملہ کررہا ہے۔''اور قیامت کے دن ساری زمین اسی کے قبضے میں ہوگی''۔ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا قیامت سے پہلے ساری زمین اسکے قبضے میں نہ تھی؟۔پھر یہ قیامت کی تخصیص کیوں؟۔یہ جملہ تو ایسے شخص کے لئے بولا جاسکتا ہے جس سے زندگانی دنیا میں زمین چھین لی گئی ہو اور اسے محروم کردیا گیا ہو اور اسکی زمین پر ناجائز قبضہ کرلیا گیا ہو۔اللہ کے لئے تو یہ جملہ بولا ہی نہیں جاسکتا۔لہذا ڈھونڈیئے کہ وہ اللہ کون ہے جسکا حقِ حکمرانی اس حیاتِ ظاہری میں غصب کرلیا گیا تھا؟۔اور اگر اب بھی وہ اللہ نظر نہیں آیا تو ہم حضرت امیر المومنین کا وہ فرمان ایک بار پھر نقل کرتے ہیں جو سطورِ بالا میں پیش کیا جاچکا ہے اور جس میں آپ فرماتے ہیں۔''اس وقت مشرق ومغرب کے مابین تمام زمین میری ہوگی''۔

اسکی مزید توضیح کے لئے ہم سورہ مومن کی آیت ۱۶ آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتے ہیں جس میں ارشادِ رب العزت ہوتا ہے۔''جس دن وہ (قبروں سے) نکل کھڑے

ہونگے انکی کوئی چیز اللہ پر پوشیدہ نہ ہوگی (آواز دی جائے گی) آج کے دن حکومت کس کی ہے؟۔(جواب دیا جائے گا) اللہ کی جو واحد القہار ہے''۔

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج اللہ کی حکومت نہیں ہے؟۔پھر یہ ''آج کے دن'' کی تخصیص کیا معنی رکھتی ہے؟۔معلوم ہوا کہ اس آیت میں ''اللہ'' سے مراد وہ ہے جسے زمین میں کمزور کر دیا گیا تھا۔اس سے اسکا حقِ حکمرانی غصب کر لیا گیا تھا۔پس جب اسکا وارث ظہور فرمائے گا تب سوال کیا جائے گا کہ بتاؤ آج کس کی حکومت ہے؟اور کہاں گئی تمھاری طرّم خانی؟ کہاں گئیں تمھاری عالی شان حکومتیں؟ اور کہاں گئے تمھارے بلند و بالا محلات؟۔اسی لئے یہاں اللہ نے صفتِ قہاریت کا اعلان کیا ہے۔دنیا نے ابھی اللہ کا قہر دیکھا ہی کہاں ہے!۔اب تک تو وہ اسکی رحمانیت ہی دیکھتے آئے ہیں۔اسکا قہر تو تب ہی دکھائی دے گا جب اسکے اسم ''القہار'' کا ظہور ہوگا۔عجل اللہ تعالیٰ فرجہ۔

اختصار کی عادت نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا ورنہ اس موضوع پر تو دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔لیکن یہ خیال ہمیشہ ہمیں تفصیل سے روکے رکھتا ہے کہ کہیں ہمارے قارئین کی نظروں سے نفسِ موضوع نہ اوجھل ہو جائے۔

''آسمان اسکے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہونگے''۔

یہ ایک عجیب وغریب جملہ ہے جسکی تفصیل میں جائے بغیر بھی اللہ کے ہاتھ کی قوت اور تصرف کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔خاص طور پر لفظِ ''داہنے ہاتھ'' توجہ کو کھینچتا ہے اور

ذہن فوراً اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ جب دایاں ہاتھ ہے تو یقیناً بایاں ہاتھ بھی ضرور ہوگا کیونکہ یہ تو طے ہے کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں جیسا کہ سورۂ ص میں گزرا۔دائیں ہاتھ کو تو ہم صاف صاف پہچان رہے ہیں لیکن یہ بایاں ہاتھ کون ہے؟۔یہ مسلمہ ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر فضیلت حاصل ہوتی ہے لہٰذا یہ بایاں ہاتھ وہی ہوسکتا ہے جو دائیں ہاتھ کا محکوم ہو۔قرآن نے فیصلہ دے دیا کہ الرّجال قوّامون علیٰ النساء ۔یعنی مرد کو عورت کا حاکم بنایا گیا ہے۔جب اللہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دنیا میں بھیجا تو دونوں کی پہچان کرانے کے لئے ایک کو حاکم بنایا اور دوسرے کو محکوم تا کہ دنیا جان لے کہ دایاں ہاتھ کون ہے اور بایاں ہاتھ کون۔انہی دو ہاتھوں کو اللہ نے سورۂ رحمٰن میں ''دو سمندر'' کہا ہے جو ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔اور یہ دونوں اس قدر طاقتور سمندر ہیں کہ اگر برزخ (جناب ختمی مرتبتؐ) درمیان میں نہ ہوتو یہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کریں۔لیکن حضرت ختمی مرتبتؐ کی وساطت سے زن و شوہر کے رشتے میں منسلک ہوجانے سے تعینِ فضیلت ہوگیا اس لئے دونوں سمندروں میں کوئی لہر ایسی نہیں اٹھتی جس سے حصولِ سبقت کا اظہار ہوتا ہو۔

۴۔مفاتیح الجنان صفحہ۸۲۔''اے معبود!میری مہار تیرے ہاتھ میں ہے''۔

اس جملے سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ہمارے جسم و جان کا مالک کون ہے۔گھوڑے کی مہار

اسکے سوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔وہ اسے جب چاہے اور جس طرف چاہے موڑ سکتا ہے۔جس چال سے چاہے اسے چلا سکتا ہے۔اسکی مرضی ہے کہ جب چاہے اسے چلائے اور جب چاہے روک دے۔اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ علیؑ ہمیں جس حال میں رکھے ہم اس حال میں خوش ہیں۔اس بات کو واضح رہنا چاہئے کہ صبر ایک الگ شے ہے اور راضی وخوشنود ہونا دوسری شے۔ہم پر محبت علیؑ کی وجہ سے جو مصیبتیں پڑتی ہیں ان پر ہم صبر نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ جس میں ہمارا مالک خوش اس میں ہم بھی خوش۔

رزّاقیت

ہاتھ استعارہ ہے رزاقیت کا کیونکہ عطا ہاتھ ہی سے کیا جاتا ہے۔

ا۔حدید ۲۹۔''یقیناً فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ فضلِ عظیم والا ہے''۔

۲۔مائدہ ۶۴۔''اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ان ہی کے ہاتھ بندھے گئے اور جو کچھ انھوں نے کہا اسکے سبب سے ان پر لعنت کی گئی۔بلکہ اسکے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے''۔

اس آیت سے جہاں دستِ خدا کی رزاقیت ثابت ہوتی ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ علیؑ کی رزاقیت کا انکار کرنے والوں پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے۔سو ہم بھی

ایسے لوگوں سے بیزار ہیں۔

عین اللہ

عین یعنی آنکھ استعارہ ہے حفاظت اور نگرانی کرنے کا۔اسی لئے ذیل میں جو آیات بیان کی جارہی ہیں مترجم نے ان میں ''بِاَعیُنِنا'' کا ترجمہ ''ہماری نگرانی میں'' کیا ہے۔

ا۔ہود ۳۷۔''اور (اے نوحؑ) تو ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا''۔

حضرت نوحؑ پیشے کے اعتبار سے بڑھئی نہیں تھے اسکے باوجود انھوں نے ایک ایسی عظیم کشتی بنا ڈالی جس نے تاریخ کے سب سے ہیبت ناک طوفان کو زیر کرلیا۔یہ کشتی کیسے بنی؟۔وحی طریقہ بتاتی جارہی تھی اور اللہ کی آنکھ اسکی نگرانی وحفاظت کررہی تھی اسی لئے اللہ کی اس نگراں آنکھ نے ارشاد فرمایا۔''میں نے ہی نوحؑ کی کشتی کو طوفان سے بچایا''۔

۲۔قمر ۱۴۔''وہ (کشتی) ہماری نگرانی میں چلتی رہی''۔

معلوم ہوا کہ کشتی نوحؑ بنی بھی عین اللہ کی نگرانی میں اور چلی بھی اسی کی نگرانی میں۔اسی طرح طٰہٰ ۳۹ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ کی پرورش بھی عین اللہ کی نگرانی میں ہوئی۔

۳۔طور ۴۸۔''اور (اے رسولؐ) تو اپنے رب کے حکم کے لئے صبر کر۔پس یقیناً تو ہماری نگرانی میں ہے''۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ خاتم الانبیاءؐ کی حفاظت اور نگرانی بھی اللہ کی آنکھ ہی کر رہی تھی اور وہؐ ہمہ وقت اللہ کی نگاہ میں تھے۔پس یہ اللہ کی آنکھ ہے جس سے حضرت ختمی مرتبتؐ کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔کیونکہ جسکی زندگی کا ایک ایک لمحہ عین اللہ کی نگرانی میں گزرے اس سے صدورِ خطاءوعصیان ونسیان کا تصور بھی محال ہے۔

علیؑ کے عین اللہ ہونے سے انکے لئے دو باتیں حتمی طور پر ثابت ہوتی ہیں۔اوّل انکا حاضر وناظر ہونا اور دوئم انکا عالم الغیب ہونا کیونکہ کسی بھی شے کا اللہ کی آنکھ سے غائب وپوشیدہ رہ جانا ممکن نہیں ہے۔

اللہ کا مقام

اس سے قبل ہم قربتِ خدا پر گفتگو کر چکے ہیں اور سڑکوں پر نصب شدہ سنگِ میل کی مثال کے ذریعے اس موضوع کا ایک دھندلا سا تصور آپکے اذہان تک پہنچا چکے ہیں۔یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے مشاہدات کا قیدی ہے اور کسی بھی شے کی طرف متوجہ ہونے کے لئے وہ اس شے کے مشاہدے کا محتاج ہے۔اللہ ہمارا خالق ہے اور یقیناً وہ ہماری تخلیقی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہے لہٰذا اسکا اپنی قربت کیطرف دعوت دینا بے معنی نہیں ہوسکتا۔قریب ہوا جاتا ہے مقام سے۔چاہے وہ

مقام زمانی ہو یا مکانی ۔وہمی ہو یا قلبی ۔لفظی ہو یا معنوی۔ حقیقی ہو یا مجازی۔ اسطرح بغیر مقام کے تعین کئے ہوئے کسی سے قریب یا دور نہیں ہوا جا سکتا اور اللہ سے قربت کو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ سورۂ رحمٰن آیت ۴۶ میں اللہ خود ارشاد فرماتا ہے۔ ''ولمن خاف مقام ربہ جنتان ''۔(اور جو شخص اپنے رب کے مقام سے ڈرے اسکے لئے دو جنتیں ہیں)۔لہٰذا غور کرنا چاہئے کہ انسان کے لئے اللہ کی قربت کیونکر ممکن ہوسکتی ہے اور اگر ممکن نہیں ہوسکتی تو پھر اس حکیم وعلیم نے اسکا حکم کیوں دیا ہے؟ ۔پس جو شخص اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ حکم دینے والا حکیم مطلق ہے تو وہ اس بات کو بھی یقیناً تسلیم کرے گا کہ کوئی نہ کوئی مقام ایسا ضرور ہے جسکو اللہ نے اپنا مقام قرار دیا ہے جیسے کعبے کو اپنا گھر قرار دیا ہے ۔اگر انسان کو اس مقام کا علم نہیں تو اسکے لئے قربتِ خدا بے معنی ٹھہرتی ہے اور اسطرح اسکی زندگی بھر کی عبادات بھی مہمل قرار پاتی ہیں۔ یہ ہم پر ائمۂ معصومین کا احسان ہے کہ انھوں نے اتنے باریک اور نازک مسائل کو ہمارے لئے آسان کردیا اور اپنے سجدوں کو گواہ بنا کر شرک کی جڑیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کاٹ دیں۔اب ''شرک !شرک!'' کی پکار وہی لوگ مچاتے ہیں جو اللہ کے مقام سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن مومن جانتا ہے کہ اللہ لازمان ولامکان ہوتے ہوئے بھی ایک مقام رکھتا ہے۔مومن جانتا ہے کہ اللہ دور رہوتے ہوئے بھی قریب اور قریب ہوتے ہوئے بھی دور کسطرح ہوتا

ہے اور وہ اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ دوری اور قربت کا تعلق مقام اللہ سے ہے نہ کہ اللہ سے۔

مقام اللہ کون ہے؟

مقام نام ہے اللہ کی صفت کا۔ اللہ کی صفات ہماری صفات کیطرح نہیں ہیں بلکہ وہ وجود خارجی رکھتی ہیں اور ہم جیسے مجبوروں کی مشکل دور کرنے کے لئے جسم وجسمانیت کے ساتھ ظہور کرتی ہیں اور ان سے قلبی اعتبار سے قریب ہونے کا نام قربتِ خدا ہے۔ اب ہم اللہ کے مقامات کا تعارف آپ سے کراتے ہیں اور اسکے لئے ہم آپکو کتابیں ڈھونڈنے کی زحمت سے دوچار نہیں کریں گے بلکہ ائمۂ اطہار کی تعلیم کردہ دعائیں ہی ہماری رہنمائی کریں گی اور یہ وہ دعائیں ہیں جو اکثر مومنین اپنی نمازوں کے بعد پڑھتے ہیں اور اب انشاءاللہ وہ ان دعاؤں سے حقیقی لطف اٹھائیں گے۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۲۷۔ ''پروردگار میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان تمام معنی کے ذریعے جن سے تیرے امر کے ولی تجھے پکارتے ہیں۔ (یہاں سے معلوم ہوا کہ ہم اللہ کو اسکے اسم کے ذریعے پکارتے ہیں لیکن اسکے اولیاءِ امر اسے اسکے معنی کے ذریعے پکارتے ہیں)۔ جو تیرے راز کے امانتدار (یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کونسا راز ہے جسکے یہ امانتدار ہیں۔ پس سمجھ لیجئے کہ وہ راز خود اللہ کی ذات ہے جسکا تعارف کرانے کے لئے یہ مقدس ہستیاں دنیا میں آئی تھیں اور انھوں نے خود کو ظاہر کر کے ذات کا

تعارف کرایا۔اسطرح وہ ذات راز ہوتے ہوئے بھی ظاہر ہوگئی اور ظاہر ہونے کے باوجود راز ہی رہی)۔تیرے امر کی خوشخبری پانے والے اور تیری قدرت کی توصیف کرنے والے ہیں۔میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری اس مشیت کے واسطے سے جو ان میں بولتی ہے۔پس تو نے بنایا انکو اپنے کلمات کی کانیں۔اپنی توحید کے ارکان۔اپنی آیات ۔اپنے مقامات۔جو تجھے پہچانتا ہے انکے ذریعے پہچانتا ہے۔ان میں اور تجھ میں کوئی تفریق نہیں مگر یہ کہ وہ تیرے بندے اور تیری مخلوق ہیں اور انکی حرکت اور سکون تیرے حکم سے ہے۔انکی ابتداء تجھ سے اور انتہاء تجھ تک ہے''۔

آپ یقین فرمائیں کہ اگر ان دعاؤں کی تشریح کی جائے تو مفاتیح الجنان سے ضخیم تر کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ہمارے احباب ہم سے اصرار کرتے ہیں کہ ہم ان دعاؤں کی شرح لکھیں لیکن اس سلسلے میں ہم ان سے پیشگی معذرت کئے لیتے ہیں۔اوّل اس لئے کہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے اور یہ بات بہت اہم ہے جسے سمجھنا چاہئے۔دوئم اس لئے کہ ہماری صحت اس کام کی اجازت نہیں دیتی۔سوئم اس لئے کہ حقیقتاً یہ کام علماء کا ہی ہے اور ان ہی کو یہ کام کرنا چاہئے۔آج تک بہت سے علماء نے مختلف دعاؤں اور زیارات کی شرحیں لکھی ہیں لیکن اسکے لئے انھوں نے فلسفے اور تصوف کی دقیق اور نا قابلِ فہم اصطلاحوں کا سہارا لینا پسند کیا ہے۔اپنی مصلحت وہ خود

جانتے ہونگے مگر اسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عوام روزِ اوّل کیطرح آج بھی ان حقائق سے بے بہرہ ہیں اور ان دعاؤں اور زیارات کا مصرف انکے نزدیک فقط اتنا رہ گیا ہے کہ حصولِ مقاصد کے لئے انھیں منتر سمجھ کر پڑھتے رہیں۔ اللہ ہمارے علماء کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ حصولِ معرفت کے مقصد کے تحت ان دعاؤں اور زیارات کی شرح ایسے سہل انداز میں لکھیں جن سے ایک عام آدمی بھی مستفیض ہو سکے اور مذہب اہلِ بیتؑ پروان چڑھ سکے۔ آمین

مقامات خدا کا تعارف ہو گیا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ دو باتوں کی مزید وضاحت کر دیں۔

توحید کے ارکان

ارکان رکن کی جمع ہے جسکے معنی ہیں ستون۔ کسی بھی عمارت کا دارومدار اسکے ستونوں پر ہوتا ہے اور پوری عمارت ستونوں پر ہی کھڑی ہوتی ہے۔ عمارت جتنی عظیم الشان ہوگی اتنا ہی اسکے ستونوں کا مضبوط اور پائیدار ہونا ضروری ہوگا۔ اگر ستونوں کو ہٹا دیا جائے تو پوری عمارت منہدم ہو جائے گی اور اسے دوبارہ اپنی اصلی حالت میں نہیں لایا جا سکے گا جب تک دوبارہ ستونوں کا ظہور نہ ہو۔ بالکل اسی طرح عمارت توحید بھی اپنے ستونوں پر قائم ہے۔ یہ ستون نہ ہوں تو توحید کا کوئی تصورِ موہوم بھی باقی نہیں رہتا۔ اب توحید کی جتنی بھی عظمت آپکے تصور میں آ سکتی ہے کم از کم اتنی ہی عظمت

اسکے ارکان کی بھی تسلیم کرنا پڑے گی مگر یہ سوچ کر کہ عظمت کا یہ تصور ہماری حد ہے نہ کہ ارکانِ توحید کی۔اور اگر کوئی آپ کے تصور سے بڑھ کر بات کہدے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ آپ کی معرفت میں اضافہ ہوگیا نہ کہ اس پر فتوے لگانا شروع کردیں۔فتوے لگانے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ توحید کی عظمت کو محدود سمجھتے ہیں اور یہ بات منافیِ ایمان ہے۔اسی سے ہماری بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارے لئے توحید کا مطلب سوائے اسکے کچھ نہیں کہ مظاہرِ توحید کی معرفت حاصل کی جائے۔انکو درمیان سے ہٹا کر ہمارے لئے توحید کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔اللہ اپنی ذات میں قدیم وقیوم ہے۔اس میں کبھی کوئی تغیر نہیں ہوتا۔کوئی اسے مانے یا نہ مانے اس سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔اسے ماننے والی اور اسکی عبادت کرنے والی مخلوق نہ تھی مگر وہ تھا اور جب کچھ بھی نہ رہے گا تب بھی وہ رہے گا۔توحید کا منہدم ومعدوم ہونا ہماری نسبت سے ہے یعنی ہم بغیر ارکانِ توحید کے ادراکِ توحید کر ہی نہیں سکتے اور اگر یہ ارکان نہ ہوں تو مشاہدے کے اعتبار سے توحید ہمارے لئے معدوم رہے گی۔

ابتداء وانتہاء

اس دعا کا ایک جملہ یہ ہے کہ ''انکی ابتداء تجھ سے اور انتہاء تجھ تک ہے''۔

یہ ایک ایسا آسان اور روشن و واضح جملہ ہے کہ ایک کم علم سے کم علم آدمی بھی اسے پڑھتے ہی اسکے مفہوم تک پہنچ جائے گا مگر برا ہو شرک پرستی کا جس نے حقائقِ معرفت کو

لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے۔

پہلا مطلب جو اس جملے سے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی کوئی ابتداء نہیں اسی طرح انکی بھی کوئی ابتداء نہیں اور جس طرح اللہ کی کوئی انتہاء نہیں اسی طرح انکی بھی کوئی انتہاء نہیں۔اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ ہستیاں اللہ کی ذات کا تعارف کرانے آئی تھیں اور قدیم کا تعارف قدیم سے ہی ہو سکتا ہے۔حادث سے کبھی نہیں ہو سکتا۔اس جملے کی مزید تفہیم ہم ائمۂ معصومین ہی کے ایک ارشاد کی روشنی میں کرتے ہیں جہاں ارشاد ہوتا ہے۔"یفصل نور نا من نور ربّنا کشعاع الشمس من الشمس "۔یعنی ہمارے نور کی چھوٹ اپنے رب کے نور سے اسطرح ظاہر ہوتی ہے جیسے سورج کی شعاع سورج سے۔(العلی سلطاناً نصیرا)۔سورج کا ہم صبح و شام مشاہدہ کرتے ہیں۔سورج کی شعاعیں سورج سے ہی نکل کر آتی ہیں۔گویا انکی ابتداء سورج سے ہی ہوتی ہے اور یہ ابتداءِ وجود نہیں بلکہ ابتداءِ ظہور ہے۔اور شام کو یہ شعاعیں پلٹ کر پھر سورج میں چلی جاتی ہیں۔گویا انکی انتہاء بھی سورج پر ہوتی ہے۔سورج جب چاہتا ہے انکو ظاہر کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھپا لیتا ہے۔لیکن ایک لمحہ بھی ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا جب سورج ہو اور اسکی شعاعیں نہ ہوں۔اسے شرک نہیں بلکہ اثر کہتے ہیں۔سورج جب سے ہے اور جہاں کہیں بھی ہے اسکی شعاعیں اسکے ساتھ ہیں کیونکہ شعاعیں سورج کا اثر

ہیں۔آگ جب سے ہے اور جہاں کہیں بھی ہے اسکی حرارت اسکے ساتھ ہے کیونکہ حرارت آگ کا اثر ہے۔شرک تب ہوگا جب کوئی شعاع کوسورج اور حرارت کو آگ سمجھ لے۔یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں اور جدا نہیں بھی ہیں۔

مردانِ خدا خدا نہ باشند

لیکن زخدا جدا نہ باشند

یعنی مردانِ خدا خدا نہیں ہوتے لیکن اسکے باوجود خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے۔

موجود فی کلِّ شیٍ

علیؑ وہ نور ہے جو لامکان ہوتے ہوئے بھی کائنات کے ذرے ذرے میں پنہاں بھی ہے اور ظاہر بھی۔اور جس نے تمام عالمِ ہست وبود کا احاطہ کرر کھا ہے۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار

ہر ورقے دفتر یست زمعرفتِ کردگار

یعنی حقیقت بیں لوگوں کے لئے درختوں کا ہر سبز وشاداب پتہ معرفتِ کردگار کے ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے۔جو شخص طالبِ معرفت ہواسکو ہر شے میں اسی کا جلوہ نظر آئے گا اور یہی فرمایا ہے پروردگارِ عالم نے کہ تم جس طرف بھی رخ کرو گے تمہیں اللہ کا چہرہ نظر آئے گا۔لہٰذا جو شخص اشیاءِ عالم میں علیؑ کا مشاہدہ نہیں کرسکتا وہ آنکھوں کا نہ ہی مگر

دل کا اندھا ضرور ہے جیسا کہ خواجہ میر دردؔ نے فرمایا۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

لہٰذا انسان کو چاہئے کہ زمین و آسمان پر نظر کرے۔ دریاؤں اور سمندروں کا مشاہدہ کرے۔ صحراؤں۔ بیابانوں اور پہاڑوں کو دیکھے اور اپنے محبوب کا دیدار کرتا رہے کیونکہ یہ جلوہ مکان بھی ہے اور مکین بھی۔ محاط بھی ہے اور محیط بھی۔ وہ ہر شے میں ہے مگر ہر شے سے الگ۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۱۳۸۔ ''پروردگار میں سوال کرتا ہوں تیرے چہرے کے ذریعے جو ہر شے کی فنا کے بعد باقی رہے گا۔ اور تیرے اسماء کے ذریعے جنھوں نے ہر شے کے اجزاء کو پُر کر رکھا ہے۔ اور تیرے علم کے ذریعے جس نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے اور تیرے چہرے کے نور کے ذریعے جس سے ہر شے روشن ہوئی''۔

عام لوگ تو رہے ایک طرف۔ یہاں تو بعض علماء کا یہ حال ہے کہ علیؑ کے بیک وقت چالیس مقامات پر موجود ہونے میں شک کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض اس بات میں بھی شک کرتے ہیں بلکہ اسکا انکار کرتے ہیں کہ علیؑ ہر مرنے والے کے پاس کیونکر آسکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں ہزاروں لاکھوں لوگ مرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ شخص واحد۔ آنِ واحد میں متعدد مقامات پر موجود رہے۔ ان

عقل کے اندھوں کو کوئی بتائے کہ علیؑ تو اللہ کا چہرہ ہے۔وہ تو بیک وقت ہر جگہ نظر آتا ہے۔نہ صرف یہ کہ نظر آتا ہے بلکہ حقیقتاً ہر جگہ موجود رہتا ہے۔یہاں ہم کوکب دری صفحہ ۳۶ سے دو مختصر روایات نقل کرتے ہیں تا کہ اللہ کے چہرے کا معمولی سا تعارف ہو سکے۔

ا۔"مقدادؓ بن الاسواد سے روایت ہے کہ جنگِ احزاب کے دن علیؑ خندق کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے اور عمرو بن عبدود کو قتل کر چکے تھے اور اسکے قتل ہونے سے لشکرِ کفار سترہ فرقوں میں منقسم ہو گیا تھا اور میں دیکھتا تھا کہ ان سترہ جماعتوں میں سے ہر ایک فرقے کے پیچھے علیؑ تلوار لئے ہوئے تھے اور انکو گھاس کی طرح کاٹ رہے تھے حالانکہ وہ جنابؑ اپنے مقام پر کھڑے تھے اور بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کر رہے تھے کیونکہ آپؑ کی عادت تھی کہ بھاگتے کے پیچھے نہ جاتے تھے"۔

۲۔ جابرؓ بن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ جنگِ جمل میں امیرؑ المومنین کے ہمراہ حاضر تھا اور ستر ہزار افراد اس عورت کی معیت میں جمع تھے۔پس میں نے کسی بھاگتے ہوئے کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ وہ کہتا تھا کہ مجھے علیؑ نے بھگایا ہے۔اور جس زخمی کو بھی میں دیکھتا تھا وہ کہتا تھا کہ مجھ کو علیؑ نے زخمی کیا ہے اور جس مقتول کو بھی دیکھا وہ کہتا تھا کہ مجھ کو علیؑ نے قتل کیا ہے۔میں میمنہ میں جاتا تو وہاں علیؑ کی آواز سنتا اور میسرہ میں جاتا تو علیؑ کی آواز سنتا۔اور میں طلحہ کے پاس سے گزرا جبکہ وہ دم توڑ رہا تھا اور اسکے سینے میں ایک تیر لگا ہوا تھا۔میں نے اس سے کہا کہ یہ تیر تجھے کس نے مارا؟تو اس نے کہا کہ علیؑ

نے ۔میں نے کہا کہ او حزبِ بلقیس ! اور اے جندِ ابلیس !علیؑ نے کسی کے تیر نہیں مارا۔انکے ہاتھ میں تو سوائے تلوار کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔تو اس نے مجھ سے کہا۔اے جابرؓ! کیا تو اسکی طرف نہیں دیکھتا کہ کس طرح وہ ہوا میں اوپر جاتا ہے اور پھر زمین پر اتر آتا ہے۔اور کبھی مشرق کی طرف سے آتا ہے اور مغرب کیطرف سے۔اور اس نے تمام مشارق و مغارب کو اپنے سامنے ایک کر دیا ہے پس سوار کے پاس سے گزرتا ہے اسکے تلوار کی نوک چھو دیتا ہے اور جسکو دیکھتا ہے اسکو مار دیتا ہے یا چوٹ لگا دیتا ہے یا منہ کے بل گرا دیتا ہے یا کہہ دیتا ہے کہ مر جائے دشمنِ خدا۔تو وہ مر جاتا ہے۔پس اسکے سامنے سے کوئی بچ کر نہیں جاتا''۔

بحرالمسجور

سورۂ طور۔اتا۶۔''والطورِ۔وکتٰبٍ مّسطورٍ۔فی رَقٍّ مّنشورٍ۔وَالبیتِ المعمورِ۔وَالسّقفِ المرفوعِ ۔وَالبحرِ المسجورِ''۔

قسم ہے طور کی۔اور لکھی ہوئی کتاب کی۔جو پھیلی ہوئی جھلی میں ہے۔اور بیت المعمور کی۔ اور بلند کی ہوئی چھت۔اور بھرے ہوئے سمندر کی۔

ان آیات میں اللہ نے پانچ چیزوں کی قسم کھائی ہے۔طور۔کتاب مسطور۔بیت

معمور۔ سقفِ مرفوع اور بحرِ مسجور۔ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جو قسم کھانے والے کو بہت پیاری ہو یا جسکی عظمت کا اظہار مقصود ہو۔ ہر عقل سمجھ سکتی ہے کہ اللہ پہاڑوں ۔گھروں ۔چھتوں اور سمندروں کی قسم نہیں کھا سکتا کہ یہ اسکی عظمت سے بعید ہے ۔ پھر یہ کون ہے جسکی قسم اللہ اتنے پیار سے کھا رہا ہے؟۔

یہاں طور (پہاڑ) استعارہ ہے مضبوطی اور قیومیت کا۔ کتاب مسطور سے مراد ظہورِ عین الوجود ہے۔ رقِ المنشور سے اشارہ ہے اسکی وسعت کی طرف ۔ بیت المعمور علامت ہے عزت وعظمت وجبروت کا۔ سقف المرفوع کا مطلب ہے انتہائی بلندی اور بحرِ مسجور نشانی ہے علم وقدرت وقوت کی ۔ یہ تمام خصوصیات کسی ایک ہستی میں جمع ہوگئی ہیں جس کی اللہ قسمیں کھا رہا ہے ۔ یہاں ہمارا مقصد تفسیر قرآن بیان کرنا نہیں ہے لیکن ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ سورۂ طور کی تلاوت کریں ۔آپ دیکھیں گے کہ بعد کی آیات میں اسی مقدس وجود سے دشمنی رکھنے والوں اور اسکی تکذیب کرنے والوں کے لئے شدید نذارت کی گئی ہے اور انھیں جہنم کی وعید دی گئی ہے۔ اور اس سے محبت رکھنے والوں کو خوشخبریاں دی گئی ہیں ۔

کون ہے یہ طور؟ ۔ یہ کتاب مسطور؟ ۔ یہ بیت المعمور؟ ۔ یہ سقف المرفوع اور یہ بحر المسجور؟۔

۱۔مفاتیح الجنان صفحہ ۷۹۹ ۔زیارتِ امیرٗ المومنین

''اے خدا کے امین! اے حجتِ خدا! اے اللہ کے ولی! آپؑ کی زیارت کی ہے آپؑ

کے غلام اور محبّ نے پناہ لیتے ہوئے اس قبر کی۔ یہ زیارت اس نے کی ہے جو آپؑ کے لئے سب کچھ چھوڑ آیا اور اللہ کے بعد آپؑ کو اپنے لئے کافی جانتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ بیشک آپؑ طور ہیں۔ کتابِ مسطور ہیں۔ رقِّ منشور ہیں اور علم کا بحرالمسجور ہیں''۔

پس ہم نے جان لیا کہ وہ کون ہے جسکی قسمیں اللہ اتنے پیارے کھاتا ہے لیکن کیوں نہ ہم یہ سب کچھ اسی کی زبان سے سنیں۔

نہج الاسرار جلد ۱۔ صفحہ ۱۵۸۔ حضرت امیرؑ المومنین خود ارشاد فرماتے ہیں۔ ''میں ہوں طور۔ میں ہوں کتابِ مسطور۔ میں ہوں بحرِ مسجور۔ میں ہوں بیت المعمور۔ میں ہوں نوروں کا نور''۔

یہاں ہم ضمنی طور پر اس فرمان کے آخری الفاظ یعنی ''نوروں کا نور'' کا بھی جائزہ لئے چلتے ہیں۔

ہم نے کشف العقائد میں نور کی تعریف بیان کی تھی جو ہم ایک بار پھر لکھتے ہیں تا کہ ''نوروں کا نور'' کا مطلب سمجھ میں آئے۔ نور کی تعریف ہے۔ ''نور وہ ہے جسکا وجود نفس الامر میں بالتحقیق ہو اور وہ اپنے وجود سے دوسروں کو بالتحقیق وجود میں لائے''۔ اور اس تعریف پر وہی پورا اتر سکتا ہے جو عینِ وجود ہو اور اسطرح سببِ وجود ہو۔ نقطۂ بائے بسم اللہ ہماری بات کا گواہ ہے کہ اصلِ وجود حضرت امیرؑ المومنین

کی ذاتِ گرامی ہے جس سے ''ب'' کو وجود ملتا ہے اور ''ب'' میں پورا قرآن ہے اور قرآن میں ہر وہ شے موجود ہے جو مخلوق ہے۔ پس یہ نقطہ ہی ہے جس نے عالمِ وجود کو وجود عطا فرمایا ہے۔ ''نوروں کا نور'' کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ نور جس نے باقی تمام انوار کو خلعتِ وجود بخشا ہے وہ نورِ علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے۔

حدیثِ ابو ذرؓ

حضرت ختمی مرتبتؐ نے جناب ابو ذرؓ سے ایک طویل حدیث بیان فرمائی ہے جسکے چند اقتباسات ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

تفسیرِ فرات صفحہ ۲۵۳ تا ۲۶۱۔

ا۔ ''علیؑ ہر امت میں حجتِ خدا ہیں''۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت امیرؑ المومنین حجتِ ناطق تو رسولؐ اللہ کے بعد ہوئے لیکن حقیقتاً آدمؑ سے لیکر قیامت تک ہر امت کے لئے علیؑ ہی حجت ہیں یعنی ہر امت اگرچہ اپنے اپنے نبی کے زیرِ فرمان رہی لیکن اسکی نجات اور ہلاکت کا دارومدار ولایتِ علیؑ پر ہی تھا اور آج بھی ہے۔ اسی لئے حضرت امیرؑ المومنین نے ارشاد فرمایا ہے۔ ''جتنی امتوں نے نجات پائی وہ میری وجہ سے اور جتنی امتیں ہلاک ہوئیں وہ بھی میری ہی وجہ سے''۔ امتیں تو رہیں ایک طرف۔ خود انبیاءؑ کی نجات کا دارومدار علیؑ کی ولایت پر ہے۔ ہم نے کشف العقائد میں حضرت یونسؑ کی مچھلی کا امام

زین العابدینؑ سے ایک مکالمہ نقل کیا تھا۔اسکا ایک جملہ ایک بار پھر سماعت فرمالیں تاکہ ہماری بات کی تصدیق ہوجائے۔مچھلی نے کہا۔''آقا! آدمؑ سے لے کر آپ کے نانا محمدؐ تک جتنے نبی گزرے ہیں ہر ایک پر آپ اہلِ بیتؑ کی ولایت پیش کی گئی۔انھوں نے ولایت کو قبول کیا اور نجات پائی۔اللہ نے یونسؑ کو وحی کی کہ امیرؑ المومنین اور آپ کے صلب سے پیدا ہونے والے ائمہؑ کو دوست رکھ۔یونسؑ نے عرض کیا کہ میں اسکو کیسے دوست رکھوں جسکو دیکھا نہیں ہے۔اللہ نے مجھے وحی کی کہ میں یونسؑ کو نگل لوں۔میں نے اسے نگل لیا۔جب آپ حضراتؑ کی ولایت کا اقرار کیا تو مجھے اللہ نے حکم دیا کہ میں اسے دریا کے کنارے پر پھینک دوں''۔(عمدۃ المطالب جلد ۲ صفحہ ۳۱۰)۔

۲۔''اے ابو ذرؓ! اللہ نے اپنے عرش کے ہر رکن کے لئے ستر ہزار فرشتے خلق کیے ہیں۔انکی تسبیح اور عبادت علیؑ کے لئے دعا کرنا اور آپ کے دشمنوں پر لعنت کرنا ہے''۔
یہاں سے تسبیح اور عبادت کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔فرشتوں کی عبادت سے بہتر کس کی عبادت ہوسکتی ہے اور فرشتے بھی وہ جو ارکانِ عرش پر معین ہیں۔پس عبادت کی معراج یہ ہے کہ انسان دل اور زبان دونوں سے علیؑ کے فضائل بیان کرتا رہے اور علیؑ کے دشمن پر لعنت کرتا رہے اور ایسا کرتے وقت اس بات کا لحاظ نہ کرے کہ دشمن کون ہے اور اسکی حیثیت کیا ہے۔جس کسی سے بھی علیؑ کی دشمنی ظاہر ہو اس پر لعنت کرنا ہی اعلیٰ ترین عبادت ہے۔

۳۔ ''اگر علیؑ نہ ہوتے تو حق باطل سے الگ نہ ہوتا۔ نہ مومن کافر سے جدا ہوتا۔ نہ خدا کی عبادت ہوتی۔ اگر علیؑ نہ ہوتے تو ثواب اور عذاب کا تصور بالکل نہ ہوتا''۔

یہ علیؑ کا احسان ہے حق پر بھی اور مومن پر بھی کہ اس نے انکو باطل سے اور کافر سے جدا کر کے ایک تمیز بخشی۔ علیؑ کا احسان ہے عبادت کرنے والوں پر کہ علیؑ نہ ہوتے تو پیشانیاں سجدوں سے محروم رہ جاتیں۔ علیؑ کا احسان ہے جنت اور جہنم پر کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو یہ دونوں ایک آسیب زدہ مکان کی طرح خالی پڑے اپنی تنہائی پر ماتم کرتے رہتے۔ علیؑ سے ہٹ کر حق کی تلاش کرنا یا باطل سے بچنا ایسا ہی ہے جیسے بغیر بینائی کے اشیاء کو دیکھنے کی کوشش کرنا۔ علیؑ وہ نور ہے جسکے بغیر پورے عالمِ وجود میں سوائے گھپ اندھیرے کے اور کچھ نہیں۔ اگر علیؑ نہ ہو تو کفر و ایمان کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ جو شخص علیؑ کو چھوڑ کر عبادت کرتا ہے وہ خدا کی عبادت نہیں کرتا بلکہ کسی اور کی عبادت کرتا ہے۔ ثواب اور عذاب کوئی شے ہیں ہی نہیں سوائے علیؑ کی محبت اور علیؑ کی دشمنی کے۔

۴۔ ''خدا کے سامنے اسکا کوئی پردہ اور حجاب نہیں ہے۔ وہ خود پردہ اور حجاب ہے''۔

حجاب پر ہم پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ علیؑ کا براہ راست تعلق ذاتِ خدا سے ہے اور اسی لئے آنجنابؑ نے فرمایا ہے۔ ''یا من دلّ علیٰ ذاتہٖ

بذاتہ ''۔یعنی اے وہ جو اپنی ذات پر دلیل لاتا ہے خود اپنی ذات سے۔

یہ جملہ کوئی اپنی زبان سے ادا کر ہی نہیں سکتا سوائے اسکے جسکی نظروں کے سامنے سوائے ذات کے اور کچھ موجود ہی نہ ہو۔یہی وہ مقدس وجود ہے کہ جس کسی کو بھی اللہ کی معرفت حاصل ہوئی یا اللہ کا کوئی فیض پہنچا تو وہ اسی کے ذریعے پہنچا۔یہی حجابِ خدا ہے۔یہی جامعِ صفاتِ خدا ہے۔یہی اسمِ خدا ہے۔یہی مظہرِ ذاتِ خدا ہے اور اسی وجہ سے ہر دور میں اس پر خدا ہونے کا گمان کیا گیا۔علیؑ کے بارے میں زبان کھولنے سے پیشتر ہزار مرتبہ سوچنا پڑتا ہے کیونکہ اس ذاتِ بلند و برتر تک پہنچنا تو ممکن ہے ہی نہیں البتہ اسکی شان میں ذرا سی تقصیر کا بھی براہ راست اثر توحید پر پڑتا ہے۔اللہ اللہ کرنے والوں کے لئے یہ مقامِ فکر ہے۔

۵۔''اللہ جسکو ہدایت دیتا ہے اسکو علیؑ کی ولایت کی معرفت دیتا ہے اور جسکے دل کو سکون نہیں دینا چاہتا اسکو علیؑ کی معرفت نہیں دیتا''۔

حضرت ختمی مرتبتؐ کے اس فرمان سے یہ راز کھل گیا کہ ''ہدایت'' کا مطلب معرفتِ ولایتِ علیؑ ہے لہذا قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ ہدایت استعمال ہوا ہے سمجھ لینا چاہئے کہ وہاں ولایتِ علیؑ کی معرفت مراد ہے۔یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نماز میں جب ہم ''اہدنا الصراط المستقیم'' کہکر ہدایت کی دعا مانگتے ہیں تو درحقیقت معرفتِ ولایتِ علیؑ ہی طلب کرتے ہیں۔ کوئی بد بخت ہی ہو گا جو اللہ سے مکر و فریب کھیلے اور ''اہدنا

الصراط المستقیم'' کہکر بھی شہادتِ ولایتِ علیؑ کو مبطلِ نماز جانے۔ لوگوں کو جان لینا چاہئے کہ اللہ نے مغفرت کا وعدہ صرف ان لوگوں سے کیا ہے جو معرفتِ ولایتِ علیؑ رکھتے ہوں یعنی ہدایت یافتہ ہوں۔ اگر کوئی علیؑ کی معرفت نہیں رکھتا تو وہ یقین کرلے کہ اسکے لئے توحید و نبوت و نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ بیکارِ محض چیزیں ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہے۔ اس آیت میں اللہ مغفرت کرنے کا وعدہ فرما رہا ہے لیکن اسکے لئے چند شرائط عائد کر رہا ہے جنکے پورے کئے جانے پر ہی مغفرت کا دارومدار ہے۔

طٰہٰ ۸۲۔ ''انّی لَغفّار'' لِمَن تابَ وَآمنَ وعَمِلَ صالحاً ثُمَّ اہتدیٰ''۔
یعنی ''میں اسکے لئے ضرور ضرور بڑا بخشنے والا ہوں''۔

(الف)۔ ''جس نے توبہ کی''۔ (توبہ کر لینے کے باوجود بھی اللہ کا وعدۂ مغفرت لازم نہیں ہوا)۔

(ب)۔ ''اور ایمان لایا''۔ (توبہ کر لینے اور ایمان لے آنے کے باوجود مغفرت کا استحقاق پیدا نہیں ہوا)۔

(ج)۔ ''اور نیک عمل کئے''۔ (توبہ کر لینے۔ ایمان لے آنے اور عملِ صالح کر لینے کے بعد بھی مغفرت کی کوئی ضمانت نہیں)۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ ان تینوں کے درمیان اللہ نے واوِ عطف استعمال کیا ہے یعنی اللہ نے ان تینوں چیزوں کو ایک ہی صنف میں شمار کیا ہے۔ لیکن چوتھی شرط

کے ساتھ واؤ عطف استعمال نہیں کیا بلکہ لفظِ ''ثُمّ'' استعمال فرمایا جسکا مطلب یہ ہے کہ پچھلی تینوں چیزوں کی حیثیت صرف مقدمے کی ہے اور اصل شرط یہ ہے جو ''ثُمّ'' کے ساتھ بیان کی گئی ہے یعنی پچھلی تین شرائط کا اصل مقصود چوتھی شرط کو پورا کرنا ہے۔

(د)۔ ''پھر ہدایت پائی''۔ ہدایت پانے کے بعد اب انسان اللہ کے وعدۂ مغفرت کا حقدار ہوگیا اور اللہ نے اپنے اوپر واجب کرلیا کہ ایسے بندے کو ضرور ضرور بخشے گا۔ ہدایت کے معنی آپ حضرت ختمی مرتبتؐ کی زبانِ اقدس سے سن چکے۔ تو اب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ نے مغفرت کا وعدہ صرف اس سے کیا ہے جو معرفتِ ولایتِ علیؑ رکھتا ہو۔ اور جو نہیں رکھتا اسکی مغفرت کی کوئی ضمانت نہیں۔

حضرت رسالت مآبؐ کے جملے کے دوسرے ٹکڑے پر بھی نظر کرنا ضروری ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں۔ ''اور (اللہ) جسکے دل کو سکون نہیں دینا چاہتا اسکو علیؑ کی معرفت نہیں دیتا''۔ آنحضرتؐ کا یہ جملہ بات کرنے سے نہیں بلکہ مشاہدہ کرنے سے سمجھ میں آئے گا۔ جو کوئی علیؑ سے گریزاں ہو اسکو آپ ہمیشہ بے چین اور مضطرب ہی پائیں گے۔ سکون ایسے شخص کے نصیب میں ہے ہی نہیں اور اسی بات کو قرآن نے اسطرح بیان فرمایا۔ ''الا بذکرِ اللہ تطمئنّ القلوب''۔ (آگاہ ہو جاؤ کہ دل اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان پاتے ہیں)۔

۲۔ ''علیؑ وہ کلمہ ہیں جسکو متقین نے گرہ باندھ لیا ہے''۔

یہاں حضرت ختمی مرتبتؐ نے سورۂ فتح کی آیت ۲۶ کا مفہوم بیان فرمایا ہے جہاں

ارشادِ خداوندی ہوتا ہے۔ ''پس اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنین پر تسکین اتار دی اور کلمۂ تقویٰ ان پر لازم کر دیا''۔ پس متقی وہ ہے جو کلمۂ ولایتِ علیؑ کو کسی لمحے بھی خود سے جدا نہ کرے۔ گرہ باندھ لینے کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ یہ گرہ کسی مقام پر بھی نہیں کھل سکتی چاہے وہ کلمہ ہو۔ اذان ہو۔ اقامت ہو یا نماز۔ اس گرہ سے گریز وہی کرتا ہے جسکا کوئی تعلق تقویٰ سے نہ ہو اور ایسے لوگوں کو جان لینا چاہئے کہ اللہ ہدایت متقین ہی کی کرتا ہے اور عمل صرف متقین ہی کا قبول کرتا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو آخرت کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہئے اور اپنا تمام وقت دنیاوی امور کے حصول میں صرف کرنا چاہئے جو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں۔

۷۔ ''پہلے آسمان سے لے کر ساتویں آسمان تک میں جہاں بھی گیا تو فرشتوں کے گروہ ہر آسمان پر میرے پاس آتے اور مجھے سلام کرتے۔ عرض کرتے کہ یا محمدؐ! ہماری ایک درخواست منظور فرمائیے۔ مجھے خیال ہوا کہ فرشتے اللہ تعالٰی سے شفاعت کا سوال کرتے ہیں کیونکہ اللہ نے مجھے حوضِ کوثر اور شفاعت کا اعزاز دے کر تمام انبیاءؑ پر فضیلت عطا کی ہے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب کے فرشتو! کیا درخواست ہے؟۔ انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبیؐ! جب آپؐ واپس زمین پر تشریف لے جائیں تو علیؑ کو ہمارا سلام کہنا اور آپؐ کو آگاہ کرنا کہ آپؐ کے شوق میں زمانہ بہت لمبا ہو گیا ہے''۔

فرشتوں سے کوئی کہہ دے کہ صرف تم ہی اس شوقِ دیدارِ وجہہِ خدا میں منفرد نہیں ہو۔اور بھی لوگ ہیں جنکی نگاہیں ہر روز کعبے سے نجف اور نجف سے کعبے کی راہ میں سرگردان رہتی ہیں کہ کبھی تو۔کہیں تو وہ رخِ زیبا نظر آ ہی جائے گا۔

نہیں ہیں صرف فرشتے ہی منتظر اسکے

علیؑ کی دید کے امیدوار ہم بھی ہیں

اللہ کا رنگ

رنگ وہ شے ہے جس سے اشیاء نظر آتی ہیں۔اس اعتبار سے اللہ کا رنگ وہی ہوسکتا ہے جس سے اللہ نظر آئے۔

بقرہ ۱۳۸۔''صِبغَةَ اللّٰهِ وَمَن اَحسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبغَةً وَ نَحنُ لَهُ عٰبِدُون''۔ترجمہ:۔رنگ تو اللہ کا ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہوسکتا ہے اور ہم تو اسی کے لئے عبادت کرنے والے ہیں۔

تفسیر فرات صفحہ ۷۲۔اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔''اس آیت میں صبغہ سے مراد عالمِ میثاق میں علیؑ ہیں''۔

اس بات پر تدبر کرنا لازم ہے کہ معصومؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ''اس آیت میں صبغہ سے مراد علیؑ ہیں'' بلکہ اسکو یومِ الست کے حوالے سے بیان فرمایا ہے یعنی یومِ الست جو نظر آیا تھا اور جس نے''الستُ بربکم'' کہا تھا وہی اللہ کا رنگ ہے۔حضرت امیرؑ المومنین

نہج الاسرار جلد ۱صفحہ ۱۲۸پر فرماتے ہیں۔ ''میں نے ہی قیومِ لایزال کے حکم سے انکے لئے الستُ بربکم کی ندا دی تھی''۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ میرے مولاؑ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ''کیا اللہ تمھارا رب نہیں ہے؟''۔ بلکہ یہ فرمایا تھا کہ ''الستُ بربکم''۔ یعنی کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟۔ دیکھنے والوں نے علیؑ ہی کو دیکھا اور سننے والوں نے علیؑ ہی کی آواز سنی اور جواب دینے والوں نے علیؑ ہی کو جواب دیا کہ ''ہاں ! تو ہی رب ہے''۔ جو کافر و منافق تھے وہ یہ اقرار بھول گئے اور آج جب انکے سامنے یہ سب کچھ بیان کیا جاتا ہے تو یہ مشرکینِ ازلی فوراً شرک کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ لیکن جو مومن ہیں وہ کبھی اپنا کیا ہوا اقرار نہیں بھولتے۔ وہ اللہ کے رنگ کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ اللہ کا رنگ کبھی انکی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ انھیں تو زمین و آسمان میں۔ ذرّوں میں اور صحراؤں میں۔ پھولوں میں اور پتوں میں۔ خشکی میں اور سمندروں میں اللہ کا رنگ نظر آتا ہے۔ ''کُلِ یومِ ہُوَ فی شان'' کا ظہور اللہ کے رنگ سے ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے مومن اپنے کئے ہوئے عہد کو کبھی نہیں بھولتا اور اسی لئے عارفِ کامل حضرت لعل شہباز قلندر نے فرمایا ہے۔

من بغیر از علیؑ ندانستم
علیؑ اللہ از ازل گفتم

میں نے علیؑ کے علاوہ کبھی بھی کسی اور کو جانا ہی نہیں۔ میں صرف علیؑ ہی کو جانتا ہوں

کیونکہ اسی کو میں نے دیکھا تھا۔اسی کی آواز میں نے سنی تھی اوراسی کو میں نے جواب دیا تھا کہ "ہاں!تو ہی ہے"۔ میں نے اپنا بیان نہیں بدلا۔جو بات میں نے اس روز کہی تھی وہی بات میں آج بھی کہتا ہوں کہ "ہاں!تو ہی ہے"۔

اللہ کا رنگ ہر شخص پر اسکے ظرف کی مناسبت سے اثر کرتا ہے۔کوئی تو وسعتِ کائنات میں پھیلے ہوئے اس رنگ کو دیکھتا ہے اور ایسے گزر جاتا ہے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔مگر کچھ ہیں جو اس رنگ کو دیکھ کر وجد میں آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے معبود! ہمیں اپنے رنگ میں رنگ لے۔

التوحید صفحہ ۸۸ حدیث ۱۵ میں حضرت ختمی مرتبتؐ کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جو ان پر اس وقت طاری ہوتی تھی جب وہ اللہ کے رنگ کو دیکھتے تھے۔

"راوی نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ "میں آپ پر فدا ہو جاؤں! وہ بیہوشی اور غشی جو رسولؐ پر نزولِ وحی کے وقت طاری ہوتی تھی وہ کیا تھی؟"۔ آپ نے فرمایا۔"وہ اس وقت طاری ہوتی تھی جب اللہ انکو اپنی تجلی دکھاتا تھا"۔

زیرِ نظر آیت فضیلتِ حضرت امیرؑ المومنین پر ایک محکم **دلیل** ہے کیونکہ خود خالقِ امکان فرما رہا ہے کہ میرے رنگ سے بہتر ہونا ممکن ہی نہیں۔ہم اس رنگ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک نادر حدیث آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تا کہ آپ کے دل کو سرور سے بھر دیں۔

التوحید صفحہ ۸۸ حدیث ۱۳۔ امام رضاؑ نے فرمایا۔

''بیشک اللہ کے نور سے بہتر سے بہتر سبز ہے۔ اور سبز ہی سے سرخ ہے۔ اور اس سرخ کا کیا کہنا!''۔

معصومؑ فضیلت بیان فرمارہے ہیں سبز کی لیکن تعریف کررہے ہیں سرخ کی۔ ہماری جانیں قربان ہوں اس سرخ پر!۔

تقدیم

قدیم اس شے کو کہتے ہیں جسکی نہ ابتداء ہو نہ انتہاء۔ یعنی جو قیدِ زمان و مکان سے باہر ہو اور جس کے لئے تب۔ کب۔ یہاں۔ وہاں اور کہاں جیسے الفاظ استعمال نہ کئے جاسکتے ہوں۔ ہم پہلے بھی عرض کرچکے ہیں کہ قدیم کا تعارف قدیم ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ حادث کبھی بھی قدیم کا تعارف نہیں کراسکتا۔ لہٰذا جس سے اللہ کا تعارف ہوتا ہو اسکا قدیم ہونا عقلاً واجب ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اللہ قدیم بالذات ہے اور یہ قدیم بالغیر اور اس بات کو علامہ حلی نے بھی اپنی کتاب ''احسن العقائد'' میں تسلیم کیا ہے۔

اس مقام پر ہم بطورِ خاص انتہائی اختصار کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کررہے ہیں لیکن آنے والے موضوعات میں بھی اسکا ذکر گاہے بگاہے آتا رہے گا جس سے ہماری

بات کی مزید تائید وتوثیق ہوگی۔یہ عنوان قائم کرنے کا مقصد تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ محض آپ کی توجہ مبذول کرانا ہے تاکہ آپ کو آئندہ اس لفظ سے اجنبیت محسوس نہ ہو۔

۱۔التوحید صفحہ ۱۰۶۔حدیث ۷۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔"اللہ اپنے بابرکت اسماء کے ساتھ اپنے علوِ حقیقت و ماہیت میں یکتا ہے"۔

اس فرمان سے اسماءِ خداوندی کی اللہ کے ساتھ معیت دائمی ثابت ہے۔پس کسی ایسے لمحے کا تصور نہیں کیا جا سکتا جب اللہ ہو اور اسکے اسماء نہ ہوں۔اسی لئے حضرت شمس تبریزؒ فرماتے ہیں

ایں کفر نہ باشد سخن کفر نہ این است

تا ہست علیؑ باشد و تا بود علیؑ بود

یعنی یہ ہرگز کفر نہیں ہے اور نہ ہی یہ کلمۂ کفر ہے کہ جب تک لفظ "ہے" موجود ہے تب تک علیؑ ہے اور جب سے لفظِ "تھا" موجود ہے تب سے علیؑ تھا۔

"ہے" اور "تھا" ایسے الفاظ ہیں جو قیدِ زمان کے اندر بھی ہیں اور اس سے خارج بھی ہیں۔جب ہم اللہ کے لئے کہتے ہیں کہ "وہ ہے" تو اس "ہے" سے کوئی زمانہ مراد بھی ہوتا ہے اور مراد نہیں بھی ہوتا۔یہی کیفیت لفظ "تھا" کی بھی ہے۔اسی بات کو حضرت امیرؑ المومنین نے یوں بیان فرمایا ہے۔"میں ہر زمانے کے ساتھ اور ہر زمانے سے پہلے تھا۔میں ہر دور کے ساتھ اور ہر دور سے پہلے تھا۔میں قلم کے

ساتھ تھا اور اس سے پہلے۔ میں لوحِ محفوظ کے ساتھ تھا اور اس سے پہلے۔ میں صاحبِ ازل ہوں''۔ (نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۱۴۶)

۲۔ التوحید صفحہ ۷۰ احدیث ۸ میں امام علی رضاؑ فرماتے ہیں۔ ''اس (اللہ) کا علم اسکی مشیت کے ساتھ ان اشیاء کے وجود سے پہلے تھا''۔ اشیاء سے مراد مخلوق ہے۔ پس سلسلۂ خلق جاری ہونے سے پہلے علیؑ کا وجود ثابت ہے۔

یہاں بھی اللہ کی ذات کے ساتھ اسکا علم اور اسکی مشیت بھی قدیم قرار پاتی ہے۔ اسکے علم و مشیت کے لئے لفظ ''ہے'' اور ''تھا'' علی الاطلاق ثابت ہیں۔

۳۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۴۴ پر حضرت امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''تمام اشیاء نقطے پر منتہی ہوتی ہیں اور نقطہ ذات پر دلالت کرتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو خداوندِ عالم کا فیضِ اوّل ہے''۔

اللہ کی ذات قدیم ہے اور یہ بات عقلی ہے کہ حادث کبھی بھی قدیم پر دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ حادث کے ذریعے جو بھی تصور ذہن میں آئے گا وہ حادث ہی ہوگا۔ قدیم ہرگز نہیں ہوگا۔ نقطہ چونکہ ذات پر دلیل ہے اس لئے اسکا قدیم ہونا لازم و واجب ہے اور نقطہ ہونے کا دعویٰ سوائے میرے مولا امیرؑ المومنین کے نہ کبھی کسی نے کیا ہے اور نہ کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جراءت ہوسکتی ہے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ شبِ معراج حضرت ختمی مرتبتؐ اللہ سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تھے تو یہ جہلاء کے تعصب اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ معراج کا مقصد ہی رسولؐ اللہ کو اللہ کے فیضِ اوّل سے متعارف

کرنا اور حقیقتِ علوی کا دیدار کرانا تھا جیسا کہ وہ فیضِ اوّل خود ارشاد فرماتا ہے۔ ''شبِ معراج ہمارے نبیؐ کے نقطۂ وجودیہ سے اطلاع پانے سے متعلق ہے''۔ (نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۳۷)۔

اس فیضِ اوّل کو لباسِ بشری میں دیکھ کر غلط نظریہ قائم نہیں کرنا چاہیئے۔ انکا لباسِ بشری میں آنا بذاتِ خود فیضِ خداوندی ہے۔ ورنہ انکی حقیقت ازلی و ابدی ہے۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۵۶ اپر حضرت امیرؑ المومنین اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''میں وہ زندہ ہوں جسکے لئے موت نہیں اور جب مرتا ہوں تو مرا نہیں۔ میں اللہ کا پوشیدہ اور مخزون راز ہوں''۔ ان مقدس ہستیوں کا ظاہر بظاہر آنا اور ان پر تغیرات واقع ہونا ہماری احتیاج پر دلیل ہے نہ کہ انکے نقص پر۔ یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم اس وقت تک اللہ کو نہ تو تسلیم کر سکتے ہیں اور نہ اسکی عبادت کر سکتے ہیں جب تک اسکا مشاہدہ نہ کرلیں۔ یہ ان پاک ہستیوں کی مجبوری نہیں ہے کہ وہ لباسِ بشری میں ضرور ہی آئیں۔ بشریت انکے لئے بمنزلۂ لباس ہے جسے جب چاہے پہنا جا سکتا ہے اور جب چاہے بدل دیا جاتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ یہی وہ مقام ہے جسکی عدم تفہیم کا لازمی نتیجہ شرک ہے خواہ وہ نظریۂ حلول کے ذریعے ہو یا اللہ کو مجسم مان کر ہو یا پھر اسے اپنی ذہنی مخلوق بنا کر اسے پوجنے کے ذریعے ہو۔ یہ مقدس وجود خواہ کتنے لباس کیوں نہ بدل لیں مگر انکی

حقیقت متغیر نہیں ہوتی کیونکہ وہ مظہرِ ذات ہیں۔

یہ بات اگرچہ عقلی ہے لیکن پھر بھی ہم اسکی توثیق کے لئے قولِ معصومؑ پیش کرتے ہیں تاکہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

التوحید صفحہ ۲۶۵ حدیث ۲۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''مخلوق کے اسماء میں تغیر ہوتا رہتا ہے لیکن اللہ کے اسماء میں کبھی تغیر نہیں ہوتا''۔

حادث وہی شے ہوتی ہے اور فنا اسی شے کا مقدر ہوتا ہے جس پر تغیر واقع ہوتا ہو۔ جو شے فنا ہونے والی نہ ہوتو اسکا فنا نہ ہونا ہی اس بات کی **دلیل** ہے کہ وہ تغیر سے منزہ ہے اور اس حقیقت کا خود ذاتِ باری تعالیٰ نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمادیا ہے اور سورۂ رحمٰن کی آیات ۲۶ اور ۲۷ اس کی محکم **دلیل** ہیں جہاں ارشاد ہوتا ہے۔ ''کُلُّ من علیہا فانٍ وَّیبقٰی وجہُ ربّک ذوالجلٰل و الاِکرام''۔ یعنی جو کچھ اس (زمین) پر ہے فنا ہوجانے والی ہے اور باقی رہے گا تیرے رب کا ذوالجلال والاکرام چہرہ۔

مالک المُلک

ہر شے کا مالک بلا شبہ اللہ ہے کیونکہ وہ ہر شے کا خالق ہے اور مخلوق اپنے خالق کی ملکیت ہوتی ہے۔لیکن یہ اللہ کی شان سے بعید ہے کہ وہ حادث و فانی اشیاء کا مالک ہونے پر فخر کرے۔وہ تو فخر کرتا ہے اپنی اس ملکیت پر جو ہمیشہ سے اس کے ساتھ ہے۔اللہ کبھی بھی بے **ملک** نہیں رہا۔وہ ہے ہی مالک المُلک لہذا وہ قدیم ہے تو اسکا **ملک** بھی قدیم ہے اور اپنی اسی ملکیت پر وہ فخر کرتا ہے۔اپنی اس ملکیت کو اس نے مختلف نام دیئے ہیں مثلاً مُلک ۔سلطان اور الحمد۔ہم ان تینوں چیزوں پر الگ الگ گفتگو کریں گے لیکن ابتداء کرتے ہیں ''مُلک'' سے۔

مُلک

یہ لفظ قرآن مجید میں تین مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ایک مُلک وہ ہے جو عارضی ہے اور ہر کس و ناکس کو مل جاتا ہے اور اس میں مومن و منافق اور کافر و مشرک کی کوئی قید نہیں ہے۔اس **ملک** کا مقصد کسی کو آزمانا یا کسی کی رسی دراز کرنا یعنی مہلت دینا ہوتا ہے تا کہ اسکے کفر و طغیان میں اضافہ ہو اور اسطرح وہ خود اپنے لئے شدید عذاب کا استحقاق پیدا کرے۔ظالموں کو بھی **ملک** مل جاتا ہے اور اسکا مقصد اس کے عذاب میں اضافہ اور ظالم کے ذریعے ظالم کو دفع کرنا ہوتا ہے۔

دوسرا **ملک** وہ ہے جو اللہ کے خلفاء کے لئے مخصوص ہے۔ یہ مُلک ظاہری بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی۔ ظاہری **ملک** غصب کیا جا سکتا ہے لیکن باطنی **ملک** کی طرف نگاہ اٹھانے کی کسی کو مجال نہیں اور ظاہری **ملک** بھی غصب ہو جانے کے باوجود خلیفۃ اللہ ہی کی ملکیت رہتا ہے اور وہ اس میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حکمتِ الٰہیہ کے تحت وہ خاموش رہے اس خاموشی کا مطلب بے بسی و مجبوری نہیں ہوتا بلکہ یہ آزمانا مقصود ہوتا ہے کہ کون ہے جو **ملک** کے اصل مالک کو پہچانتے ہوئے حکومت و ریاست سے دست کش رہتا ہے اور کون ہے جو مختلف حیلوں بہانوں سے حکومت پر قبضہ کر کے خود کو مالک و مختار سمجھنے لگتا ہے۔ فرعون ایک ہزار برس تک خدائی کا دعویٰ کرتا رہا لیکن اللہ خاموش رہا۔ وہ گھر جسے اللہ اپنا گھر کہتا ہے اس میں صدیوں تک تین سو ساٹھ بت حکومت کرتے رہے لیکن اللہ خاموش رہا۔ اس خاموشی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ (معاذ اللہ) اللہ بے بس و مجبور تھا بلکہ یہ اسکی حکمت تھی اور اسی حکمت کا اظہار اسکے خلفاء سے بھی ہوتا ہے۔

تیسرا ملک وہ ہے جو <u>اللہ کی ذات</u> کے لئے مخصوص ہے اور اس میں کسی اور کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے اس **ملک** کو کبھی اپنا نفس کہتا ہے۔ کبھی اپنی قدرت کہتا ہے۔ کبھی نصیر کہتا ہے۔ کبھی خبیر کہتا ہے۔ کبھی حکیم کہتا ہے۔ کبھی خالقِ کُل کہتا ہے اور کبھی ولی کہتا ہے۔ <u>اللہ کی یہی ملکیت ہے جو ماسوا اللہ کی مالک و حاکم ہے</u>۔ ہر مخلوق جسکے آگے سرِ تسلیم خم کیئے ہوئے ہے اور کائنات و ماوراءِ کائنات جسکا تابع فرمان

ہے۔اب ہم **ملک** کی ان اقسام کو قرآن مجید اور ارشاداتِ معصومینؑ کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

پہلی قسم

آلِ عمران ۲۶۔''(اے رسولؐ) کہدو کہ اے میرے اللہ۔**مُلک** کے مالک۔تو جسکو چاہتا ہے **مُلک** عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے **مُلک** چھین لیتا ہے اور تو جسکو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔تیرے ہاتھ ہی میں خیر ہے۔بیشک تو ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے''۔

اس آیت میں اس عارضی اور جزئی **ملک** کا ذکر کیا گیا ہے جو ہر کسی کو مل جاتا ہے اور یہی وہ **ملک** ہے جسکے بارے میں امام حسینؑ فرماتے ہیں۔''مومن وہ ہے جسے اس بات کی پروا نہ ہو کہ حکومت کس کے ہاتھ میں ہے''۔

تاریخ شاہد ہے کہ جن لوگوں کو ایسا **ملک** ملا ان میں سے بیشتر اس دنیا سے عزت و آبرو کے ساتھ نہیں گئے۔وہ آئے تو فرعون بن کر مگر گئے **ذلیل** ہو کر۔

دوسری قسم

مُلک کی دوسری قسم وہ ہے جو خلفاءِ اللہ کے لئے مخصوص ہے۔اسی لئے اس **مُلک** کو اللہ نے اپنی طرف بھی نسبت دی ہے اور یہ نسبت دے کر اپنے خلفاء کی منزلت بیان کی ہے تاکہ انکا تعارف ہو سکے اور انکی وسعتِ اقتدار کا اندازہ لگایا جا سکے۔

۱۔ انعام ۷۳۔ ''اور وہ (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن وہ کہے گا کہ 'ہو جا' (کُن) تو وہ ہو جائے گا۔ اسکا قول سچ ہے۔ جس دن صور پھونکا جائے گا اس دن مُلک اسی کا ہوگا۔ وہ غیب اور ظاہر کا جاننے والا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے''۔

۲۔ مومن ۱۶۔ ''جس دن وہ قبروں سے نکل کھڑے ہونگے انکی کوئی چیز اللہ پر پوشیدہ نہ ہوگی۔ (آواز دی جائے گی) آج کے دن مُلک کس کا ہے (جواب دیا جائے گا) خدائے واحد و قہار کا''۔

ان دونوں آیات میں اللہ نے اپنے خلیفہ کی سلطنت کی شان بیان کی ہے جس سے زندگانی دنیا میں حقِ حکومت غصب کرلیا گیا تھا۔ پہلی آیت کا تعلق قیامت سے اور دوسری کا رجعت سے ہے۔ اپنے خلیفہ کی حکومت کو اس نے اپنی حکومت قرار دیا اور ساتھ ساتھ اسکی کچھ صفات کو بھی بیان کیا اور پھر ان صفات کو بھی اپنی طرف منسوب کیا۔ ان باتوں کو پہلے ہی ثابت کیا جا چکا ہے لہٰذا انکا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کا خلیفہ جو مالک الملک ہے اس کی پہلی صفت اسکی خلاقیت ہے۔ دوسری صفت اسکا صدق ہے۔ اس صدق کے بارے میں اللہ نے سورۂ شعراء ۸۴ میں حضرت ابراہیم کی یہ دعا نقل فرمائی۔ ''اور میرے لئے آخری زمانے کے لوگوں میں لسانِ صدق (سچائی کی ایک زبان) مقرر کردے''۔ اس دعا کی قبولیت کا اعلان پروردگارِ عالم نے سورۂ

مریم کی آیت ۵۰ میں یوں فرمایا۔ ''اور انکو ہم نے اپنی رحمت سے کچھ حصہ بخشا اور ہم نے انکے لئے لسانِ صدق (سچائی کی ایک زبان) علیؑ ابن ابی طالبؑ کو قرار دیا''۔ (اس آیت میں صرف ونحو کی بحث تفسیر المتقین صفحہ ۴۰۰ پر موجود ہے جن صاحبان کو شوق ہو وہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں)۔ کیوں نہ آپ یہ جان کر اور بھی خوش ہوں کہ کتب انبیاءِ سلف میں جہاں میرے مولاؑ کے دیگر بہت سے نام ہیں وہاں ایک نام ''مَلِکِ صدق'' بھی ہے جسکے معنی ہیں ''سچائی کا بادشاہ''۔

تیسری صفت اسکا ''عالم الغیب والشہادۃ'' ہونا ہے۔ چوتھی صفت ''حکمت'' ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسکی ذاتِ والا صفات بذاتِ خود حکمت ہے۔ سورۂ جمعہ میں ارشادِ رب العزت ہوتا ہے۔ ''اللہ وہ ہے جس نے اُمیین میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے تھا۔ وہ ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے۔ انکا تزکیہ کرتا ہے اور انکو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔

تفسیرِ فرات صفحہ ۳۴۱ پر ابن عباس سے روایت ہے کہ ''یہاں کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولایت ہے''۔

پانچویں صفت ''خبیر'' ہے اور اس پر ہم پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں۔

۳۔ بقرہ ۱۰۷۔ ''کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کا مُلک بلا شبہ اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ کے سوا نہ تو تمھارا کوئی ولی ہے اور نہ نصیر''۔

۴۔توبہ ۱۱۶۔"یقیناً آسمانوں اور زمین کا مُلک اللہ ہی کے لئے ہے۔وہی زندہ رکھتا ہے وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا تمھارا نہ کوئی ولی ہے اور نہ نصیر"۔

ان دونوں آیات میں "مالک الملک" کا مطلب ولی۔نصیر۔محی اور ممیت بیان کیا گیا ہے۔

۵۔مائدہ ۱۷۔"اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ انکے درمیان ہے کا مُلک ہے۔وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے"۔

۶۔مُلک ۱۔"وہ (اللہ) بڑی برکت والا ہے جسکے ہاتھ میں مُلک ہے اور وہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے"۔

ان دو آیات میں اللہ نے مُلک کا مطلب قدرت بیان فرمایا ہے۔

۷۔شوریٰ ۴۹۔"اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کا مُلک ہے۔وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔وہ جس کے لئے چاہتا ہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جسکے لئے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے"۔

اس آیت میں یہ صراحت ہے کہ اولاد عطا کرنا مالک الملک ہی کا کام ہے۔

۸۔مائدہ ۱۸۔"وہ جسکو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسکو چاہے عذاب کر دیتا ہے۔جو کچھ آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ انکے درمیان ہے اللہ کا مُلک ہے اور اسی

کی طرف بازگشت ہے''۔

اس آیت میں مُلک کا مطلب دنیا و آخرت کا مالک ہونا ہے۔پس دنیا و آخرت کا **ملک** اللہ کے جس خلیفہ کی ملکیت ہے اسکے لئے وہ تمام صفات ثابت ہیں جو مندرجہ بالا آیات میں بیان ہوئی ہیں۔

تیسری قسم

یہ وہ مُلک ہے جو خالصتاً ذاتِ خدا کی ملکیت ہے جس میں اسکا کوئی شریک نہیں۔

فرقان ۲۔''وہ وہی ہے جسکے لئے آسمانوں اور زمین کا **ملک** ہے اور اس نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ **ملک** میں اسکا کوئی شریک ہوا''۔

یہ وہ مُلک ہے جسکا مالک ہونے پر اللہ فخر کرتا ہے اور یہی وہ **ملک** ہے جو قدیم ہے۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۹۲۔''سبحان ذی الملکِ الفاخرِ القدیم ''۔یعنی پاک ہے وہ ذات جو قابلِ فخر اور قدیم **ملک** کا مالک ہے۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۵۸۔'' اے اللہ میں سوال کرتا ہوں تیرے عزت والے چہرے۔تیرے عظیم اسم اور تیرے قدیم **ملک** کے واسطے سے''۔

پس معلوم ہوگیا کہ اللہ کا قدیم **ملک** وہی ہے جو اسکا چہرہ بھی ہے اور اسکا اسمِ اعظم بھی۔اپنے اسی چہرے۔اپنے اسی اسمِ اعظم اور اپنے اسی **ملک** کو اس نے سلطان بھی کہا اور الحمد بھی جنکا ذکر ہم باری باری کریں گے۔

سلطان

سلطان ایک ایسا لفظ ہے جسکا ترجمہ ہر مترجم اپنی مرضی اور اپنی پسند سے کرتا ہے حالانکہ اسکے لفظی معنی ہیں ''صاحبِ سلطنت'' یا ''حجتِ بالغہ''۔ ہم دیکھیں گے کہ جس صاحبِ سلطنت کو اللہ نے سلطان کہا ہے وہ کون ہے۔ یہ صاحبِ سلطنت وہ ہے جو ماسو اللہ کا حاکم و مالک اور اللہ کی ملکیت ہے اسکو اللہ نے کہیں ''سلطانِ مبین'' اور کہیں ''سلطان النصیر'' کہہ کر پکارا ہے۔

۱۔ نساء ۱۵۳۔ ''اور ہم نے موسیٰ کو سلطانِ مبین دیا''۔

۲۔ ہود ۹۶۔ ''اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور سلطانِ مبین دے کر بھیجا''۔

۳۔ مومنون ۴۵۔ ''پھر ہم نے موسیٰ اور اسکے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور سلطانِ مبین کے ساتھ فرعون اور اسکے ساتھیوں کیطرف بھیجا''۔

۴۔ قصص ۳۵۔ ''(اللہ نے) فرمایا ہم عنقریب تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط کریں گے اور تم دونوں کے لئے ایک سلطان قرار دیں گے''۔

۵۔ مومن ۲۳۔ ''اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو معجزوں اور سلطانِ مبین کے ساتھ بھیجا''۔

۶۔ دخان ۱۹۔ ''(موسیٰ نے کہا) اللہ پر سرکشی نہ کرو۔ یقیناً میں تمھارے پاس سلطانِ مبین لایا ہوں''۔

۷۔ زاریات ۳۸۔ ''اور موسیٰ (کے واقعے) میں (بھی ایک نشانی ہے) جب کہ ہم

نے اسے فرعون کی طرف سلطانِ مبین کے ساتھ بھیجا''۔

ہم نے سات آیاتِ قرآنی نقل کی ہیں جن میں کسی ''سلطانِ مبین'' کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ ساتوں آیات حضرت موسیٰ سے متعلق ہیں۔قرآن کا اس بات کو بار بار دہرانا کوئی نہ کوئی معنی ضرور رکھتا ہے اور قرآن کے ہر قاری کا فرض ہے کہ اس امر سے سرسری طور پر نہ گزرے جسکو قرآن مجید نے اتنی شدت سے بیان کیا ہے ورنہ بظاہر ایک ہی بات کی تکرار اور اتنی بار تکرار بے معنی ٹھہرے گی۔ہم رجوع کرتے ہیں علامہ سید ہاشم البحرانی کی مشہورِ زمانہ کتاب ''مدینۃ المعاجز'' (اردو) صفحہ ۹۳ کیطرف اور دیکھتے ہیں کہ یہ سلطانِ مبین کون ہے؟۔اس عبارت کی سرخی ہے۔''موسیٰ و ہاروںؑ کی مدد کرنے والا سلطان کون تھا؟''۔

''رجب برسی مشارق الانوار الیقین میں لکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ و ہاروںؑ کو حکم دیا کہ وہ فرعون کو جا کر تبلیغ کریں تو حکمِ الٰہی پا کر دونوں بھائی دربارِ فرعون کیطرف روانہ ہوئے اور دونوں دل ہی دل میں گھبرا رہے تھے کہ نہ جانے فرعون ہم سے کیا سلوک کر بیٹھے۔اتنے میں انھوں نے دیکھا کہ ایک سوار انکے آگے آیا جس نے زربفت کا لباس پہنا ہوا تھا اور اسکے ہاتھ میں سونے کی تلوار تھی۔اس نے ان سے کہا کہ تم دونوں بے خطر ہو کر میرے پیچھے چلے آؤ۔

اس سوار نے فرعون کے پاس پہنچ کر فرعون سے کہا۔''ان دونوں بزرگواروں کی اطاعت کرو ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا''۔فرعون یہ دھمکی سن کر گھبرا گیا اور پھر وہ شہسوار

اسکی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔فرعون نے حضرت موسیٰ و ہارونؑ سے کہا کہ تم کل میرے پاس آنا اور جو کچھ تمھیں مجھ سے کہنا ہو کہنا۔

جب موسیٰ و ہارونؑ وہاں سے چلے گئے تو فرعون نے اپنے دربانوں سے کہا۔ ''تم نے اس شہسوار کو میری اجازت کے بغیر کیوں آنے دیا تھا؟''۔دربانوں نے کہا۔ ''ہمیں آپ کی عزت کی قسم! ہم نے کسی شہسوار کو یہاں سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ہمارے سامنے سے تو صرف یہی دو بھائی گزر کر آپ کے پاس آئے ہیں''۔

وہ شہسوار مثالِ علیؑ تھا جسکے ذریعے سے اللہ نے انبیاءؑ کی چھپ کر تائید کرائی اور محمد مصطفیٰؐ کی کھلم کھلا تائید کرائی۔کیوں کہ علیؑ ہی اللہ کا وہ کلمۂ کبریٰ (کلمۂ تامہ) ہے جسے اللہ نے اپنے اولیاء کی مدد کے لئے مختلف ادوار میں مختلف صورتوں میں بھیجا اور علیؑ نے اولیاءِ الٰہی کی ہر دور میں مدد کی اور اسی کلمۂ کبریٰ کا واسطہ دیکر اولیاءِ الٰہی نے خدا سے دعائیں کیں۔اللہ نے ان کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور انھیں مشکلات سے نجات دی اور قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعے کیطرف اشارہ کیا گیا ہے۔ابن عباس نے کہا۔'' ان دونوں کے لئے وہ شہسوار آیتِ الکبریٰ اور سلطان تھا''۔مفسرین نے اس آیۂ مجیدہ کی تفسیر میں لکھا۔''یہ آیت اور سلطان علیؑ کی صورت تھی۔اسی طرح سے دوسرے انبیاءؑ کے لئے بھی علیؑ کی صورت آیت اللہ الکبریٰ بنتی رہی''۔

معلوم ہوگیا کہ سلطانِ مبین سے مراد ذاتِ حضرت امیرؑ المومنین

ہے۔ ہمارے نبیؐ کو مثیلِ موسیٰ کہا جاتا ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰ کے تذکرے میں اللہ نے بار بار سلطان کا ذکر کیا ہے لہٰذا لازم ہے کہ حضرت ختمی مرتبتؐ کو بھی یہی سلطان عطا کیا گیا ہو۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۰ میں ہم اس سلطان کا جلوہ ایک دوسرے رنگ میں دیکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا حال تو یہ تھا کہ جب کبھی وہ مشکل میں پڑتے تھے تو اللہ سلطان کو بھیج دیتا تھا مگر خاتم الانبیاءؐ کی شان ہی کچھ اور ہے انکے ساتھ تو یہ سلطان ہر لمحے ہر آن موجود رہتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اسے اللہ نے خود بہ خود نہیں بھیجا بلکہ مانگنے پر دیا بلکہ اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ وہ مانگیں۔

''اور (اے رسولؐ) کہو کہ میرے پروردگار مجھے داخل کر سچا داخل کرنا اور مجھے نکال سچا نکالنا اور میرے لئے اپنے انتہائی قرب سے ایک سلطانِ نصیر قرار دے''۔

یہی وہ سلطان ہے جو اللہ کی عظمت و جبروت ہے۔ اسی کے سامنے گردنیں خم ہوتی ہیں اور اسی کے وسیلے سے پیشانیاں سجدے گزارتی ہیں۔ یہی سلطان ہے جو اللہ کی ملکیت ہے۔ اللہ کا مُلک ہے اور اسی مُلک کی نسبت سے اللہ کو مالک الملک کہا جاتا ہے۔ یہی سلطان ہے جو قدیم ہے اور اللہ کی ازلی و ابدی حکومت ہے۔

۱۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۵۲۔ ''اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے اسمِ عظیم اور سلطانِ قدیم کے واسطے سے''۔

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۳۸۔ ''پروردگار میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے سلطان کے

ذریعے جو ہر شے سے بلند ہے''۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ علیؑ کہتے ہی اسکو ہیں جو ہر شے سے بلند ہو۔ اللہ نے علیؑ کا نام علی ویسے ہی نہیں رکھ دیا بلکہ اس لفظ کی پوری معنویت کے ساتھ رکھا ہے۔ علیؑ نے کبھی پستی دیکھی ہی نہیں۔ وہ ظاہر ہوا کعبے میں جسکا مطلب ہے بلند۔ اسکا جسمِ اطہر دفن ہوا نجف میں جسکا مطلب ہے بلند۔ علیؑ جب بھی نظر آئے گا بلند ہی نظر آئے گا چاہے وہ خانۂ کعبہ میں بت شکنی کا موقعہ ہو یا میدانِ غدیر۔

۳۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۵۶۔ ''پروردگار میں سوال کرتا ہوں تیرے سلطان کے واسطے سے جس کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ تیرے غلبے کی پہچان ہوتی ہے اور آسمانوں اور زمین میں اس سے تیری حمد ہوتی ہے''۔ (یعنی اس کو دیکھ کر تیری حمد کی جاتی ہے کیونکہ یہی سلطان ہے جو تیرا چہرہ۔ تیری آنکھ۔ تیرا کان۔ تیرا پہلو۔ تیری زبان اور تیرا ہاتھ ہے اور ہر وہ امر جس پر تیری حمد کی جاتی ہے اسی سے ظاہر ہوتا ہے)۔

دوسرا پہلو

اب ہم ''سلطان'' کو ایک اور زاویئے سے دیکھتے ہیں جہاں سورۂ رحمٰن کی آیت ۳۳ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم استطاعت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو پھر نکل جاؤ۔ لیکن تم نہیں نکل سکو گے مگر سلطان کی مدد

ہے‘‘۔

اس بات کی گواہ خود تاریخ ہے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے کوئی ایک وجود بھی نہیں نکل سکا سوائے ایک مقدس ہستی کے جس نے عالمِ امکان کی حدوں کو عبور کر کے دکھایا۔ تو کیا بغیر سلطان کی مدد کے یہ بات ممکن ہوگئی؟۔ جب نبی آکرم کا اس دنیا میں بغیر اس سلطان کے کام نہ چلتا ہو تو حدودِ امکان کو پامال کرنا کیونکر ممکن ہوسکتا تھا جب تک اس سلطان کی مدد شاملِ حال نہ ہو۔ بحر المعارف (عربی) صفحہ ۳۳۱ پر حضرت ختمی مرتبتؐ اس حقیقت کا اعتراف یوں فرماتے ہیں۔ ’’یا علیؑ !انّی محتاج الیک فی الدّنیا والاٰخرۃ‘‘۔ یعنی یا علیؑ میں تیرا محتاج ہوں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی‘‘۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ مرحلہ کسطرح طے ہوا۔

توحید العارفین من کلام المعصومین صفحہ ۱۵۶۔ حضرت ختمی مرتبتؐ نے معراج کے بارے میں فرمایا۔ ’’صرتُ من علیٍّ بعلیٍّ اِلیٰ علیٍّ‘‘۔ یعنی میں گیا علیؑ کیطرف سے۔ علیؑ کی مدد سے۔ علیؑ کیطرف۔

ایک اور حیرت کا ازالہ

ایک طویل عرصے سے ہم حضرت شمس تبریزؒ کا ایک شعر پڑھتے آئے تھے اور حیرت کرتے تھے مگر مندرجہ بالا حدیث پڑھ کر آخرکار یہ گتھی بھی سلجھ گئی۔ شمس تبریزؒ نے فرمایا تھا۔

ہم اوّل و ہم آخر و ہم ظاہر و باطن

ہم عابد و ہم مَعبَد و معبود علیؑ بود

دوسرے مصرعے میں عابد و معبود تو سمجھ میں آتا تھا کیونکہ خود میرے مولاؑ نے ارشاد فرمایا ہے۔ ''انا العابد والمعبود''۔ یعنی میں ہی عابد ہوں اور میں ہی معبود۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ شمس تبریزؒ نے لفظِ ''مَعبَد'' کسطرح استعمال کیا۔ مَعبَد کے معنی ہیں وہ مقام جہاں عبادت کی جائے۔ یعنی مسجد۔ سو یہ بات اب واضح ہوگئی۔

سورۂ بنی اسرئیل کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''سبحان ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے عبد کو رات کے ایک حصے میں مسجدِ حرام کی طرف سے مسجدِ اقصیٰ کیطرف جسکا ماحول (اردگرد) ہم نے مبارک بنایا تاکہ اس عبد کو اپنی کچھ آیات دکھائیں''۔

اس آیت میں اللہ فرمارہا ہے کہ میں اپنے بندے کو لے گیا مسجدِ حرام کیطرف سے۔ اور نبیؐ فرمارہے ہیں کہ میں گیا علیؑ کیطرف سے۔ اللہ فرمارہا ہے کہ میں لے گیا اپنے بندے کو مسجدِ اقصیٰ کی طرف۔ نبیؐ فرمارہے ہیں کہ میں گیا علیؑ کیطرف۔ اسکا صاف مفہوم یہ ہے کہ مسجدِ حرام بھی علیؑ ہیں اور مسجدِ اقصیٰ بھی علیؑ ہیں۔ اللہ نے مسجدِ اقصیٰ کے ماحول کو مبارک بنانے کا ذکر کیا ہے۔ سورۂ نمل کی آٹھویں آیت میں حضرت موسیٰؑ کے واقعے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ ''پس جب وہ

اسکے پاس آیا آواز دی گئی کہ جو آگ میں ہے اور جو اسکے اردگرد ہے برکت دیا گیا ہے"۔ پس علیؑ جہاں بھی ہونگے وہی مسجدِ اقصیٰ ہے کیونکہ خود انھوں نے ہی فرمایا ہے کہ "جو آگ میں تھا وہ میں ہی تھا"۔

ع

ہم عابد و ہم مَعبَد و معبود علیؑ بود

الحمد

ہم نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اللہ جس **ملک** کا مالک ہے وہ قدیم ہے کیونکہ ایسا کوئی وقفہ ممکن نہیں ہے جبکہ اللہ بے **ملک** رہا ہو اور اس بات کو ہم **ملک** اور سلطان کے ذیل میں ثابت کر آئے ہیں۔ اللہ کی اسی ملکیت کا ایک نام "الحمد" بھی ہے۔

الحمد میں جو "ال" داخل ہے اسکو مترجمین نے "ال جنسیہ" شمار کیا ہے اور اسکا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں"۔ یہ عظمتِ خدا سے ماحقہ واقف نہ ہونے کی **دلیل** ہے ورنہ یہ صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور اسکے مظاہر کی مکمل معرفت حاصل کرنا محالات سے ہے اور بغیر معرفت کے جو بھی تعریف کی جائے گی وہ ناقص ہوگی اور ناقص شے کو اللہ سے منسوب کرنا کسی طور صحیح نہیں ہوسکتا۔ لہذا یہاں "ال" کو معرفہ تسلیم کئے بنا کوئی چارہ نہیں۔ اسطرح الحمد کے معنی ہوئے "ایک خاص حمد"۔ اسی طرح لفظ "لِلّٰہ" کا مسئلہ ہے جسکا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ الحمد اللہ کے لئے ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر یہ ترجمہ درست ہے لیکن "لِلّٰہ" میں جو "لام" ہے وہ "لامِ ملکیت" ہے اور اسکا

حقیقی ترجمہ ہوگا کہ ''الحمد اللہ کی ملکیت ہے''۔پس یہ وہی ملکیت ہے جو اللہ کے لئے مخصوص ہے اور اس ملکیت میں اسکا کوئی شریک نہیں جسے اس نے کسی مقام پر ''مُلک'' اور کہیں ''سلطان'' کہا ہے اور اللہ کی اسی ملکیت میں کسی کو شریک کرنے کا نام شرک ہے۔اسی الحمد کے ذریعے اللہ کا شکر ادا کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ لفظِ الحمد عمومی طور پر تعریف کے لئے نہیں بلکہ شکر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔اصولِ کافی میں ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد باقرؑ کی سواری گم ہوگئی اور آپ کے کچھ اصحاب اسے ڈھونڈنے کے لئے گئے۔آپ نے باقی اصحاب کے سامنے فرمایا۔''اے اللہ اگر میری سواری مل گئی تو میں تیرا پورا پورا (مکمل) شکریہ ادا کروں گا''۔لوگ حیران تھے کہ اللہ کا مکمل شکر کیونکر ادا کیا جاسکتا ہے۔اتنے میں معلوم ہوا کہ سواری مل گئی ہے تو آپ نے فرمایا۔''الحمدِ للہ ربّ العالمین''۔لوگ انتظار میں تھے کہ دیکھیں امام کسطرح اللہ کا پورا پورا شکریہ ادا کرتے ہیں۔جب آپ سوار ہونے لگے تو بالآخر لوگوں سے نہ رہا گیا اور انھوں نے پوچھ ہی لیا کہ ''مولا! آپ تو فرما رہے تھے کہ میں اللہ کا پورا پورا شکریہ ادا کروں گا؟''۔آپ نے فرمایا۔''تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے الحمدِ للہ ربّ العالمین کہا۔یہی اللہ کا پورا پورا شکریہ ہے''۔ہمیں بھی حکم ہے کہ دن میں دس مرتبہ اور رات میں دس مرتبہ اگر الحمدِ للہ ربّ العالمین کہا جائے تو اس دن اور رات میں اللہ نے جتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان سب کا پورا پورا شکریہ ادا ہوجائے گا۔پس یہ اقرار کرنا کہ ''علیٰ اللہ کی وہ ملکیت ہے جس میں اسکا کوئی شریک نہیں'' اللہ کا پورا پورا شکر ہے اور

قیامت کے روز بھی مومنین یہی کہکر اللہ کا شکریہ ادا کریں گے کہ "الحمد ہے اللہ کے لئے جس نے ہم کو اِس کیطرف ہدایت کی اور اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت پا ہی نہیں سکتے تھے"۔ (اعراف ۴۳)۔ ذیل میں جو شواہد ہم پیش کریں گے ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ الحمد اللہ کا وہی **ملک** ہے جو قدیم ہے۔ جس میں کوئی شریک نہیں۔ جسکے ذریعے اس نے ہر شے کو خلق کیا۔ جو اسکا علم۔ اسکی قدرت اور اسکا تصرف ہے۔ جسکے ذریعے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ جسکے ذریعے اسکی عبادت اور تسبیح کی جاتی ہے۔ جسکا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ جس کسی نے بھی اللہ کی معرفت حاصل کی اسی سے کی۔

ا۔ بنی اسرائیل ۱۱۱۔ "اور کہدو کہ الحمد اللہ ہی کے لئے ہے جس نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ **ملک** میں اسکا کوئی شریک ہے"۔

۲۔ تغابن ا۔ "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کی تسبیح کرتا ہے۔ **ملک** اسی کے لئے ہے اور الحمد اسی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے"۔

سورۂ الحمد کے کئی نام ہیں۔ الحمد۔ فاتحہ۔ امّ الکتاب اور سبعِ مثانی۔ ہم دیکھیں گے کہ ان سب کا مصداق کون ہے۔

ا۔ نہج الاسرار جلد اصفحہ ۱۳۹۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ "میں ہی امّ الکتاب اور فاتحہ ہوں"۔

رعد ۳۹ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اللہ جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسکے پاس امّ الکتاب ہے''۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ جو کچھ خلق کرتا ہے۔ جو کچھ مٹاتا ہے اور جو کچھ باقی رکھتا ہے علیؑ ہی کے ذریعے کرتا ہے۔

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۶۹۱۔ زیارتِ امیرؑ المومنین کے چند جملے:۔

''جن کا ذکر اللہ نے اپنی محکم آیات میں کیا ہے۔ پس فرمایا خدائے تعالیٰ نے کہ بیشک وہ امّ الکتاب میں ہمارے نزدیک علی الحکیم ہے۔ سلام ہو علیؑ پر جو اللہ کا پسندیدہ اسم ہے''۔

۳۔ نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۴۸۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''ہم ہی وہ مثانی ہیں جنھیں خدا نے اپنے نبی کو عطا کیا ہے''۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ الحمد میرے مولا علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں تو اب ہم مفاتیح الجنان سے اسی الحمد کے بارے میں چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

ا۔ صفحہ ۶۴۔ ''الحمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے الحمد کو اپنے ذکر کی کلید بنایا''۔

الحمد کی کلید نقطۂ بائے بسم اللہ ہے اور ذکر اللہ بھی وہی ہے۔ پس علیؑ کی تعریف علیؑ ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ کسی اور ذریعے سے نہیں۔ اسی لئے آنجنابؑ نے خود ارشاد فرمایا۔ ''میں وہ معنی ہوں جس پر اسم واقع نہیں ہو سکتا''۔ اس فرمان کا مطلب ہی یہ

ہے کہ عالم کون ومکاں میں کوئی ایسا وجود ہے ہی نہیں جو علی کا تعارف کرا سکے۔

۲۔صفحہ ۴۸۔ ''پس ملک اسی کا ہے اور الحمد اسی کی ملکیت ہے۔وہی زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے۔وہی موت دیتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔وہ زندہ ہے اسے موت نہیں۔خیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

۳۔صفحہ ۴۶۷۔ ''الحمد ہے اس اللہ کے لئے جسکا کوئی شریک نہیں۔الحمد ہے اللہ کے لئے۔وہ الحمد جو اسکے عزت دار چہرے اور اسکے عزت وجلال کے لائق ہے''۔

۴۔صفحہ ۱۵۰۔دعائے عشرات۔یہ ایک طویل دعا ہے جسکے چند جملے ہم الگ الگ نقل کرر ہے ہیں:۔

(الف)۔''تیرے لئے الحمد ہے جسکا پہلا حصہ بلند ہوتا ہے اور آخری حصہ ختم ہونے والا نہیں''۔

(ب)۔''اے معبود الحمد تیرے ہی لئے ہے۔ایسی حمد کہ آسمان تیرے آگے اپنے شانے جھکا دے اور زمین اور جو کچھ اس پر ہے تیری تسبیح کرے''۔

(ج)۔''اے معبود الحمد تیرے ہی لئے ہے جو ہمیشہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔وہ نہ رکتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔وہ تیرے ہی لائق ہے اور تجھ ہی تک پہنچتی ہے اور وہ میرے دل میں۔میری زبان پر۔میرے سامنے۔میرے ساتھ۔مجھ سے پہلے میرے بعد۔میرے پہلو اور میرے اوپر اور میرے نیچے ہے جب میں مروں اور قبر میں یکہ و تنہا رہ جاؤں۔پھر خاک در خاک ہو جاؤں''۔

(د)۔ ''اور تیرے لئے الحمد ہے جب میں قبر میں اٹھ بیٹھوں اور کھڑا کیا جاؤں۔ اے میرے مولا اے میرے معبود الحمد اور شکر تیرے ہی لئے ہے تیرے تمام کمالِ اوصاف کے ساتھ۔ تیری سب ہی نعمات کے ساتھ۔ حتیٰ کہ الحمد وہاں پہنچے جہاں تو چاہتا ہے۔ جس میں تیری رضا ہے''۔

(قبر میں کون آئے گا یہ آپ سب جانتے ہیں اور اللہ کی تمام رضا کس کے پاس ہے اس سے بھی ہر شخص واقف ہے)۔

(ہ)۔ ''اے معبود الحمد تیرے ہی لئے ہے کہ تو مالکِ الحمد ہے۔ الحمد تیرے ہی لئے ہے کہ تجھ سے ابتداءِ الحمد ہے اور تجھ پر انتہاءِ الحمد ہے''۔

(و)۔ ''اے معبود الحمد تیرے ہی لئے ہے۔ ہمیشگی والی حمد تیرے دوام کے ساتھ۔ الحمد تیرے ہی لئے ہے کہ تو خریدارِ الحمد ہے (ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ نے کس کا نفس خریدا ہے)۔ اور الحمد تیرے ہی لئے ہے کہ تو نگہبانِ الحمد ہے۔ اور الحمد تیرے ہی لئے ہے۔ وہ الحمد جو قدیم ہے''۔

(ز)۔ ''اے معبود الحمد تیرے ہی لئے ہے رات میں جب وہ چھا جائے اور الحمد تیرے ہی لئے ہے دن میں جب وہ روشن ہو جائے''۔

(ح)۔ ''الحمد تیرے ہی لئے ہے دنیا و آخرت میں۔ وہ الحمد جو اے پروردگار تجھے پسند اور جس پر تو راضی ہے اور جیسی الحمد تیرے چہرے کی عزت اور جلالت کے

لائق ہے"۔

الفضیلہ

اب ہم اس کتاب کے اختتام کیطرف بڑھ رہے ہیں لیکن جس مُلکِ خدا۔سلطانِ خدا اورالحمدِ خدا کے حقائق ہم نے بیان کیے ہیں اسکے چند ضروری خصائص جب تک آپ تک نہ پہنچائے جائیں اس وقت تک ہماری بات نامکمل رہے گی۔ہم نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اپنے بیان کو اس نہج پر رکھیں کہ ہر سطحِ عقل اور ہر درجۂ ایمان اسکو سمجھ سکے اور قبول کر سکے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایمان ومعرفت کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔کوئی مومن ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے اور کوئی ادنیٰ درجے پر اور بقولِ معصومؑ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے باعثِ اذیت ہوتے ہیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی کوشش کی جائے اور بغیر سوچے سمجھے اعتراض نہ کیا جائے اور ہر اس بات کو سن کر جو مروّجہ عقائد سے بڑھ کر ہو حیرت و تذبذب میں گرفتار نہ ہوا جائے کیونکہ عالمِ امکان میں ایک بھی وجود یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے حضرت امیرؑ المومنین کی مکمل معرفت حاصل کر لی ہے۔اس صورت میں آنجنابؑ کی کسی بھی فضیلت کے بارے میں لب کشائی نہیں کی جاسکتی اور یہ اللہ کی قدرتِ قاہرہ ہے کہ آپؑ کی ہر فضیلت قرآن اور تواتراتِ احادیث سے ثابت ہوتی ہے۔ان حقائق کو آبائی عقائد کی بھینٹ ہرگز نہیں چڑھنا چاہیے۔

فضل کے معنی ہیں صفاتِ کمال میں کسی سے آگے بڑھ جانا۔ اس لفظ کو اللہ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر استعمال کیا ہے لہذا پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ اللہ نے اپنے فضل سے کیا مراد لیا ہے۔

عمدة المطالب جلد ا صفحہ ۶۲ ۴۔ "ولو فضل الله علیکم و رحمة " کی تفسیر میں ابن عباس سے منقول ہے کہ "فضل اللہ" سے مراد حضرت امیرؑ المومنین اور رحمت سے مراد جناب فاطمہؑ ہیں۔

جب یہ پتہ چل گیا کہ اللہ کا فضل حضرت امیرؑ المومنین ہیں تو پھر یہ بھی ماننا ضروری ہے کہ اللہ نے جس جس کو بھی فضیلت عطا فرمائی ہے وہ علیؑ ہی کے ذریعے۔ علیؑ ہی کیوجہ سے اور علیؑ کی معرفت کی مقدار کے مطابق عطا فرمائی ہے کیونکہ فضیلت اسی سے ملے گی جو مجسم فضل ہو۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ جب علیؑ کی فضیلت بیان کی جائے گی تو فضیلت پانے والے کے طور پر نہیں بلکہ فضیلت تقسیم کرنے والے کے طور پر اور علیؑ کی ہر فضیلت کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

ا۔ اکمال الدین بولایتِ امیرؑ المومنین صفحہ ۱۵۷ بحوالہ فرائد السمطین جلد ا۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ "اللہ کا میری رسالت پر راضی ہوجانا علیؑ کی ولایت کے باعث ہے"۔

۲۔ نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۹۰۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

''محمدؐ کی نبوت مکمل ہوئی میری وجہ سے''۔

۳۔کتاب سلیم بن قیس صفحہ ۲۷۵۔حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا۔''اللہ تعالیٰ ہدایت میں علیؑ کو ہر امت میں بطورِ حجت پیش کرتا رہا ہے۔اس میں نبی مرسل بھی شامل ہیں۔انکو اس بات کا گواہ بنایا تھا۔انکے لئے سب سے زیادہ درجہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علیؑ کی معرفت ہے''۔

۴۔نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۹۱۔حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

''اے سلمان! ہر پیغمبر نے ہمارے ہی سبب سے شرف حاصل کیا''۔

علیِؑ اعلیٰ۔علیِؑ اعظم۔علیِؑ اکبر۔علیِؑ اکرم

ا۔مفاتیح الجنان صفحہ ۳۰۰۔(دعائے رجبیہ)

''پروردگار میں سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے واسطے سے جو اعظم الاعظم الاعظم ہے اور جو تیرا ذکرِ اعلیٰ الاعلیٰ الاعلیٰ ہے۔پروردگار میں سوال کرتا ہوں اس تجلیِ اعظم کے واسطے سے جو آج کی رات اس بزرگ و برتر مہینے میں ظاہر ہوئی۔میں سوال کرتا ہوں اس ماہ (رجب) کے واسطے سے اور تیرے اس اسم کے واسطے سے جو اعظم الاعظم الاعظم اور اجل و اکرم ہے''۔

۲۔مفاتیح الجنان صفحہ ۲۶۴۔''میں سوال کرتا ہوں تجھ سے تیرے اس اسم کے واسطے

ہے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی ۔ کبیر بھی ہے اور اکبر بھی ‘‘۔

علیؑ کی تسبیح

سورۂ اعلیٰ ا۔’’ سَبِّحِ اسمَ رَبِّكَ الاعلیٰ ‘‘۔
ترجمہ:۔’’(اے رسولؐ) تو اپنے رب کے اس اسم کی تسبیح کرتا رہ جو اعلیٰ ہے‘‘۔
سورۂ واقعہ ۹۶۔’’فَسَبِّح بِاسمِ رَبِّكَ العظیم ‘‘۔
ترجمہ:۔’’پس (اے رسولؐ) تو اپنے رب کے اس اسم کی تسبیح کرتا رہ جو عظیم ہے‘‘۔

علیؑ کا ذکر

ا۔ دہر ۲۵۔۲۶۔’’اور (اے رسولؐ) تو اپنے رب کے اسم کا ذکر صبح و شام کرتا رہ اور رات کے کچھ حصے میں اسکے لئے سجدہ کرتا رہ اور طویل رات تک اسکی تسبیح کیا کر‘‘۔

انسان کی زندگی کے دو حصے ہوتے ہیں ۔ایک وہ جو وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ گزارتا ہے(Public Life) اور یہ صبح سے شام تک ہوتا ہے۔دوسرا حصہ وہ ہوتا ہے جو وہ نجی طور پر گزارتا ہے(Private Life) اور یہ رات کی تنہائی کا وقت ہوتا ہے۔اللہ نے اپنے نبیؐ کے لئے دونوں زندگیوں کا لائحۂ عمل طے کر دیا اور ہمیں یہ بتا دیا کہ نبیؐ کی ابتداء بھی علیؑ اور انتہاء بھی علیؑ ہیں ۔لہذا اس نبیؐ کا امتی ہونے کا دعویٰ وہی کرسکتا ہے جسکی صبح و شام کی ابتداء ’’یا علیؑ!‘‘ سے ہوتی ہو۔

۲۔مزمل ۸۔''اور (اے رسولؐ) تو اپنے رب کے اسم کا ذکر کیا کر اور سب سے الگ ہو کر اسی کا ہو جا''۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ لمحہ جو علیؑ کے بغیر گزارا جائے رائیگاں ہے اور ہر وہ عمل جس میں علیؑ نہ ہوں اکارت اور برباد ہے۔

یاعلیؑ مدد

یہ ایک طویل موضوع ہے جسکے لئے تفصیل درکار ہے۔دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر آخری سانس تک حضرت ختمی مرتبتؐ کا وظیفہ ہمیشہ ''یا علیؑ مدد'' رہا ہے۔بدر ہو یا احد۔خندق ہو یا خیبر۔تبوک ہو یا حنین۔ہمیں ہر مقام پر ''یا علیؑ ادرکنی فی سبیل اللہ'' ہی کی گونج سنائی دیتی ہے''۔

یہ تمام واقعات مومنین کے سنے اور پڑھے ہوئے ہیں اسلئے انکے اعادے کی ضرورت نہیں۔ہم صرف ابتداءِ نبوت اور انتہاءِ نبوت کے بارے میں عرض کرتے ہیں۔

۱۔علق ۱۔نبوت کی ابتداء اس وحی سے ہوئی جس میں ارشاد ہوا۔''اقـــراء بـــاســم ربك الـــذی خـلـق ''۔یعنی (اے رسولؐ) پڑھ اپنے رب کے اس اسم سے مدد مانگ کر جس نے خلق کیا۔

یہ ابتداء تھی جو ''یاعلیؑ مدد'' سے ہوئی اور اب ہم انتہاء پر نظر کرتے ہیں۔

۲۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۳۷۷۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ "علیؑ کو پانچ فضیلتیں ایسی عطا کی گئی ہیں کہ وہ میرے لئے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہیں ۔ان میں پہلی فضیلت یہ ہے کہ وہ مجھے اللہ عزوجل کے سامنے سہارا دیں گے"۔

قیامت کا امام

امامت وہ شے ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتی ۔دور کوئی بھی ہو مگر امام کا موجود ہونا اسکی بقاء کے لئے لازمی ہے۔ہم جس دور میں زندہ ہیں وہ اس زمین کا آخری دور ہے۔رجعت سے دورِ قیامت کی ابتداء ہوگی اور یومِ قیامت اسی دور کا حصہ ہے لہٰذا اس دورِ قیامت اور روزِ قیامت کے لئے بھی کسی نہ کسی امام کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔کوکب دری صفحہ ۱۸۶۔رسولؐ اللہ نے علیؑ کے بارے میں فرمایا۔

"یہ مرد قیامت کے روز میری امت پر اللہ کی حجت ہے"۔

۲۔کوکب دری صفحہ ۱۹۷۔رسولؐ اللہ نے علیؑ سے فرمایا۔

"قیامت کے موقف تیرے موقف ہیں اور تجھ سے متعلق ہیں"۔

۳۔ رسولؐ اللہ کی ایک حدیث ہے جو مناقب کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ہم اسے تفسیرِ فرات صفحہ ۳۵۵ سے اخذ کر رہے ہیں لیکن پہلے اس حدیث کا صرف ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں اسکے بعد انشاء اللہ پوری حدیث بیان کریں گے اور اسکی تائید ایک اور حدیث سے کریں گے۔

رسول اللہ نے فرمایا۔ ''علیؑ ابن ابی طالبؑ اسامی بیدہ لواء الحمد''۔
اسکا ترجمہ کرنے سے پیشتر ایک اشتباہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جو لفظِ ''امامی'' کے سلسلے میں پیدا کر دیا گیا ہے جسکی وجہ صرف یہ ہے کہ کسی بھی صورت سے فضیلتِ علیؑ پر پردہ ڈالا جائے اور یہ لوگوں کا محبوب مشغلہ ہے اسی لئے حضرت امیرؑ المومنین نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''ہمارا امر خود بھی مشکل ہے اور اسکا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ اسے برداشت نہیں کر سکتا مگر نبیِ مرسل۔ ملکِ مقرب یا وہ مومن جسکے دل کا امتحان ایمان کے ساتھ لیا جا چکا ہو''۔

''اِمامی'' کا مطلب ہے ''میرا امام''۔ اور اسطرح اس حدیث کا ترجمہ یہ بنتا ہے کہ ''علیؑ ابن ابی طالبؑ میرا امام۔ اسکے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا''۔

ایک محفل میں جہاں چند علماء بھی تشریف فرما تھے اسی حدیث کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میری زبان سے لفظِ ''اِمامی'' سن کر انکی رگِ علمیت پھڑکی اور وہ فوراً بولے۔ ''جناب یہاں یہ لفظ ''اِمامی'' نہیں بلکہ ''اَمامی'' ہے جسکا مطلب ہے ''آگے چلنے والا''۔ میں نے عرض کیا کہ ''قبلہ! امام کہاں ہوتا ہے؟۔ آگے یا پیچھے؟''۔ کہنے لگے کہ ''آگے''۔ میں نے عرض کیا کہ ''پھر اس زیر زبر کے الٹ پھیر سے آپکو کیا حاصل ہوا؟''۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ایک معمولی امامِ جماعت سے آگے کوئی نہیں بڑھ سکتا پھر کون ہے جو امام مبین سے آگے بڑھ سکے؟۔ اس گفتگو سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ زبان سے علیؑ علیؑ کرنے والے علیؑ کیطرف سے کتنے کٹے کٹے رہتے

ہیں کہ آنجنابؑ کی کوئی بھی فضیلت سن کر انکے کان فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔علیؑ ہے ہی ایسی چیز کہ دشمنوں کو بھی اسکے مقابلے کے لئے کوئی نہ ملا اور مجبوراً انھیں علیؑ سے مقابلے کے لئے اللہ کو لانا پڑا اسی لئے وہ دیواروں سے ''یا علیؑ مدد'' مٹا کر ''یا اللہ مدد'' لکھتے پھرتے ہیں۔بہر حال اب آپ پوری حدیث سنئے جسکے بعد ہم ایک اور حدیث سے اسکی تائیدو توثیق کریں گے۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔''علیؑ ابن ابی طالبؑ میرا امام۔اسکے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا۔(لواء الحمد کا مطلب ہے کہ الحمد کا جھنڈا۔پس جو کوئی ''الحمد'' ہے یہ اسی کا علم ہوگا)۔قیامت کے روز علیؑ میرے آگے ہونگے۔آپؑ کے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا جسکے دو پھریرے ہونگے۔ایک سبز ریشم کا اور دوسرا سفید کا''۔یہ سن کر ایک اعرابی کھڑا ہوگیا۔کہنے لگا۔''علیؑ کے بارے میں آپؐ جو کہتے ہیں اس میں بہت اختلاف ہوگا''۔رسولؐ اللہ مسکرا رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔فرمایا۔''اے اعرابی! اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔علیؑ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو میرے سر کو میرے بدن سے''۔(اور سر ہمیشہ بدن سے آگے ہوتا ہے)۔

کوکب دری صفحہ ۱۳۳ بحوالہ مناقب ابن مردویہ۔

جابرؓ ابن عبد اللہ انصاری سے روایت ہے کہ ''خدائے عز و جل کا ایک لواء نور کا ہے اور ایک عمود یاقوت کا ہے جس پر لکھا ہے۔''اللہ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور محمدؐ کی آل تمام مخلوقات سے بہتر ہے اور راس علم کا مالک اور قیامت

کا امام علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے"۔

سر اور بدن

سر جسم کا اشرف ترین حصہ ہے۔حواسِ خمسہ میں سے چار حواس سر میں ہوتے ہیں ۔انسان کی پہچان چہرے سے ہوتی ہے جو سر میں ہے۔سر بلندی اور عظمت کا استعارہ ہے اسی لئے کسی قوم کے لیڈر اور سب سے زیادہ باعزت شخص کو سردار کہتے ہیں جسکی اطاعت پوری قوم پر واجب ہوتی ہے۔بدن گردن کے نچلے حصے سے پاؤں تک کے حصے کو کہتے ہیں اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ بدن کے وجود کا مکمل دارومدار سر پر ہوتا ہے۔انسان اس وقت تک مقبولِ ربّ العزت نہیں ہوسکتا جب تک اسکا سر بارگاہِ خداوندی میں نہ جھکے۔یہ تمام باتیں اگر آپ کے اذہان میں محفوظ ہوچکیں تو ہم اس حدیث کیطرف رجوع کرتے ہیں جو ہم نے تفسیرِ فرات صفحہ ۳۵۵ سے نقل کی تھی جس میں حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا۔

"علیؑ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو میرے سر کو میرے بدن سے"۔

یہ حدیث مناقب کی ہر کتاب میں ملتی ہے۔اور سنی شیعہ کوئی بھی اسکا انکار نہیں کرسکتا۔

علیؑ وہ مقدس وجود ہے کہ اللہ و رسولؐ دونوں ہی اسکے طلب گار ہیں۔اللہ کہتا ہے کہ علیؑ میرا نفس ہے۔رسولؐ فرماتے ہیں کہ میرا نفس ہے۔اللہ کہتا ہے کہ علیؑ میرا چہرہ ہے اور ظاہر ہے کہ چہرہ سر ہی میں ہوتا ہے۔رسولؐ فرماتے ہیں کہ علیؑ میرا سر ہے

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر علیؑ نہ ہوتو توحید و نبوت دو بے معنی الفاظ بن کر رہ جاتے ہیں۔اسی لئے اللہ کو اپنی الوہیت اور نبیؐ کو اپنی نبوت کے اظہار کے لئے علیؑ چاہئے۔

اللہ اور اسکے رسولؐ کے دعوے تو آپ نے سن لئے۔اب ذرا اسکی بات بھی سن لیں جسکو یہ دونوں اپنا سر کہتے ہیں۔

نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۲۷۹۔حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

''سب سے زیادہ بدصورت چیز بدن بے سر ہے''۔

اتنا تو آپ نے جان لیا کہ علیؑ راسِ نبوت و رسالت ہے۔اب اس سے آگے بھی تھوڑا سا سفر طے کر لیں۔سر بدن کے لئے شرطِ وجود اور باعثِ زینت ہوتا ہے۔لیکن ایک اور چیز بھی ہوتی ہے جو خود سر کے لئے باعثِ زینت ہوتی ہے اور وہ ہے'' تاج''۔کمال کی بات یہ ہے کہ سر بھی علیؑ ہے اور تاج بھی خود علیؑ ہی ہے۔

ا۔مفاتیح الجنان صفحہ ۶۹۳۔''اے معبود رحمت فرما مومنوں کے امیرؑ پر جو تیرے مرتضیٰ بندے۔تیرے پکے امانتدار۔تیری مضبوط رسی۔تیرا بلند ہاتھ۔تیرا اعلیٰ پہلو اور اولیاء کے ستون اور رسولؐ اللہ کے سر کا تاج ہیں''۔

۲۔مفاتیح الجنان صفحہ ۴۴۷۔(زیارتِ امیرؑ المومنین)

''اولیاء کا مرکز۔تیرے نبیؐ کا بھائی۔انکے غموں اور پریشانیوں کو دور کرنے والا اور

انکے سر کا تاج اور انکی کامیابی کی کلید"۔

علیؑ علیؑ ہے

۱۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۱۶۱۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

"میں سب سے بڑے فخر کرنے والے پر بھی فضیلت رکھتا ہوں۔ میں شدید القوی ہوں"۔

اس عظیم الشان جملے اور خاص طور پر اسکے آخری ٹکڑے یعنی "شدید القوی" پر ایک طویل گفتگو کی جا سکتی ہے مگر یہ گفتگو ہمیں کسی اور کوچے میں لے جائے گی جہاں ایک بورڈ لگا ہوا ہے کہ "اس کوچے میں وہی داخل ہو سکتا ہے جو پہاڑ جیسا کلیجہ رکھتا ہو"۔ پس جو لوگ ایسا دل گردہ رکھتے ہوں وہ سورۂ نجم کی تلاوت فرمائیں اور اللہ کی مدد و توفیق سے گلشنِ معرفت کی سیر کریں۔ رہے وہ حضرات جو اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہوں انکے لئے باہر ہی ٹھہرے رہنا مناسب ہے۔ ع

جسکو ہوں دین و جاں عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۰۷۔ (زیارت امیرؑ المومنین)

"پس خدا کی۔ اسکے فرشتوں کی اور اسکے رسولوں کی لعنت برستی رہے اس پر جس نے آپ کی فضیلت کو چھپایا اور آپ کے حق کا منکر ہوا یا اسے آپ کے برابر لایا کہ جس پر خدا نے آپ کو اسکے نفس سے زیادہ اختیار دیا"۔

۳۔عمدۃ المطالب جلد ۱صفحہ۵۳۴۔رسول اللہ نے فرمایا کہ آیت ''جولوگ ایمان لائے اورعملِ صالح بجالائے وہ تمام لوگوں سے افضل ہیں'' سے مراد یہ ہے کہ علیؑ تمام کائنات سے افضل ہے''۔

ان امور میں کسی قسم کا شک یا تردّد نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ہر شخص بلا استثناء اس بات کا قائل ہے کہ علیؑ نفس اللہ ہیں اور معصومؑ کی تائید اس پر سند ہے جیسا کہ عمدۃ المطالب جلد ۱صفحہ۵۳۵پر آیت ''ویحذر کم اللہ نفسہ ''(اور اللہ تمھیں اپنے نفس سے ڈراتا ہے) کی تفسیر میں مجاہد اور ابن عباس سے روایت ہے کہ ''نفس اللہ سے مراد علیؑ ہیں''۔اور امام رضاؑ نے فرمایا کہ ''علیؑ کے ذریعے اللہ نے لوگوں کو ڈرایا''۔پس جب آنجنابؑ نفس اللہ ہیں تو آپؑ پر کسی کو فوقیت دینا گویا اللہ پر فوقیت دینا ہے اور بطورِ نفسِ خدا علیؑ ہر شے کا مالک ومختار اور ہر نفس پر متصرف علی الاطلاق ہے۔

۴۔مدینۃ المعاجز جلد ۱صفحہ۱۰۳۔۱۰۴۔

''رسول اللہ نماز پڑھا رہے تھے۔نماز کے بعد آپؐ نے صفوں پر نظر کی اور آخری صف میں بیٹھے ہوئے حضرت علیؑ پر نظر فرمائی اور کہا۔''علیؑ ! آج تم نے دیر کیوں کی اور پہلی صف میں کیوں شامل نہ ہوئے ؟''۔آپؑ نے عرض کیا۔''یا رسول اللہ مجھے تجدیدِ وضو کی احتیاج تھی اور میں وضو کی غرض سے اپنے گھر گیا تھا''۔رسول اللہ نے فرمایا۔''علیؑ !اس ذات کی قسم جسکے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے جب تک تم نماز میں شامل نہیں ہوئے اسوقت تک اسرافیل رکوع میں میرے گھٹنے کو تھامے رہے اور

رکوع سے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ کیا اس فضیلت کے باوجود بھی تیری محبت کیوجہ سے لوگ مجھے ملامت کرتے ہیں؟"۔

یہ فضیلت ہم نے علیؑ کے گھر میں ہی دیکھی کہ انکے بیٹے کے لئے رسولؐ سجدے سے سر نہ اٹھا سکے اور خود علیؑ کے لئے رکوع سے نہ اٹھ سکے۔ جب نبیؐ تک کی نماز تحتِ مشیتِ علیؑ و حسینؑ ہے تو ہم ایسے کونسے اللہ کے خاص مقرب بندے ہو گئے کہ بغیر علیؑ و حسینؑ کے ہی ہماری نماز مقبولِ بارگاہِ خداوندی ہو جائے؟۔ اس حدیث سے ایک بات ظاہر ہوگئی کہ سجدہ مخصوص ہے حسینؑ سے اور رکوع مخصوص ہے علیؑ سے۔

امیرؑ المومنین

اس لفظ کی عظمت کو وہی لوگ جانتے ہیں جو اسکا مطلب سمجھتے ہیں۔ کتنا شیریں ہے یہ لفظ کہ جیسے ہی یہ لبوں پر جاری ہوتا ہے تو سانسوں میں محبت کی مٹھاس گھلنے لگتی ہے اور دل کی دھڑکنیں حورانِ بہشت کی سرگوشیوں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں۔ اس لفظ میں اتنی کشش ہے کہ چوروں کی نگاہیں اس پر جم گئیں اور جہاں آنجنابؑ کے دیگر القابات غصب ہوئے وہیں یہ لقب بھی غاصبین کی دست برد سے محفوظ نہ رہا۔ لیکن یہ لقب غصب کر کے لوگوں نے اپنے لئے ایک سند حاصل کر لی جسکا ذکر آنے والی احادیث میں آئے گا۔ آج کل یہ طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ لوگوں کو انکے لیبل سے پہچانا اور

پکارا جاتا ہے نہ کہ انکے عقیدے سے۔اس لئے یہ شناخت کرنا کہ کون حقیقت میں کون ہے بہت مشکل ہوگیا ہے۔ایک دن ٹی وی کے ویڈیو چینل پر ایک علامہ صاحب کی تقریر آرہی تھی۔یہ وہی علامہ ہیں جنکا ذکر ہم نے کشف المسائل میں بھی کیا ہے اور اس کتاب میں بھی انکا ذکرِ خیر آچکا ہے مگر اس تقریر میں تو انھوں نے غضب ہی کردیا۔یہ پہلی مرتبہ سنا گیا کہ کسی شیعہ مولوی نے علیؑ کے لئے لفظ ''امیرُ المومنین'' کو ناجائز قرار دیا ہو۔ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ایسے شیاطین سے اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ مذہب شیعہ اور شیعہ قوم کو ایسے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے۔آمین۔

نکتہ انھوں نے یہ اٹھایا کہ چونکہ اللہ کا ایک نام مومن بھی ہے اس لئے وہ مومنین میں شامل ہے۔پس بقول انکے جس کسی کو بھی امیر المومنین کہا جائے گا وہ اللہ کا بھی امیر ہوگا۔نعوذباللہ من ذالک

علامہ صاحب کو چاہئے کہ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہیں۔ایسا نہ ہو کہ دو منٹ بعد وہ اپنی بات سے مکر جائیں۔چلئے بسم اللہ۔کھولئے قرآن کیونکہ اسی قرآن میں اللہ نے خود کو مومن کہا ہے۔قرآن میں مومنوں کو حکم ہے نماز پڑھنے کا۔روزہ رکھنے کا۔زکوۃ دینے کا اور حج و جہاد کرنے کا۔پس چونکہ خود اللہ بھی مومن ہے اس لئے (معاذ اللہ) اس پر بھی از روئے قرآن یہ تمام چیزیں واجب ٹھہریں گی۔قرآن میں اکثر مقامات پر مومنین کے لئے تنبیہات وارد ہوئی ہیں تو چونکہ اللہ خود بھی مومن ہے تو (معاذ اللہ) یہ

تنبیہات اسکی طرف بھی راجع ہونگی۔علامہ صاحب کو حیا کرنا چاہئے اور اپنی جہالت اور نفاق پر ماتم کرنا چاہئے۔جو نغمہ وہ الاپ رہے ہیں اس سے علیؑ کا کچھ نہیں بگڑتا البتہ عمارتِ توحید ضرور منہدم ہو جاتی ہے۔وہ اشتراکِ لفظی کو بنیاد بنا کر اشتراکِ معنی کا حکم لگا رہے ہیں جبکہ توحید کا پہلا اصول ہی یہ ہے کہ اللہ کے لئے تشبیہ جائز نہیں ہے۔معصومؑ سے کسی نے پوچھا کہ کیا اللہ ''شے'' ہے؟۔آپؑ نے فرمایا۔''ہاں! بشرطیکہ اسے دو حدوں سے نکال دو۔حدِ تشبیہ اور حدِ تعطیل''۔لیکن علامہ صاحب اشتراکِ لفظی کی بنا پر اللہ کو اسکی مخلوق سے تشبیہ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔علیؑ سے دشمنی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ پہلے عقل جاتی ہے اور پھر توحید رخصت ہوتی ہے۔

خالق و مخلوق ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ان میں نہ کوئی مشابہت ہوسکتی ہے اور نہ کوئی اشتراک۔لفظ اگر چہ ایک ہی ہو لیکن جب وہ مخلوق کی طرف راجع ہوگا تو اسکے معنی کچھ اور ہونگے اور جب وہ خالق سے منسوب ہوگا تو اسکے معنی کچھ اور ہونگے۔اصولِ کافی کتابِ توحید میں امام رضاؑ کا ایک طویل خطبہ موجود ہے جس میں آپؑ نے ایسے ہی الفاظ کی وضاحت فرمائی ہے جو خالق و مخلوق دونوں کے لئے بولے جاتے ہیں۔ہمارا مقصد اپنے بیان کو طول دینا نہیں ہے بلکہ فقط معاملے کی تفہیم ہے اس لئے ہم صرف ایک لفظ پر اکتفا کرتے ہیں تا کہ بات واضح ہو جائے اور وہ لفظ ہے ''حیّ''۔جسکے معنی ہیں ''زندہ''۔یہ لفظ ہر جاندار شے کے لئے بولا جاتا ہے اور یہی لفظ

اللہ نے خود اپنے لئے بھی استعمال فرمایا ہے۔لیکن جب یہ لفظ مخلوق کے لئے بولا جائے گا تو اسکے معنی ہونگے ''وہ جسکو زندگی دی گئی ہے''۔اور جب یہی لفظ خالق کے لئے بولا جائے گا تو ''خالقِ حیات'' کے معنی میں بولا جائے گا کیونکہ خود اس نے ہی فرمایا ہے۔ ''خلق الموت والحیات''۔اور جس شے کو اس نے خلق کیا ہو وہ اس پر طاری نہیں ہو سکتی۔یہی حال لفظِ مومن کا بھی ہے۔جب یہ مخلوق کے لئے استعمال ہو گا تو اس کے معنی ہونگے ''امان پانے والا''۔اور جب خالق کے لئے بولا جائے گا تو اسکے معنی ہونگے ''امان دینے والا''۔اب یہ بات کہ اللہ نے اپنا نام مومن کیوں رکھا تو اسکا جواب رسولؐ اللہ نے خود ہی دے دیا ہے۔رسولؐ اللہ نے علیؑ کی محبت کو مشروط کیا ہے مومن ہونے سے اور فرمایا ہے۔'' اے علیؑ ! تجھ سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن''۔اب کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر علیؑ سے محبت کرتا ہو۔جب وہ متقین سے محبت کرتا ہے تو امام المتقین سے کتنی محبت کرتا ہوگا؟۔جب وہ پاکیزہ لوگوں سے محبت کرتا ہے تو مالکِ تطہیر سے کتنی محبت کرتا ہوگا؟۔اس نے اس لئے اپنا نام مومن رکھا تا کہ محبتِ علیؑ کی شرط پوری ہو جائے اور اسکے رسولِ صادقؐ پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔یہی سبب ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔'' اللہ نے اپنا نام مومن اس لئے رکھا ہے تا کہ علیؑ کے اکرام کو ظاہر کرے''۔

اس لفظ کی عظمت و اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ہم چند سوالات قائم کرتے ہیں تا کہ اس لفظ کا مکمل مفہوم ذہنوں تک پہنچ جائے۔کیونکہ ہمارے معاشرے میں

القابات تقسیم کرنے کا رواج عام ہے اور رفتہ رفتہ ایک ایسی ذہنیت پیدا ہوگئی ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ جیسے غیر معصوم لوگوں کے لئے بطورِ احترام مختلف القاب استعمال کئے جاتے ہیں ویسے ہی (معاذ اللہ) معصومؑ کے لئے بھی ہم احتراماً مختلف القاب استعمال کرتے ہیں جنکے حقیقی معنی کچھ نہیں ہوتے۔ مقصد فقط احترام اور تعظیم ہوتا ہے۔ اس غلط فہمی کو اب رفع ہو جانا چاہئے۔

پہلا سوال

علیؑ کو امیرؑ المومنین کا لقب کس نے عطا کیا؟۔

۱۔ کوکبِ دری صفحہ ۳۳۹۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''اہلِ آسمان میرا نام اَحد لکھتے ہیں۔ پانچویں آسمان پر میرا نام علیِ اعلیٰ ہے۔ حضرت ربّ العزت نے مجھ کو امارت کی مسند پر بٹھایا ہے اور میرا نام امیر المومنین رکھا ہے''۔

۲۔ عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۴۴۰۔ ''تفسیر مجاہد میں ہے کہ اللہ نے علیؑ کا نام ۸۹ مقامات پر قیامت تک امیر المومنین اور سید الخاطبین رکھا ہے''۔

۳۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۳۸۔ ابو حمزہ ثمالی نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی کہ آپؑ نے اپنے آباءِ طاہرین کی سند سے بیان کیا۔ ''اللہ تعالیٰ نے جبریلِ امینؑ کو حضرت محمدؐ مصطفیٰ کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ وہ اپنی زندگی میں علیؑ کی گواہی دیں اور انھیں امیر المومنین کے لقب سے ملقب کریں''۔

۴۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۲۴۰۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ "علیؑ کا نام امیر المومنین میں نے نہیں بلکہ اللہ نے رکھا ہے"۔

یہاں ہم نے صرف چار احادیث پر اکتفا کیا ہے جبکہ ایسی احادیث کثیر تعداد میں ہیں اوران میں سے بعض آئندہ آنے والے سوالات کے ذیل میں آتی رہیں گی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ کو امیر المومنین کا لقب کسی اور نے نہیں بلکہ خود اللہ نے عطا فرمایا ہے۔

دوسرا سوال

یہ لقب علیؑ کو کب عطا کیا گیا؟۔ یعنی علیؑ کے اس لقب کا اعلان کب کیا گیا؟۔

یہ سوال اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ لوگوں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ علیؑ کو یہ لقب مدینے میں عطا کیا گیا اور یہ اسی زمانے کے لئے تھا۔

۱۔ عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۲۴۰۔ جابرؓ جعفی سے روایت ہے کہ مجھ سے امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "اگر لوگوں کو اس بات کا علم ہوتا کہ جناب علیؑ کا نام امیر المومنین کب رکھا گیا تو لوگ آپؑ کی ولایت کا انکار نہ کرتے"۔ میں نے عرض کیا۔ "اللہ آپؑ پر رحم کرے۔ آپؑ کا نام امیر المومنین کب رکھا گیا؟"۔ فرمایا۔ "جب اللہ نے اولادِ آدمؑ کے اصلاب سے انکی اولاد کو نکالا اور انکو انکے نفسوں کا گواہ بنایا اور کہا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ محمدؐ میرے رسول ہیں اور علیؑ امیر المومنین ہیں"۔

یہ حدیث وضاحت کے ساتھ بتا رہی ہے کہ ازل سے ابد تک جتنے مومنین گزر چکے ہیں یا گزریں گے۔ علیؑ ان سب کے امیر ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک بھی مومن باقی رہ جائے گا تو علیؑ اسکے بھی امیر ہونگے۔ حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صلبِ آدمؑ سے نکلنے والا ایک ایک مومن علیؑ کی رعایا میں شامل ہے۔

۲۔ مدینۃ المعاجز جلد ا صفحہ ۳۷۵۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

(الف)۔ ''جب اللہ نے عرش کو پیدا کیا تو اس پر لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علیؑ امیر المومنین تحریر کیا''۔

(ب)۔ جب اللہ نے پانی کو پیدا کیا تو اسکی لہروں پر لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علیؑ امیر المومنین لکھا۔

(ج)۔ جب اللہ نے کرسی کو پیدا کیا تو اسکے پایوں پر تحریر کیا لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علیؑ امیر المومنین۔

(د)۔ جب اللہ نے لوح کو پیدا کیا تو اس پر لکھا لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علیؑ امیر المومنین۔

(ہ)۔ جب اللہ نے اسرافیلؑ کو پیدا کیا تو اسکی پیشانی پر لکھا لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علیؑ امیر المومنین۔

(و)۔ جب اللہ نے جبریلؑ کو پیدا کیا تو اسکے دونوں پروں پر لکھا لا الہ الا اللہ محمدؐ

الرسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ز)۔جب اللہ نے آسمان بنائے تو انکے اطراف پر لکھا لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ح)۔جب اللہ نے زمینیں پیدا کیں تو انکے اطباق پر لکھا لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ط)۔جب اللہ نے پہاڑ بنائے تو انکی چوٹیوں پر لکھا لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ی)۔جب اللہ نے سورج بنایا تو اس پر لکھا لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ک)۔جب اللہ نے چاند پیدا کیا تو اس پر لکھا لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ علی امیر المومنین۔اور چاند میں تمھیں جو سیاہی دیکھائی دیتی ہے وہ اسی تحریر کی ہے۔جب بھی تم میں سے کوئی بھی لا الہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ پڑھے تو فوراً کہے علی امیر المومنین"۔

تیسرا سوال

کیا حیاتِ پیغمبرؐ میں بھی جناب علی امیر المومنین تھے؟۔

یہ بہت اہم سوال ہے کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے زمانے میں خود رسولؐ اللہ امیر المومنین تھے اور بعدِ رسولؐ علی امیر المومنین کہلائے۔

۱۔عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۴۴۰۔

''اہلِ سنت کے بہت سے علماء نے بیان کیا ہے کہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں ابو بکر حاضر ہوئے۔آنحضرتؐ نے فرمایا۔''جاؤ امیرؑ المومنین کو سلام کرو''۔عرض کیا۔''یا رسولؐ اللہ آپؐ زندہ ہیں آپؐ کے ہوتے ہوئے کون امیر المومنین ہوسکتا ہے؟''۔فرمایا۔''میری زندگی میں سلام کرو''۔

۲۔مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۳۹۔

بریدہ بن خصیب کا بیان ہے کہ''رسولؐ خدا نے مجھ سمیت سات افراد کو جن میں ابو بکر و عمر و طلحہ و زبیر بھی شامل تھے حکم دیا تھا کہ تم علیؑ کو امیر المومنین کہہ کر سلام کرو۔ہم نے رسولؐ خدا کی موجودگی میں انھیں امیر المومنین کہکر سلام کیا''۔

چوتھا سوال

کیا خود حضرت ختمی مرتبتؐ علیؑ کو امیر المومنین کہکر مخاطب کرتے تھے؟۔

۱۔عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۲۷۴۔

''ایک بھوکا شخص رسولؐ اللہ کے پاس آیا اور کھانے کا سوال کیا۔کسی نے اسے کھانا کھلانے کی حامی نہ بھری سوائے جناب امیرؑ کے۔آپؑ کے گھر میں صرف ایک بچے کا کھانا تھا۔آپؑ نے فرمایا۔''ہم ایثار کریں گے''۔بچوں کو بھوکا سلا دیا اور کھانا اس بھوکے کو کھلا دیا۔صبح رسولؐ اللہ نے نماز کے بعد جناب امیرؑ کو دیکھا تو بہت روئے اور

فرمایا۔"اے امیرؑ المومنین !تمھارے رات والے کام سے اللہ تعالیٰ تعجب میں ہے"۔

۲۔مدینتہ المعاجز جلد ۱صفحہ ۳۹۔

ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی اکرمؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں علیؑ آئے اورانھوں نے "السلام علیکم یا رسولؐ اللہ" کہکر آنحضرتؐ پر سلام کیا۔اسکے جواب میں رسولؐ اکرم نے فرمایا۔" وعلیک السلام یا امیرؑ المومنین و رحمت اللہ و برکاتہ"۔حضرت علیؑ نے کہا۔"یا رسولؐ اللہ آپؐ اپنی زندگی میں مجھے امیر المومنین کہکر پکارتے ہیں؟"۔آنحضرتؐ نے فرمایا۔"جی ہاں میں اپنی زندگی میں ہی کہوں گا"۔

۳۔انسائیکلو پیڈیا حضرت علیؑ جلد۲صفحہ۴۲ بحوالہ بحر المناقب۔

"حضرت ابو ذرؓ غفاری سے روایت ہے کہ حضرت علیؑ تشریف لائے تو رسولؐ اکرم نے فرمایا۔لو امیرؑ المومنین آ گئے!۔فرمایا کہ علیؑ کا مجھ سے پہلے امیرؑ المومنین نام رکھا گیا ہے۔کہا گیا کہ یا رسولؐ اللہ! آپؐ سے پہلے؟۔فرمایا۔ہاں۔پھر کہا گیا کہ عیسیٰؑ اور موسیٰؑ سے بھی پہلے؟۔فرمایا۔ہاں۔پھر کہا گیا کہ سلیمانؑ بن داؤدؑ سے بھی پہلے؟۔فرمایا۔ہاں۔اسی طرح تمام انبیاء کا نام لیا گیا سوائے حضرت آدمؑ کے۔پھر آپؐ نے فرمایا کہ جب خدا نے طینت کو خلق فرمایا تو اسکے سامنے ایک درہ خلق کیا گیا۔وہ اللہ کی تسبیح بھی بیان کرتا تھا اور تقدیس بھی۔پھر خدا نے فرمایا کہ میں تجھ میں

ایک مرد کو ساکن کر رہا ہوں جسے میں سب کا امیرؑ المومنین بناؤں گا۔ پھر جب خدا نے علیؑ کو خلق فرمایا تو اسے درہ میں ساکن فرمایا۔ اس لحاظ سے حضرت آدمؑ سے بھی پہلے علیؑ کا نام امیرؑ المومنین رکھا گیا''۔

پانچواں سوال

کیا حضرت علیؑ کے علاوہ کسی بھی نبی۔ وصی۔ ولی یا امام حتیٰ کہ خود رسولؐ اللہ اور گیارہ ائمہؑ کو امیر المومنین کہا جا سکتا ہے؟۔

۱۔ کتابِ سلیم بن قیس صفحہ ۴۶۔ حضرت امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

''خدا کی قسم امیر المومنین کا لقب میرے سوا کسی اور کے لئے درست نہیں''۔

۲۔ اصولِ کافی۔ کتابِ حجت۔ باب ۱۰۶۔ حدیث ۲۔

ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا کہ ''کیا قائم آلِ محمدؐ کو امیر المومنین کہہ سکتے ہیں؟'' فرمایا۔ ''نہیں! یہ نام اللہ نے امیرؑ المومنین کا رکھا ہے۔ اس سے پہلے یہ نام کسی اور کا نہیں ہوا اور آپؑ کے بعد کوئی اس نام سے موسوم نہ ہو گا مگر کافر''۔

۳۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۴۰۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''اے علیؑ! تو آسمان والوں کا امیر ہے اور تو زمین والوں کا امیر ہے اور جو لوگ اس جہان سے چلے گئے تو انکا امیر ہے اور جو باقی ہیں تو انکا امیر ہے۔ نہ تو تجھ سے پہلے کوئی امیر گزرا ہے اور نہ تیرے بعد کوئی امیر ہو گا کیونکہ جن لوگوں کا اللہ نے یہ نام

نہیں رکھا انکے لئے یہ نام رکھنا حرام ہے''۔

۴۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۱۴۱۔

ایک شخص امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا۔ ''السلام علیک یا امیر المومنین''۔ جیسے ہی اس شخص نے آپ کو امیر المومنین کہا تو آپ اچانک کھڑے ہو گئے اور اس سے فرمایا۔ ''رک جاؤ! یہ نام حضرت علیؑ کے علاوہ کسی کے لئے بھی درست نہیں ہے۔ اللہ نے یہ نام صرف انکو ہی عطا کیا ہے۔ انکے علاوہ کسی دوسرے کا یہ نام نہیں رکھا اور حضرتؑ کے علاوہ جو بھی اپنے لئے یہ نام پسند کرے گا تو وہ لواطت شدہ شخص ہوگا''۔ (بعض روایات میں ہے کہ وہ علتِ ابوجہل میں مبتلا ہوگا۔ لیکن معنی دونوں کے ایک ہی ہیں)۔

۵۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۳۸۹۔ رسولؐ اللہ نے معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے فرمایا۔ ''علیؑ حقیقی امیر المومنین ہے۔ اس سے نہ تو پہلے کوئی امیر المومنین گزرا ہے اور نہ اسکے بعد کوئی دوسرا امیر المومنین ہوگا''۔

بات یہ ہے کہ علیؑ کسی ایرے غیرے کا امام بنتا ہی نہیں اور نہ وہ کسی ایرے غیرے کا امیر بنتا ہے۔ وہ امام ہے صرف متقین کا اور وہ امیر ہے صرف مومنین کا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قوم و قبیلہ کوئی بھی ہو اسکا سردار ایک ہی ہوتا ہے اور گروہِ مومنین کا سردار ازل سے ابد تک صرف اور صرف علیؑ کی ذات ہے۔ پس

جو کوئی جس کسی کو بھی علیؑ کی امارت سے نکالنا چاہے تو پہلے اسکے مومن ہونے کا انکار کرے ورنہ اگر وہ مومن ہے تو علیؑ اسکا امیر ہے۔

ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ:۔

محمد چودہ ہیں۔

علی بارہ ہیں۔

لیکن امیر المومنین صرف اور صرف ایک ہے۔

بحرِ طویل میں منظوم نذرانۂ عقیدت

علیؑ حق!

مولیانِ حیدرِ کرارؑ کے لئے بطورِ خاص۔

یا علیؑ! تیری ولایت وہ سمندر ہے کہ جو اس میں اتر جائے تو پھر قیدِ زماں قیدِ مکاں توڑ کے پہنچے وہ کسی ایسے نگر میں کہ جہاں دن کا اجالا ہے نہ ہے شب کی سیاہی نہ کوئی چاند نہ سورج نہ ستارے نہ کوئی کوہ نہ وادی نہ گلستاں نہ بیاباں نہ کوئی چاند سا چہرہ نہ ستاروں سے بھری مانگ نہ زلفوں کی گھٹائیں نہ کسی جلوۂ جاں سوز کی مخمور ادائیں نہ کسی آنکھ کا جادو نہ کسی سانس کی خوشبو مگر اے جانِ حقیقت نظر آتا ہے تو بس تو! فقط تو! فقط تو! فقط تو!

اندھی ہو جائیں وہ آنکھیں جو نہ دیکھیں ترا جلوہ ترا چہرہ ترے عارض ترے گیسو ترے ابرو تری قامت کہ تو ہی عینِ وجود اور تو ہی اصلِ وجود اور تو ہی رنگِ خدا بوئے خدا روئے خدا خوئے خدا جو بھی بڑھا تیری طرف اس نے اٹھایا ہے قدم سوئے خدا۔ اب نہ کوئی ساز نہ آواز مگر ایک ندائے لبِ عشّاق جو اٹھتی ہے پلٹتی ہے پھر اٹھتی ہے پلٹتی ہے علیؑ حق! علیؑ حق!

یا علیؑ! تیری ولایت وہ شجر ہے کہ جو پھیلا ہے سرِ کون و مکاں جسکی ہر ایک شاخ ہے بندوں کے لئے دستِ اماں جسکا ہر اک پتّہ خموشی میں بھی ہے سچ کی زباں جسکے ہر اک حرف سے ایجاد ہوا حسنِ بیاں جسکے ہر اک پھل میں ہے وہ رنگ وہ آہنگ جو ہر آنکھ کو دیوانہ بنا دے جو ہر اک سینے میں طوفان اٹھا دے جو نظر آئے کبھی کچھ کبھی کچھ کبھی آنکھ یہ بولے کہ یہ بندہ ہے کبھی دل کی صدا آئے کہ معبود یہی ہے!

یہ شجر وہ ہے کہ اللہ کرے اسکے وسیلے سے کلام اور اگر اسکا وسیلہ نہ ہو ملتی نہیں موسیٰؑ کو نبوت نہ رسالت نہ امامت یہ شجر وہ ہے کہ موسیٰؑ سرِ تسلیم کرے خم تو یہ بولے کہ نہ ڈر اے میرے بندے میں خدا ہوں میں خدا ہوں میں خدا ہوں!

سوچتے رہ گئے موسیٰؑ جسے کہتا ہوں میں اللہ وہ ہے واحد و یکتا وہ اَحد ہے وہ صمد ہے وہ کہاں صَوت اور آواز کا پابند؟ تو پھر کس نے پکارا کہ میں رب ہوں؟ میں خدا ہوں؟ تو ہر اک ذرے میں وادی میں پہاڑوں میں ہواؤں میں فضاؤں میں صدا گونج اٹھی حق! علیؑ حق! علیؑ حق!

یا علیؑ! تیری ولایت وہ بلندی ہے جسے چھو نہیں سکتی ہے کوئی اور بلندی نہ پہنچ

عرش کی اس تک نہ ہے کرسی کی رسائی کہ وہ رہتی ہے سراپردۂ وحدت میں جہاں لفظِ ''کہاں'' اور ''وہاں'' کچھ نہیں جز کلمۂ بے معنی و مہمل کہ وہی اوّل و آخر ہے وہی ظاہر و باطن ہے وہی عالی و اعلیٰ ہے وہی اعظم الاعظم ہے وہی اکرم الاکرم ہے وہی اکبر الاکبر ہے وہی ہے کہ اذانوں میں جسے کہتے ہیں اکبر یہ وہی ہے کہ نظر آتی ہے ذروں میں ستاروں میں شعاعوں میں خلاؤں میں پہاڑوں میں سمندر میں گلستان و بیابان میں اسکے رخِ زیبا کی جھلک بس گئی بُستانِ شب و روز میں اس گیسوئے مشکیں کی مہک جب سے بجی دل میں وہ من موہنی صورت تو سنائی نہیں دیتی کوئی آہٹ کوئی دھڑکن دلِ بے تاب کے ہر تار میں ہے ایک ہی جھنکار کہ بس حق! علی حق! علی حق!

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

یہ کتاب ''کشف المعارف'' آج بتاریخ ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۴ء مطابق ۲۸ شعبان ۱۴۲۵ھ بروز جمعرات بوقت سوا بارہ بجے دن بتوفیقِ خداوندی و بتائید و امدادِ حضرت صاحب الزمانؑ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوۃ والسلام علی خاتم النبین و آلہٗ الطیبین الطاہرین المعصومین المظلومین و لعنتہ اللہ علی اعداء ہم اجمعین من یومنا ھذا الی یوم الدین۔

تحفۂ یا علیؑ مدد